سچا فریب



محی الدین نواب

سچا فریب

اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا، اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو اس نے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا...... مگر قاتل نے اسے ایسا فریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

ڈاک بنگلے سے وہ حویلی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر ننھے سے گھروندے کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جب رات کی تاریکی گہری ہوجاتی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تو اس وقت حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے اِدھر اُدھر سے روشن ہوجاتے۔ روشنی کے وہ چھوٹے چھوٹے دھبے یوں لگتے جیسے رات کے کالے جسم پر کوڑھ کے اجلے دھبے پھیل گئے ہیں۔

بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ شائستہ درّانی شاید کوڑھ کی مریضہ ہے یا پھر ایک بدصورت عورت ہے، جو اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے اوپری منزل کے کمروں میں روپوش رہتی ہے۔

آج تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ملازم بھی اسے چہرے سے نہیں پہچانتے تھے۔ کسی کو اوپری منزل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ایک لیڈی سیکرٹری مسز گرانٹ تھی جو اس کے ساتھ ایسٹ یون لندن سے آئی تھی۔ وہی کال بیل کی آواز پر اس کی خدمت گزاری کے لئے اوپری منزل پر جایا کرتی تھی۔

دو ماہ قبل وہ حویلی اور اس کے آس پاس کا علاقہ مظفر ٹی اسٹیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے مالک راجہ مظفر علی تھے۔ پھر چائے کے باغات میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں نے سنا کہ راجہ صاحب شہر میں ریس کے گھوڑوں پر داؤ لگاتے لگاتے دیوالیہ ہوگئے ہیں اور اب ٹی اسٹیٹ فروخت کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد چائے کے کارخانے سے پرانا بورڈ ہٹا دیا گیا اور درّانی ٹی اسٹیٹ کا نیا بورڈ لگا دیا گیا۔ نام کی مناسبت سے اس حویلی میں کسی مرد درّانی کو آنا چاہئے تھا لیکن وہاں دو عورتیں آئیں۔ ایک عیسائی عورت اور دوسری مسلمان خاتون۔ وہ دونوں دو گھوڑوں کی بگھی میں آئی تھیں۔ بگھی کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ٹی اسٹیٹ کا پرانا منیجر، کارخانے کا چارج مین اور مشین مین ان کے استقبال کے لئے

حویلی کے پورچ میں موجود تھے مگر وہ اپنی نئی مالکہ کو نہیں دیکھ سکے۔ بگھی کا دروازہ کھول کر پہلے مسز گرانٹ باہر آئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازموں کو دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ نجیک (نزدیک) میں نئی آؤ۔ مِس اندر جانا مانگتا ہے۔ راستہ دو.........."

تمام لوگ دور ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ بگھی سے ایک برقعہ پوش خاتون باہر آئی اور تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندر جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ وہ برآمدے میں پہنچ کر نقاب الٹے گی اور ایک مالکہ کی حیثیت سے اسٹیٹ کے پرانے ملازموں سے خطاب کرے گی' لیکن وہ آدم بیزار معلوم ہوتی تھی۔ برقعے کے پیچھے سے بھی اس نے سر اٹھا کر کسی کی جانب نہیں دیکھا۔ بگھی کی قید سے نکل کر آئی اور حویلی کے اندر جاکر روپوش ہوگئی۔

اس دن کے بعد سے اس عورت کو تو کیا' اس کے برقعے کو بھی کسی نے نہ دیکھا۔

منیجر اور چارج مین کی گھروالیاں اس سے ملنے آئیں لیکن مسز گرانٹ نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت سوری۔ ڈاکٹر کا آرڈر نئی ہے۔ بیگم صاحب کسی سے نئی ملے گا.........."

پتہ نہیں وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے ایک عورت کو دوسری عورتوں کے سامنے آنے سے روک رکھا تھا۔ نئی مالکہ کی روپوشی ہر ایک کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔

عورتیں' مردوں سے زیادہ تجسس پسند ہوتی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طور سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بڑی کوششوں کے بعد دو ماہ کے عرصے میں اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ اس کا نام شائستہ درانی ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور وہ سات برس تک انگلینڈ میں رہنے کے بعد اپنے ملک واپس آئی ہے۔

لیکن اس چٹکی بھر معلومات سے کسی کو تشفی نہ ہوئی۔ سب ہی اپنے طور پر جھنجھلا کر سوچنے لگے۔ وہ بدصورت ہے' اسی لئے کسی کو اپنی شکل نہیں دکھاتی ہے۔ وہ کوڑھ کی مریضہ ہے۔ یا پھر انگریزوں کے ملک سے منہ کالا کرکے آئی ہے۔ اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ اوپری منزل میں اپنے گناہ کو چھپائے بیٹھی ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں.......... باتیں بھی ایسی کہ شائستہ درانی کو دن بہ دن پُراسرار

بنائے جارہی تھیں۔ بستی کی عورتیں اور مرد جب حویلی کے قریب سے گزرتے تو سر اٹھا کر پہاڑی کی بلندی پر ضرور دیکھتے۔ ایک نئی امید اور نئے یقین کے ساتھ دیکھتے کہ وہ معمہ حل ہوجائے گا لیکن حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اندھے شیشے لگے ہوئے تھے۔ ان کے آر پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دن کے وقت اوپری منزل کی کھڑکیاں اور بیرونی بالکونی کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ رات کو کھڑکیوں کے ایک دو پٹ کھل جاتے تھے۔ اگر موسم کچھ زیادہ ہی گرم ہوتا تو بالکونی کا دروازہ بھی کھل جایا کرتا تھا مگر پھر بھی وہاں رات کی تاریکی سیاہ پردے کی طرح پڑی رہتی تھی۔

اوپر اندھیرا اور نیچے روشنی.......... نچلی منزل میں بجلی کے قمقمے روشن رہتے تھے۔ ان روشنیوں کی چکاچوند میں اوپر کی تاریکی اور گہری ہوجاتی تھی۔ وہاں ایک پرانی کہاوت کے خلاف چراغ تلے اندھیرا نہیں تھا' بلکہ چراغ کے اوپر اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

ہاں' کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں مومی شمعیں روشن ہوجاتیں۔ ان کی روشنی اندھے شیشوں سے ٹکرا کر باہر آنے کی کوشش کرتی' اور کمرے کے محدود ماحول میں ہی اپنی مالکہ کی طرح قید ہوکر رہ جاتی۔ انسان ساری زندگی خاموشی اختیار کرلے۔ خود کو اسرار کے دبیز پردوں میں چھپالے' پھر بھی نہیں چھپتا۔ کبھی خاموشی کی کوئی ادا بول پڑتی ہے یا کبھی اس کا ماحول طویل خاموشی سے بوکھلا کر چیخ پڑتا ہے۔

بند کمرے کا وہ ماحول اکثر ریکارڈ پلیئر کی زبان سے اس پُراسرار لڑکی کے مزاج کی چغلی کھایا کرتا تھا۔

رات کی خاموشی میں ہلکی ہلکی موسیقی اوپری بالکونی سے سسکتی ہوئی آتی تھی۔ کسی گلوکار کی درد بھری آواز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی' اندھے شیشوں کو پھلانگتی ہوئی حویلی کے اطراف منڈلاتی اور بتدریج دھیمی پڑتی ہوئی پہاڑی کے دامن میں اتر جاتی تھی۔

"میں کہاں آگیا ہوں۔
اے میری بے حیا تقدیر! تُو مجھے کہاں لے آئی ہے۔
میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر ایک گناہ گار کی طرح منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔
کیا مجھے موت نہیں آئے گی۔
میرے دشمن تُو کہاں چلا گیا ہے؟

"تُو میری جان کا دشمن ہے...... آ...... مجھے اس زندگی سے نجات دلا دے......"

ریکارڈ پلیئر پر کوئی مرد ہمیشہ یہی گیت گاتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے شیشوں پر روشنی کے زاویے یوں بدلتے رہتے تھے جیسے وہ لڑکی شمع دان ہاتھ میں اٹھائے اِدھر سے اُدھر کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہی ہے۔ یا پھر اپنے قاتل کو تلاش کررہی ہے۔

"آ...... میری جان کے دشمن مجھے اس زندگی سے نجات دلا دے......"

☆======☆======☆

قیصر مراد ڈاک بنگلے کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے دور بین لگائے دور حویلی کی اوپری منزل کو دیکھ رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں اسے اتنا ہی نظر آیا کہ اندھے شیشوں پر روشنی کے زاویے بدل رہے ہیں۔ کوئی ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف لالٹین یا شمعدان اٹھائے بھٹک رہا ہے۔ اس نے دور بین کو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی ہے؟ دیکھو شیخ! تمہاری رپورٹ نے مجھے الجھا دیا ہے' تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ اس حویلی میں کوئی مرد ہے یا نہیں؟"

حامد شیخ نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ صرف وہی لڑکی ہے' جو اس حویلی کی مالکہ بن کر آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں راجہ مظفر علی کا سیکرٹری رہ چکا ہوں۔ حویلی کی خرید و فروخت کے سلسلے میں جو دستاویز تیار ہوئی تھی' اس میں خریدار کا نام آمنہ شائستہ درانی بنت رئیس احمد درانی لکھا گیا ہے۔ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ دوسرے بھائی یا بہنیں نہیں ہیں۔ وہ اتنے بڑے ٹی اسٹیٹ کی واحد مالکہ ہے۔"

قیصر مراد کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ آنکھوں سے الجھن اور چہرے سے جھنجلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ وہ برآمدے سے پلٹ کر اندر چلا آیا۔ کمرے میں روزی تاش کے پتوں سے کھیل رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر مراد کو دیکھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ درمیانے قد کے لوگ ہمیشہ اسے سر اٹھا کر دیکھتے تھے۔ مضبوط بازو' چٹان کی طرح چوڑا سینہ...... اور جنس مخالف کے لئے اس کے چہرے اور شخصیت میں مردانگی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

روزی نے اسے نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسکاچ وہسکی کی بوتل سامنے سے اٹھائی اور اس کے لئے ایک پیگ بنانے لگی۔ قیصر مراد نے دور بین کو صوفے پر پھینک دیا۔ پھر اس نے روزی کے ہاتھ سے بوتل جھپٹ لی اور اسے منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ روزی نے مسکرا کر شکایت کی۔

"یو آر روڈ اینڈ رف...... عورتوں کے معاملے میں تمہیں سوفٹ ہونا چاہئے۔"

"پھوں!" مراد نے "اونہہ" کہنے کے انداز میں پھنکار ماری تو شراب کی ہلکی سی پھوار روزی کے چہرے پر آکر بکھر گئی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے اسکارف سے چہرے کو صاف کرنے لگی۔

"سوفٹ!" وہ غرا کر بولا۔ "میں یہاں وسیم احمد درانی کی لاش گرانے آیا ہوں اور تم کہتی ہو کہ مجھے تم جیسی عورتوں کے لئے موم کی طرح ملائم ہونا چاہئے۔ کرس آن یو...... یہاں بھی عورت' وہاں بھی عورت۔ وہاں وسیم احمد درانی کو ہونا چاہئے مگر اس کی جگہ کوئی شائستہ درانی منہ چھپائے بیٹھی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے روزی پر جھکا اور اس کی گردن کی پشت پر ہاتھ لے جا کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف اٹھانے لگا۔

"تم کیا مجھے احمق سمجھتی ہو۔ میری کھوپڑی سوفٹ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اس حویلی میں کوئی شائستہ نہیں ہے۔ وہاں وسیم چھپا بیٹھا ہے۔ میرا...... بزدل...... دشمن......"

اس نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ روزی صوفے پر گر پڑی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے پھر اسی تشدد کا انتظار کر رہی ہو۔

مراد بوتل سے منہ لگا کر گھونٹ بھر رہا تھا۔ دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پھر زہریلے سانپ کی طرح پھنکار ماری اور بھاری قدموں کی دھمک پیدا کرتا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے کہا۔

"میرے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہے۔ میں اس بہروپئے کو حویلی کی چار دیواری سے کھینچ کر لاؤں گا۔ اس بستی کے لوگوں کو دکھاؤں گا کہ وہ مرد ہو کر برقعے میں چھپا پھرتا ہے۔ پھر...... پھر میں اسے گولی مار دوں گا......"

بوتل پھر اس کے ہونٹوں تک پہنچ گئی۔ روزی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

"سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ مراد۔ تم جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہے ہو۔ تمہیں قانون کی نظروں سے بچ کر انتقام لینا چاہئے۔"

وہ آنکھیں سکیڑ کر روزی کو تکنے لگا۔ خالص وہسکی پینے کے باعث کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی روزی بھی اِدھر سے اُدھر ڈول رہی تھی۔ اس نے ذرا سنجیدگی سے سوچا کہ وہ واقعی بہک رہا ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر ایسا انتقام لینا چاہئے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور صوفے پر آکر دھپ سے بیٹھ گیا۔

روزی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کا بازو تھام کر بولی۔ "وہ لڑکی وسیم کی بہن ہوگی۔ تم نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی۔"

"تھی، مگر اب نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ بارہ برس کی عمر میں مر گئی تھی۔"

اس نے بوتل کو منہ سے لگالیا۔

"تم نے سنا تھا مراد.......... مگر سنی سنائی باتیں اکثر غلط ہو جاتی ہیں۔ تم یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ وہ زندہ ہے، ورنہ یہ شائستہ درانی کہاں سے آجاتی۔"

وہ بوتل کو ایک جھٹکے سے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "لعنت ہے شائستہ درانی پر۔ اگر وہ زندہ ہے تو میرے لئے کیا فرق پڑے گا۔ مجھے وسیم کی تلاش ہے۔ صرف وسیم کی۔ سات سال کے بعد اسے انگلینڈ سے واپس آنا تھا مگر اس کی بہن آئی ہے۔ وہ کم بخت کہاں مر گیا؟"

"ہو سکتا ہے کہ مر گیا ہو۔"

"نہیں!" اس نے جھلا کر اسے پرے دھکیل دیا۔ "وہ نہیں مر سکتا۔ مرے گا تو صرف میرے ہاتھوں سے.......... میرے ہاتھوں سے.........."

وہ بوتل اٹھا کر پھر پینے لگا۔ روزی نے ناراضگی سے کہا۔

"تم میرے ساتھ جنگلیوں کی طرح پیش آؤ گے تو میں صبح واپس چلی جاؤں گی۔"

وہ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میرے پہلو میں آنے والی ہر عورت

یہی کہتی ہے۔ ٹھیک ہے، چلی جانا لیکن شائستہ سے ملنے کے بعد.........."

وہ حیرانی سے بولی۔ "میں اس سے کس طرح مل سکتی ہوں؟ سنا ہے کہ مسز گرانٹ کسی کو ڈرائنگ روم سے آگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔ وہیں سے باتیں بنا کر ٹال دیتی ہے۔"

"تم کوشش کرو گی تو وہ تمہیں نہیں ٹال سکے گی۔ تم کیسی عورت ہو؟ صرف مردوں کو لبھانا جانتی ہو۔ کسی عورت کی کمزوری سے کھیلنا نہیں جانتی.......... کل صبح تم ضرور وہاں جاؤ۔ وہاں چھپی ہوئی ہستی سے ملاقات ہو یا نہ ہو، مگر اس کی کوئی کمزوری ڈھونڈ کر لاؤ.........."

وہ بوتل اٹھا کر کھڑا ہوگیا اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ روزی بڑی لگن سے اسے دیکھ رہی تھی اور اپنا ہاتھ گردن کی پشت پر لے جاکر ہولے ہولے اس جگہ کو سہلا رہی تھی، جہاں مراد نے اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ وہاں دھیما دھیما سا درد اور میٹھی میٹھی سی جلن ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بل کھاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔

مراد دروازے کی جانب پشت کئے ایک سوٹ کیس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ روزی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے پاس آئی اور انگڑائی لیتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ انگڑائی کے کھنچاؤ پر ذرا دیر تک اس کا بدن چٹختا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدل کر مراد کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شراب دو آتشہ کے لئے خود ہی کشاں کشاں چلا آئے گا لیکن مراد کے سامنے سوٹ کیس سے جھانکنے والے سرخ لبادے کو دیکھتے ہی وہ مرجھا گئی۔

وہ سرخ رنگ کا اونی لبادہ تھا۔ مراد اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھائے بڑے ہی جذباتی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں کچھ تو نشے کی لالی تھی اور کچھ سرخ لبادے کا عکس جھلک رہا تھا، جن کی وجہ سے آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ لبادے کو سینے سے بھینچ کر بڑبڑانے لگا۔

"تم میری پہلی اور آخری محبت تھیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ میں انتقام لوں گا.......... ثمینہ! میں تمہارا انتقام لوں گا.........."

☆======☆======☆

درمیانے قد' بھرے بھرے گداز جسم اور گوری رنگت کا نام ثمینہ تھا۔

جب وہ سرخ لبادے کو شانوں پر ڈال کر اسٹیج پر آتی تو لبادے کی لالی اس کی گوری رنگت میں گھل کر دھیمے دھیمے حسن کو شعلے کی طرح بھڑکا دیتی تھی۔ سامعین اس کی مسحور کن آواز میں گیت سننے آتے تھے اور اس کے حسن کو دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے تھے۔

ہزاروں' لاکھوں سامعین کے دلوں پر حکومت کرنے والی حسینہ ان دنوں قیصر مراد پر مہربان تھی۔ مراد کا وہ پہلا عشق تھا اور نامراد ثمینہ کا ساتواں عشق.......... کچی عمر ہو اور محبت میں بھی کچا پن ہو تو محبوب کے عیب نظر نہیں آتے۔ مراد بائیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کے مقابل کتنی تجربہ کار عورت ہے یہ اس نے کبھی نہیں سوچا' بلکہ ثمینہ نے اپنی آزمودہ اداؤں سے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

والدین نے اسے سمجھایا کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے لیکن جوانی میں والدین کی نصیحتیں صدیوں پرانی معلوم ہوتی ہیں۔ دنیا والوں نے طعنے دیئے تو اس نے سوچا کہ ظالم زمانہ اپنی عادت کے مطابق محبت کا دشمن بن گیا ہے۔ ثمینہ نے اسے اس طرح اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا کہ اسے ساری دنیا جھوٹی اور فریبی نظر آتی تھی۔

وہ اپنی زلفوں کی چھاؤں میں بڑے ہی درد بھرے انداز میں کہتی تھی۔ "یہ دنیا والے میری شہرت سے جلتے ہیں۔ مجھے خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں کہ میں عاشق بدلتی رہتی ہوں۔ تمہاری قسم مراد! جن عاشقوں کے نام لے کر مجھے بدنام کیا جاتا ہے' ان سے میرے صرف کاروباری تعلقات تھے۔ ان میں سے کوئی میری تنہائی میں کبھی نہیں آیا۔ تم پہلے شخص ہو۔ تم میرے دل و دماغ پر چھا گئے ہو۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ قسم کہ اب تم کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑو گے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ تم بھی میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں سرخ لبادے میں دیکھا تو میرے دل نے کہا کہ تم صرف میرے لئے پیدا کی گئی ہو۔ صرف میرے لئے.......... مجھے سرخ رنگ بہت پ ہے۔ اس رنگ کا عکس تمہارے چہرے پر پڑتا ہے تو تم سرخ گلاب کی طرح کھِل جاتی ہو۔"

"اگر تمہیں سرخ رنگ پسند ہے تو میں ہمیشہ اسی رنگ کا لباس پہنا کروں گی۔"

مرد یہی چاہتا ہے کہ عورت اس کی پسند کا خیال رکھے اور ثمینہ تو اس کی ہر رنگین و سنگین پسند کا خاص خیال رکھتی تھی' پھر وہ کیسے نہ بہکتا؟ اس کی محبت میں دن رات مدہوش ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ اس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں محبت' عقیدت میں بدل جاتی ہے اور مرد' عورت کو پوجنے لگتا ہے۔

پھر ایک دن وسیم احمد درانی کی آمد کا ٹیلی گرام آیا۔ مراد نے ٹیلی گرام پڑھتے ہی خوش ہو کر کہا۔

"ثمینہ! یہ میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ بہت بڑے مل اونر کا لڑکا ہے۔ ماں شاید نہیں ہے۔ باپ بھی بیمار رہتا ہے۔ کچھ دنوں میں وہ بھی چل بسے گا لیکن یہ کم بخت وسیم نرا احمق ہے۔ پینے پلانے اور عورتوں کی محفل میں بیٹھنے سے کتراتا ہے۔ یوں سمجھو کہ بہت ہی شرمیلا لڑکا ہے۔"

ثمینہ نے مسکرا کر کہا۔ "رئیس زادے شرمیلے نہیں ہوتے' چھپے رستم ہوتے ہیں۔ جب تک باپ زندہ ہوتا ہے' چھپ چھپ کر عیاشی کرتے ہیں۔"

"میں نہیں مانتا۔ وہ میرا ایسا گہرا اور بے تکلف دوست ہے کہ اس کا کوئی راز مجھ سے چھپا نہیں رہتا.........."

"میں بھی نہیں مانتی کہ ایک دولت مند نوجوان اب تک متقی اور پرہیزگار بن کر زندگی گزار رہا ہے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے زندگی گزارنے کی بات بھی خوب کی۔ بھئی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ صرف انیس برس' مجھ سے تین سال چھوٹا ہے۔ ابھی اس نے دنیا دیکھی ہی کہاں ہے.........."

ثمینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ اگر نہیں دیکھی ہے تو میں اسے دکھا دوں گی۔

مراد نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر کہا۔ "میں اس کم بخت کو آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ وہ میرا بہترین دوست ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اس دنیا کی رنگینیوں سے محروم نہ رہے۔ ہم اسے کلبوں میں لے جائیں گے۔ لڑکیوں سے متعارف کرائیں گے اور قطرہ قطرہ شراب چکھائیں گے تاکہ دولت کا جائز مصرف اس کی سمجھ میں آجائے۔"

"نائیس آئیڈیا!" وہ مسکرا کر بولی۔ "اس طرح ہماری تفریحی دلچسپیاں بڑھ جائیں گی

لیکن اس کا قیام کہاں ہوگا؟"

"تمہارے ہاں۔ اگر وہ میرے پاس رہے گا تو گھر کے بزرگ گھسی پٹی نصیحتیں سنا سنا کر اسے مولوی بنا دیں گے۔ یہ تمہاری کوٹھی ہے۔ یہاں ہماری مخالفت کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟"

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ تمہارا دوست جب تک چاہے یہاں رہ سکتا ہے۔"

دوسرے دن وہ وسیم احمد درانی کو لینے ایئرپورٹ گئے۔ اسے دیکھ کر ثمینہ ذرا بجھ سی گئی' کیونکہ وسیم احمد درانی کا نام بہت بڑا تھا اور جسم نہایت ہی مختصر وہ چھوٹے سے قد اور دبلے پتلے جسم کی وجہ سے ایک کم عمر چھوکرا نظر آتا تھا۔ چہرے پر داڑھی مونچھوں کی جگہ مکمل روئیدگی نہیں تھی۔ غور سے دیکھنے پر کہیں کہیں ریشم جیسے مہین سنہری بال افشاں کی طرح جھلک جاتے تھے۔

تعارف کے دوران ثمینہ نے اس سے مصافحہ کیا تو وسیم کے ہاتھ بالکل سرد تھے۔ وہ ایک عورت سے ہاتھ ملاتے وقت بری طرح جھینپ رہا تھا۔ مراد نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔

"یار! کیا شرماتے ہو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہیں۔ ان سے شرماؤ گے تو کام نہیں چلے گا۔ تمہیں انہی کی کوٹھی میں قیام کرنا ہے۔"

وسیم نے خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی قیام کے سلسلے میں رسمی طور پر ثمینہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ ثمینہ اسے اچھی نہیں لگی۔ یا پھر وہ سرد مہری برتنے کا عادی تھا۔

وہ تینوں کار کی اگلی سیٹ پر آکر بیٹھے تو ثمینہ ان کے درمیان تھی۔ وہ دائیں طرف سے مراد کو اور بائیں طرف سے وسیم کو اپنے بدن کی نرمی و گرمی کا احساس دلا رہی تھی۔ وسیم سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جگہ کی تنگی کے باعث سمٹنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

ثمینہ اس نوجوان میں کبھی دلچسپی نہ لیتی لیکن مراد سے وعدہ کر چکی تھی کہ وسیم کو آدمی بنانے میں اس کی مدد کرے گی۔ اسی خیال سے وہ جان بوجھ کر وسیم کی طرف زیادہ جھکی ہوئی تھی۔ مراد جو کام دوسری لڑکیوں سے لینا چاہتا تھا' وہ ثمینہ خود ہی انجام دے رہی تھی لیکن اس طرح کہ مراد کو اس کے ہرجائی پن کا علم نہ ہو۔

وسیم ایک ماہ کے لئے آیا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران ثمینہ اپنے تمام آزمودہ حربے استعمال کرتی رہی اور وسیم اس سے بدکتا رہا۔ جتنا وہ دور ہوتا تھا' اتنی ہی اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی۔ عورت ناکام ہو کر کبھی ہمت نہیں ہارتی بلکہ اس ہار کو جیت میں بدلنے کے لئے پلٹ پلٹ کر نئے نئے داؤ آزماتی رہتی ہے۔

وسیم اس کے ہاں مہمان بن کر مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اپنی میزبان سے کھل کر نفرت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز مراد سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے شکایت کی۔ "مراد! تم جہاں بھی مجھے تفریح کے لئے لے جاتے ہو' وہاں ثمینہ کو بھی ساتھ کر لیتے ہو کبھی ہم دونوں کو بھی تنہائی میں وقت گزارنا چاہئے۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "ثمینہ اِز اے سویٹ گرل۔ اس کے بغیر کسی تفریح میں مزہ نہیں آتا۔"

وسیم نے اداسی سے اسے دیکھا' پھر ناگواری سے بولا۔ "تم اسے لڑکی کہتے ہو' مجھے تو وہ کوئی ادھیڑ عمر کی عورت نظر آتی ہے۔ نہ جانے تمہیں اس کی کون سی ادا پسند آگئی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔"

مراد نے چونک کر اسے دیکھا اس وقت وسیم کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ثمینہ کی برائی سن کر اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیتا۔ اس نے غصے کو قہقہوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی چھوکرے ہو۔ لڑکی اور عورت کے فرق کو مجھ سے زیادہ نہیں سمجھتے ہو۔ بعض عورتیں بعض معاملات میں لڑکیوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ تعجب ہے کہ تم ثمینہ سے نفرت کیوں کرتے ہو؟ اچھا سچ سچ بتاؤ جب وہ سرخ یا نارنجی رنگ کا لباس پہنتی ہے تو کیا اس وقت بھی تمہیں خوبصورت نہیں لگتی؟"

وسیم نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا۔ "میں بھول گیا تھا کہ تمہیں سرخ رنگ پسند ہے۔ تم ثمینہ سے نہیں' اس کے اوپر چڑھے ہوئے سرخ غلاف سے محبت کرتے ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" اس نے غصے سے کہا۔ "میں ثمینہ سے محبت کرتا ہوں۔ جو محبت کرتے ہیں وہ محبوبہ کی سجاوٹ کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ مجھے سرخ لباس میں بہت اچھی لگتی ہے۔ میری نظروں میں یہ لباس ہی اس کی سجاوٹ ہے۔ اس کا سنگار ہے۔ اب کبھی وہ ایسا لباس پہنے تو تم اسے میری آنکھوں سے دیکھنا۔ وہ تمہیں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آئے

گی۔"

وسیم خاموشی سے اور سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے دوست کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے بحث کو اسی وقت ختم کر دیا لیکن اس کے دل و دماغ میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مراد کی یہ بات دماغ میں گونج رہی تھی کہ ثمینہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

اس رات ثمینہ اور مراد تنہا تفریح کے لئے گئے۔ وسیم سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ اس نے مراد سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسرے دن واپس چلا جائے گا۔

ثمینہ کو اس کی واپسی کا علم ہوا تو وہ بے چین ہوگئی۔ ایک نوعمر لڑکا اسے شکست دے کر چلا جائے اور اس کے تمام حربوں کو زنگ آلود کر دے' یہ توہین وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی کامیابی کی جدوجہد کے لئے صرف ایک رات.......... ایک آخری رات رہ گئی تھی۔ وہ اس رات کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے بھی مراد سے بہانہ کیا کہ صبح اسے ریکارڈنگ کے لئے جانا ہے۔ وہ رات کو زیادہ دیر تک باہر نہیں رہے گی۔ چونکہ ریکارڈنگ کا معاملہ تھا اس لئے مراد اسے نہ روک سکا۔ ڈنر کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

ثمینہ اپنی کوٹھی میں آئی اور سیدھی وسیم کے کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ بستر کی شکن آلود چادر بتا رہی تھی کہ وہ بہت دیر تک وہاں پڑا کباب سیخ کی مانند کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے بستر کو چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔ یعنی وہ ابھی ابھی کہیں گیا تھا۔ اس نے باتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا' وہاں بھی وہ موجود نہیں تھا۔

ثمینہ کمرے سے باہر آگئی اور یہ سوچ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد ملازمہ کو بلا کر اس کے متعلق پوچھے گی لیکن وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گئی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ہر طرف سرخ اور نارنجی رنگ کے ملبوسات بکھرے ہوئے تھے اور ان شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے کپڑوں کے درمیان وسیم کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہی سرخ لبادہ تھا جسے ثمینہ پہن کر اسٹیج پر جایا کرتی تھی۔ لبادے کی پشت پر سنہری گوٹ سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ وہ دروازے کی طرف پشت

کئے کھڑا تھا۔ کبھی اس دائرے کو دیکھ رہا تھا' کبھی لبادے کی سرخی کو بڑی محبت سے دیکھ کر اسے مٹھیوں میں بھینچ رہا تھا اور کبھی اسے اپنے سینے سے لگا رہا تھا۔

ثمینہ فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی قریب آگئی۔

وہ چونک کر پلٹ گیا' پھر ثمینہ کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں سے لبادہ چھوٹ کر قالین پر گر پڑا۔ وہ مسکراتی ہوئی ایک دم قریب آگئی۔

"تم کیسے نادان ہو' مجھ سے دور بھاگتے ہو اور میرے کپڑوں سے محبت کرتے ہو۔"

وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹنا چاہتا تھا لیکن ثمینہ نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"آج میں نے تمہاری چوری پکڑ لی ہے۔ اب تم میرے سامنے اپنی پارسائی نہیں جتا سکتے.........."

وسیم اس کی بانہوں سے اپنی گردن چھڑانے لگا۔ "چھوڑ دو مجھے۔ مجھے جانے دو......... مم......... میں......... یہ......... یہ بہت بری بات ہے۔ الگ ہٹو.........."

وہ الگ ہونے کی بجائے اور زیادہ چپکنے لگی۔ "برائی کیا ہے اور اچھائی کیا ہے' یہ آج تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ آج کے بعد تم شرمانا چھوڑ دو گے۔ بولو......... بولو وسیم کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"نہیں میں تم سے نفرت کرتا ہوں.........." اس نے ایک جھٹکے سے اس کی بانہوں کو الگ کر دیا۔

وہ جھلا کر اسے جھنجھوڑنے لگی اور وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ دونوں قد اور جسامت میں ایک جیسے تھے۔ دونوں کی جسمانی قوتوں میں بھی انیس بیس کا فرق تھا۔ اس جنگ میں صرف عورت کمزور نہیں تھی' مرد بھی کمزور تھا اس لئے وہ کمزوروں کی طرح ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ وسیم اسے دھکے دیتا ہوا اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کسی طرح اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

ایک بار اسے بھاگنے کا موقع ملا لیکن قالین پر بکھرے ہوئے کپڑوں میں اس کا پاؤں الجھ گیا اور وہ دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا' ثمینہ اس پر چھا گئی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی بولی۔

"کیوں آئے تھے میرے کمرے میں.......... بولو کیوں آئے تھے؟ بزدل.......... نامرد..........؟"

ایک عورت کی زبان سے نامرد کا لفظ دھماکہ بن کر اس کی کھوپڑی میں گونجنے لگا۔ اس نے تڑپ کر ثمینہ کو قالین پر گرادیا اور اس کے منہ پر طمانچے اور گھونسے مارتے ہوئے چیخنے لگا۔ "میں مرد ہوں.......... میں مرد ہوں.......... بولو۔ بولو میں مرد ہوں۔"

مار پڑتے ہی ثمینہ کے دماغ میں بات آگئی کہ اسے کس طرح بھڑکایا جاسکتا ہے۔ وہ پھر للکارتی ہوئی بولی۔ "تم مرد نہیں ہو۔ میں ہزار بار کہوں گی کہ تم عورت ہو.......... عورت سے بھی گئے گزرے ہو.........."

وسیم کا سارا بدن تھرا گیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "عا.......... عورت۔ نہیں.......... مم.......... میں عورت نہیں ہوں.......... کک.......... کون کہتا ہے کہ میں عورت.........."

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی بولی۔ "عورت.......... عورت.......... تم عورت ہو.........."

وہ تیزی سے پلٹ کر ہانپتے کانپتے سنگار میز پر رکھے ہوئے پیتل کے گلدان کے پاس آیا۔ اس کے پیچھے ثمینہ چیخ رہی تھی۔

"میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میرے پاس آؤ ورنہ میں ساری دنیا سے کہہ دوں گی کہ تم عورت ہو۔ اسی لئے ایک عورت سے دور بھاگتے.........."

کھٹاک کی زور دار آواز کے ساتھ پیتل کا گلدان اس کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور دیدے پھیل گئے۔ پیشانی سے خون کی دھاریں بہتی ہوئی آنکھوں میں اترنے لگیں۔

وسیم نے دونوں ہاتھوں سے گلدان کو اپنے سر سے اونچا کیا اور جنونی انداز میں چیخ کر بولا۔ "میں مرد ہوں.......... بول میں.........."

کھٹاک! دوسری بار گلدان اس کی ناک پر پڑا اور وہ پیچھے کی طرف قالین پر پڑے ہوئے سرخ لبادے پر گر کر پھڑپھڑانے لگی۔ اس کا چہرہ لہو سے تر بہ تر ہوگیا تھا۔ ناک سے خون کا باریک فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی کراہوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جان کنی کے وقت کتنی اذیت میں مبتلا ہے۔

اسے تڑپتے دیکھ کر وسیم کے ہاتھوں سے گلدان چھوٹ گیا۔ اس کی وحشت' گھبراہٹ میں بدل گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ ذرا دیر بعد ثمینہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی۔ اس کے چہرے سے بہتا ہوا لہو' لبادے پر آرہا تھا اور اس کی سرخی سے ہم رنگ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے سرخ کپڑے وسیم کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں چاروں طرف خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔

اسی وقت گھر کی ملازمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ دروازے پر کھڑی خوفزدہ نظروں سے کبھی وسیم کو اور کبھی اپنی مالکن کو دیکھ رہی تھی۔ وسیم لڑکھڑاتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو وہ چیختی ہوئی بھاگ گئی۔ وسیم کے بدن پر ایسی کپکپی طاری ہوگئی تھی کہ وہ اسے روکنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ نہ سکا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازے تک آیا اور دیوار کا سہارا لے کر جلدی جلدی باہر کی طرف جانے لگا۔ ثمینہ کی لاش نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے دل کی گھبراہٹ اور دہشت ذرا کم ہوگئی۔ کم از کم اتنی قوت بحال ہوگئی کہ اب وہ ہوش وحواس سے کام لے کر قانون کی پہنچ سے دور جاسکتا تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا اور ڈگمگاتا ہوا پورچ میں آیا۔ ثمینہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور دوسرے ہی لمحے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔

دو گھنٹے بعد ثمینہ کی کوٹھی میں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ واردات والے کمرے میں ملازمہ پولیس انسپکٹر کو اپنا بیان دے رہی تھی کہ ایک سپاہی قیصر مراد کو بھی بلا کر لے آیا تھا۔ ثمینہ کی لاش دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ غصے سے کانپنے لگا۔ ملازمہ کی چشم دید گواہی اور وسیم کے فرار نے اسے یقین دلادیا تھا کہ وسیم نے ہی دوستی کی آڑ میں اس کی محبت کا خون کیا ہے۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"مسٹر مراد! قاتل اپنا سامان چھوڑ گیا ہے' اس کے سامان کی تلاشی لینے پر یہ دو تصویریں ملی ہیں۔ آپ شناخت کریں۔ کیا یہی وسیم احمد درانی ہے؟"

اس نے ایک تصویر بڑھا دی۔ مراد نے اسے لے کر دیکھا اور غصے اور نفرت سے

کہا۔ "ہاں۔ یہی ہے وہ بدمعاش............"

انسپکٹر نے دوسری تصویر بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہ تصویر؟"

مراد نے بے دلی سے وہ تصویر لی لیکن اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر گہری توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ ایک بارہ سالہ لڑکی کی تصویر تھی مگر وہ لڑکی وسیم کی ہمشکل تھی۔ دونوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وسیم نے بال بڑھا کر اور چوٹی گوندھ کر وہ تصویر اتروائی ہے۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا آپ وسیم کے تمام خاندان والوں سے واقف ہیں؟"

"جی نہیں!" مراد نے جواب دیا۔ "وسیم کے گھر والوں سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وسیم کی زبانی اتنا سنا تھا کہ اس کا ایک بیمار باپ اور ایک بارہ سال کی بہن ہے۔"

"کیا آپ نے کبھی اس کی بہن کو بھی نہیں دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"یہ وسیم کی بہن کی تصویر ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس تصویر کے پیچھے دیکھئے۔"

مراد نے تصویر کو الٹ کر دیکھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا۔

"میری ننھی منی بہن شائستہ درانی۔"

☆------☆------☆

ڈاک بنگلے کی رات آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی۔

روزی پلنگ پر لیٹی ہوئی بڑی خاموشی سے مراد کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دلی جذبات کا اندازہ کررہی تھی۔

مراد کھلے ہوئے سوٹ کیس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ لبادہ تھا۔ سو کینڈل پاور کی روشنی میں لبادے کی سرخی جھلملا رہی تھی اور مراد کی خونی آنکھوں میں عکس ریز ہورہی تھی۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

"وہ نہیں ملا۔ پولیس اسے تلاش کرتی رہی۔ میں خون کا پیاسا اپنی پیاس بجھانے کے لئے اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نہیں ملا۔

وہ شریف اور شرمیلا قاتل راتوں رات سرحد پار کرگیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد

معلوم ہوا کہ اس کے بیمار باپ نے اپنی کھاد کی فیکٹری فروخت کردی ہے۔ ایک بار میں پولیس انسپکٹر کے ساتھ اس بوڑھے سے ملنے گیا تھا۔ دوسری بار تنہا گیا تو وہ کوٹھی خالی ہوگئی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یو' کے چلاگیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں باپ بیٹے ملک سے باہر ملیں گے اور کسی دوسرے ملک میں اپنے لئے رہائشی سہولتیں حاصل کرلیں گے۔

میں اس کی تلاش میں ملک سے باہر نہ جاسکا۔ ڈیڈی نے میرا پاسپورٹ چھین کر رکھ لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ مجھے عاق کردیں گے۔ سب پیسوں کا کھیل ہوتا ہے اور میں پیسوں کے لئے باپ کا محتاج تھا۔

اب میں محتاج نہیں ہوں۔ ڈیڈی کا انتقال ہوچکا ہے۔ میں آزاد ہوں۔ جہاں چاہوں' جاسکتا ہوں لیکن قاتل کے پیچھے جانے کی نوبت نہیں آئی۔ راجہ مظفر علی کے سیکرٹری حامد شیخ سے میری پرانی واقفیت ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ رئیس احمد درانی کی صاحبزادی شائستہ درانی راجہ صاحب کی ٹی اسٹیٹ خرید رہی ہے اور یہ خریداری مسز گرانٹ کے ذریعے عمل میں آرہی ہے۔ کیونکہ شائستہ پردے کی پابند ہے۔

مگر شائستہ دوبارہ زندہ کیسے ہوگئی؟ اس کے باپ نے تو کہا تھا کہ وہ بارہ سال کی عمر میں اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی..........

ہاں۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ مرگئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے کسی جھگڑے کی بنا پر علیحدگی اختیار کرلی ہو اور شائستہ اپنی ماں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ننھیال چلی گئی ہو۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے معنی ایک دم بدل جاتے ہیں۔ میں نے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ شائستہ زندہ تھی.......... اور اب بھی زندہ ہے۔

لیکن وہ اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی ہے۔ مغربی ممالک میں رہ کر آئی ہے اور پردے کی پابندی کررہی ہے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے' بلکہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شائستہ نہیں ہے۔ وسیم نے قانون کے ڈر سے میرے خوف سے خود کو برقعے میں چھپا رکھا ہے۔

ہاں یہ ممکن ہے۔

مگر نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ قانون اندھا نہیں ہے۔ وسیم میک اپ اور گٹ اپ

کے ذریعے شائستہ بن کر یہاں نہیں آسکتا۔ یہاں آنے سے پہلے اس کی تصویر' میڈیکل سرٹیفکیٹ اور تمام ضروری کاغذات دیکھے گئے ہوں گے۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ وہ سو فیصد شائستہ درانی ہے' اسے یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہوگی۔

لعنت ہے شائستہ درانی پر۔ میں اس کے متعلق کیوں سوچنے لگتا ہوں۔ مجھے اس پہلو سے سوچنا چاہئے کہ وسیم جس طرح غیر قانونی طریقے سے سرحد پار گیا تھا اسی طرح پھر چوری چھپے چلا آیا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ سات سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس ملک کے حکمران بدل گئے ہیں۔ قانون میں بھی کسی قدر لچک پیدا ہوگئی ہے۔ پولیس افسران کا بھی اِدھر اُدھر تبادلہ ہوگیا ہے۔ ثمینہ کے مرڈر کیس کی فائلیں دوسری فائلوں کے بوجھ تلے دب کر دیمکوں کی خوراک بن گئی ہیں۔ وہ قانون سے اتنا خائف نہیں ہے۔ وہ صرف مجھ سے خوفزدہ ہے اور حویلی کی اوپری منزل میں صرف میری وجہ سے چھپا بیٹھا ہے.........."

مراد کی بڑبڑاہٹ ختم ہوگئی۔

وہ آنکھیں بند کرکے اپنے آخری خیال کو مستحکم بنانے لگا کہ حویلی کی اوپری منزل میں وسیم چھپا ہوا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ شائستہ پھر اس کے خیالوں میں آگئی۔

ٹھیک ہے کہ وسیم چھپا ہوا ہے.......... لیکن شائستہ بھی کیوں چھپ رہی ہے؟

وہ بدصورت نہیں ہے کہ دوسروں کے سامنے نہ آئے.......... مراد سات برس پہلے اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ بارہ برس کی گڑیا جیسی لڑکی تھی' اب تو انیس برس کو عمر کو پہنچ کر اس کے حسن میں غضب کا نکھار آیا ہوگا۔

پھر وہ کیوں چھپ رہی ہے؟"

کیا یونہی مجھے الجھانے کے لئے؟ لیکن اسے کیا معلوم کہ میں وسیم کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ روزی کل وہاں جاکر شاید کچھ معلومات حاصل کرلے۔ مجھے کل تک صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ اس کے بعد میں خود ہی وسیم تک پہنچنے کا راستہ بنالوں گا۔

اس نے پلٹ کر روزی کی جانب دیکھا۔ وہ بے چاری انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس نے سرخ لباس کو سوٹ کیس میں رکھ دیا اور وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے کے ایک صوفے پر دوربین رکھی ہوئی تھی' وہ دوربین اٹھا کر پھر ایک بار برآمدے کی طرف جانے لگا۔

آخر شب کی ہواؤں میں خنکی آگئی تھی۔ تاریکی بدستور مسلط تھی۔ دور پہاڑی کی بلندی پر حویلی کی نچلی منزل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی لیکن اوپری منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے شیشے روشن تھے۔ وہ دوربین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھنے لگا۔

شائستہ.......... یا.......... وسیم؟

اندھے شیشوں کے پیچھے وہ پُراسرار ہستی جاگ رہی تھی یا جاگ رہا تھا.......... اِدھر مراد کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اُدھر روشن شیشے رت جگا منا رہے تھے۔ ان شیشوں کی روشنی کبھی تیز ہوجاتی تھی اور کبھی دھیمی پڑ جاتی تھی۔ کوئی شمعدان اٹھائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہا تھا.......... یا.......... جا رہی تھی۔

مراد دیکھ رہا تھا اور کسی ایک نتیجے تک نہ پہنچنے کے باعث جھنجلا رہا تھا۔

☆------☆------☆

وہ صبح دیر تک سوتا رہا۔ دس بجے روزی نے آکر اسے اٹھایا۔

"مراد! اُٹھو۔ دس بج گئے ہیں۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر ہلانے لگی۔ اس نے دوسری کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہٹو مجھے سونے دو۔"

"واہ' اچھی نیند ہے۔ میں حویلی سے واپس آگئی اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر بڑے اضطراب سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھا۔ "تم گئی تھیں؟"

"ہاں!"

"فرسٹ فلور میں؟"

"نہیں' نیچے ڈرائنگ روم میں۔ میں نے مسز گرانٹ سے کہا کہ میں ایک ٹورسٹ گروپ کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ پرانی حویلی دیکھ کر بہت سے راجہ مہاراجاؤں کی سنی سنائی باتیں یاد آگئیں۔ میں اس حویلی کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی اس لئے یہاں آگئی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مجھے یہاں کی سیر کرا دیجئے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

مسز گرانٹ نے اپنے مسلح باڈی گارڈ سے فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم پرفیکٹ انفارمیشن لینا مانگتا.........." پھر اس نے ملازم لڑکے سے کہا۔ "بوائے مس روزی کو ہمارا اسٹیٹ کا فرسٹ کلاس چائے مارو۔"

اس کی بولی سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ مسز گرانٹ نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر وہ پلٹ کر فرسٹ فلور کے زینے کی طرف چلی گئی۔"

قیصر مراد نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم اوپری منزل میں گئی تھیں یا نہیں؟ مجھے پوری تفصیل سے کہانی نہ سناؤ۔"

"نہیں مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ملی۔"

"کیوں؟"

"اب اس کیوں کا جواب دوں گی تو تم کہو گے کہ کہانی سنا رہی ہوں۔"

اس نے بے بسی سے ہونٹوں کو بھینچ کر اسے دیکھا' پھر کہا۔ "اچھا بولو.......... کیا بولنا چاہتی ہو؟"

روزی نے کہا۔ "دو منٹ کے بعد وہ باڈی گارڈ فون کا ریسیور رکھ کر میرے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے غرا کر بولا۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ اسٹیٹ پولیس نے بتایا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے یہاں کوئی ٹورسٹ گروپ نہیں آیا ہے۔ کل شام سے راجہ مظفر علی کا سابقہ سیکرٹری حامد شیخ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کے ساتھ ڈاک بنگلے میں آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ نوجوان عورت کا حلیہ آپ سے ملتا ہے۔ کیا آپ وہی محترمہ ہیں؟"

میری گردن جھک گئی۔ ایک جھوٹ کی وجہ سے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا کہ گھبراہٹ میں' میں کوئی بات نہ بنا سکی۔ اس نے کہا۔

"آپ کے لئے چائے آرہی ہے۔ چائے پینے کے بعد واپس چلی جائیں۔ حامد شیخ کی وجہ سے نرمی برت رہے ہیں۔ ورنہ اب تک پولیس نہایت احترام سے آپ لوگوں کو اسٹیٹ کے باہر چھوڑ آتی۔"

یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ ایسی توہین آمیز باتیں سن کر مجھے وہیں سے چلے آنا چاہئے تھا لیکن میں نے تمہارے فائدے کی خاطر یہ توہین بھی برداشت کرلی۔ میں نے سوچا کہ شاید چائے پینے تک مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے.........."

مراد نے پھر جھلا کر کہا۔ "تمہاری چائے کی ایسی کی تیسی کم سے کم الفاظ میں کہو۔ کیا کام کی بات معلوم ہوگئی؟"

"ہاں۔ مسز گرانٹ اوپر سے ردی کی ٹوکری اور سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھرا ہوا ایش ٹرے لے کر آئی اور ملازم سے بولی کہ انہیں ڈسٹ بن میں لے جاکر پھینک دے۔ سگریٹ کے ٹوٹے دیکھ کر میں چونک گئی۔ سوچنے کی بات ہے مراد۔ جو مسلمان لڑکی پردے

کی پابندی کرتی ہے' وہ سگریٹ کیسے پی سکتی ہے۔ کیا کسی برقعہ پوش خاتون کو تم نے کبھی سگریٹ پیتے دیکھا ہے؟"

مراد آنکھیں سکیڑ کر اپنی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ سچ مچ پردے کی قائل نہیں ہے۔ مغربی ماحول میں رہ کر آئی ہے اس لئے سگریٹ پی سکتی ہے۔"

روزی اپنے ہینڈ بیگ کو کھولتی ہوئی بولی۔ "حویلی کے احاطے سے باہر ایک ڈسٹ بن رکھا ہوا ہے' واپسی پر میں اس میں تھوکنے کے بہانے سے اس پر جھکی اور کاغذ کا یہ مڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کر لے آئی۔ وہاں اور بہت سے مڑے تڑے کاغذ تھے۔ اگر میں انہیں بھی سمیٹنے کی کوشش کرتی تو مین گیٹ پر کھڑا ہوا دربان مجھ پر شبہہ کرنے لگتا.........."

مراد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کو جھپٹ لیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ مختصر تحریر تھی مگر اس پر بہت زیادہ کانٹ چھانٹ کی گئی تھی۔ مراد صحیح اور مناسب الفاظ کی ترتیب سے پڑھنے لگا تو وہ تحریر کچھ اس طرح مرتب ہوئی۔

"یہ گوشہ نشینی مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر ایک گناہ گار کی طرح منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔ مسز گرانٹ ٹھیک کہتی ہیں' مجھے خدا کے فیصلے کے سامنے جھک جانا چاہئے.......... ہاں! میں تقدیر سے سمجھوتہ کرلوں گا۔ آج سے گوشہ نشینی ترک کرنے کی کوشش کروں گا.........."

مراد نے اس کاغذ کو مٹھی میں بھینچ لیا اور جوشیلے انداز میں کہا۔ "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ وسیم ہے.......... بزدل دشمن.......... عورت کا بہروپ لے کر گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ شائستہ درانی کا نام اپنا کر دنیا والوں کو دھوکا دے رہا ہے۔ نہیں' صرف مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

"مراد!" روزی نے کہا۔ "اب تو دھوکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھو' کاغذ میں لکھا ہے کہ وہ گوشہ نشینی ترک کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی سیر کے لئے نکلے گا۔"

"تمہیں اس کا پروگرام کیسے معلوم ہوا؟"

"جب میں حویلی میں سے باہر آرہی تھی تو مسز گرانٹ نے بالکونی سے کوچوان کو آواز دے کر کہا تھا کہ بگھی تیار رکھے۔ شائستہ جاگنے کے بعد چائے کے باغات دیکھنے جائے گی۔"

مراد اچھل کر پلنگ سے اتر گیا اور اپنے کپڑے پہنتے ہوئے بولا۔ "شائستہ نہیں' وسیم اپنے باغات کو دیکھنے جائے گا۔ تمہیں یہ بات پہلے کہنا چاہئے تھی۔ بہرحال میں اسے راستے میں گھیر لوں گا۔" کپڑے پہننے کے بعد وہ جوتے پہننے لگا۔ "تم حامد شیخ کے ساتھ اس کی گاڑی میں واپس چلی جاؤ۔ ورنہ پولیس تمہیں بھی میرے جرم میں ملوث کرے گی۔"

"اسٹیٹ پولیس ہم تینوں کو جانتی ہے۔"

"ان کے جاننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ حامد شیخ کہہ دے گا کہ اسے میری نیت کا علم نہیں تھا کہ میں یہاں کسی کو قتل کرنے آیا ہوں اور تم ایک بکنے والی چیز ہو۔ تمہیں کوئی شریف دولت مند بھی خرید سکتا ہے اور مجھ جیسا مجرم بھی۔ تم بھی یہی بیان دے دینا کہ تمہیں میری مجرمانہ نیت کا علم نہیں تھا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا اور اسے کھول کر جلد بازی میں کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور آگیا۔ روزی نے قریب آکر کہا۔

"مراد! میں اچھی عورت نہیں ہوں مگر میرا دل اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم قانون کو ہاتھ میں لو۔ وسیم خود ایک مجرم ہے۔ تم اسے قانون کے حوالے کرکے انتقام لے سکتے ہو۔"

"دور ہٹو!" اس نے ایک طرف اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "کیا عدالت اسے ایسی سزا دے سکتی ہے کہ وہ ثمینہ کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے؟ نہیں۔ اسے ایسی سزا صرف میں ہی دے سکتا ہوں۔ میں اسے ایسی اذیت ناک.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ دور' بہت دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں کان لگا کر سننے لگے۔ روزی نے کہا۔ "شاید وہی بگھی آرہی ہے۔"

مراد دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ دور کولتار کی نشیبی سڑک پر دو گھوڑوں کی ایک بگھی دوڑی آرہی تھی۔ بگھی کے آگے پیچھے چار گھوڑوں پر اسٹیٹ کے سپاہی اور ایک انسپکٹر نظر آرہے تھے۔

مراد نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ روزی نے کہا۔

"مراد! میری بات مان لو تم قانون کا سہارا لے کر وسیم کو گرفتار کرا سکتے ہو۔ اسٹیٹ سپاہیوں سے ٹکرانا دانشمندی نہیں ہے۔"

وہ دانت پیستے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا اور سنجیدگی سے روزی کے مشورے پر غور کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ بگھی کے اندر وسیم بیٹھا ہوا ہے.......... وہ وسیم جو پولیس کے ریکارڈ میں ایک مفرور قاتل تھا۔ اگر اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہاتھ آئے ہوئے قاتل کو نکل جانے دے۔ اگر وہ ہاتھ آ کر نکل گیا اور کہیں روپوش ہو گیا تو پھر ایک طویل تلاش اور پچھتاوا رہ جائے گا۔

بگھی ڈاک بنگلے کے سامنے آ کر رک گئی۔ انسپکٹر نے گھوڑے کو دروازے کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "مسٹر حامد شیخ! اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آئیے۔ پلیز ہری اپ!"

روزی اور مراد کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ مراد نے کہا۔ "مسٹر حامد شیخ نہیں ہیں۔ کہیں باہر گئے ہیں۔"

انسپکٹر نے روزی کی جانب انگلی اٹھا کر پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

"میری کزن۔"

"یہ حویلی میں کیوں گئی تھیں؟"

مراد برآمدے سے اتر کر بگھی کے قریب جاتے ہوئے بولا۔ "میری کزن اس پُراسرار ہستی کو دیکھنا چاہتی ہیں جو حویلی کے فرسٹ فلور میں چھپی رہتی ہے، جسے اسٹیٹ کے کسی باشندے نے آج تک نہیں دیکھا اور شاید آپ نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔"

انسپکٹر نے پلٹ کر بگھی کی جانب دیکھا۔ بگھی کے بند دروازے اور کھڑکیوں کے پیچھے پُراسرار خاموشی تھی۔ مراد نے کہا۔

"انسپکٹر! مجھے یقین ہے کہ آپ اسٹیٹ سے زیادہ حکومت کے وفادار ہیں۔ اس یقین کے ساتھ میں آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ سات سال پہلے رئیس احمد درانی کے صاحبزادے وسیم احمد درانی نے ثمینہ نامی ایک مشہور گلوکارہ کو بڑی بے

دردی سے ہلاک کیا تھا اور قانون کے ہاتھوں سے بچ کر سرحد پار چلا گیا تھا۔ میں اس قاتل کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ شائستہ درانی کے نام سے اسٹیٹ کو خریدنے والا وہی قاتل ہے اور وہ.......... اس وقت.......... اس کوچ میں موجود ہے۔"

انسپکٹر نے بگھی کی طرف سے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا تم نشے میں ہو؟ اس کوچ میں درانی اسٹیٹ کی معزز مالکہ شائستہ بیگم ہیں۔"

"کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا ہے؟"

انسپکٹر نے قدرے پریشان ہو کر بگھی کی جانب دیکھا، پھر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "کسی معزز پردہ نشین خاتون کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

مراد نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔ "میری درخواست ہے کہ آپ کسی لیڈی کانسٹیبل کو بلائیں۔ وہ تو بیگم صاحبہ کو دیکھ سکتی ہے نا؟"

اتنے میں بگھی کا دروازہ کھلا۔ مسز گرانٹ باہر آتی ہوئی بولی۔ "ویٹ انسپکٹر! مس اس نوجوان کو سیٹسفائی کرنا مانگتا ہے.......... کم آن مس! ہم پہلے بولا کہ پبلک کے سامنے میں آؤ۔ ڈرنے کا، شرم کرنے کا بات نئی ہے.........."

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک سیاہ برقعہ بگھی سے اترنے لگا۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ مراد دیکھ رہا تھا، برقعے سے باہر جو ہاتھ نظر آ رہے تھے، وہ گورے، چکنے اور ملائم تھے۔ صرف وہ دو سبک اور نازک سے ہاتھ بتا رہے تھے کہ برقعے کے اندر ایک مکمل دوشیزہ ہے، جس کے نسوانی وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

وہ برقعے کے پیچھے سر اٹھائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ برقعے کے بٹن کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ نارنجی رنگ کی شلوار قمیض اور دوپٹہ اجلی دھوپ میں شعلوں کی طرح آنچ دینے لگا۔ لباس کا وہ رنگ مراد کی کمزوری سے کھیل رہا تھا۔ اس کی سوچ اور سمجھ کے مطابق لڑکی جوان ہو اور خوبصورت ہو تو اس رنگ کے لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک دی.......... وہ شائستہ تھی۔

اس کے حسین مکھڑے کو دیکھ کر مراد ایک ساعت کے لئے سانس لینا بھول گیا۔

گلابی گلابی چہرہ‘ گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ‘ ستواں ناک‘ بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں میں کاجل کی دھار تلوار سے زیادہ خطرناک تھی۔

وہ آنکھیں مراد کو دیکھ رہی تھیں اور مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ آج سے سات سال پہلے اس نے شائستہ کی تصویر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ بارہ برس کی تھی۔ ہو بہو اپنے بھائی کی شکل پر گئی تھی۔ اب بھی اس کے چہرے سے بھولا بسرا وسیم جھانک رہا تھا۔ مگر کہاں وہ اور کہاں یہ۔ یہ تو صنف نازک کی نزاکت اور شگفتگی کا ایک ایسا جیتا جاگتا نمونہ تھی کہ کوئی سنگ تراش اس کے جسم کی شادابیاں تراشنے بیٹھتا تو اس کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے یا پھر وہ خود ہی پتھر کی طرح ساکت ہو جاتا‘ جیسے مراد ہو گیا تھا۔

”مراد!“ شائستہ نے مترنم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا شبہ دور ہو گیا؟“

مراد نے اس سے پوچھا۔ ”وسیم کہاں ہے؟“

وہ زیر لب مسکرائی۔ جواب دینے کے لئے اس کے ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ پھر اس نے مسز گرانٹ کی جانب پلٹ کر کہا۔ ”آپ سپاہیوں کے ساتھ آگے چلی جائیں‘ میں پیچھے پیچھے آتی ہوں۔ مراد مجھ سے ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں مراد؟“

مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مسز گرانٹ بگھی میں بیٹھ گئی۔ تمام سپاہی بگھی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ شائستہ نے کولتار کی سڑک پر آ کر کہا۔

”آؤ مراد۔ میں ایک عرصے کے بعد کھلی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ ایک عرصے کے بعد تمہیں دیکھتے ہی پردے سے باہر آ گئی ہوں۔“

وہ شائستہ کے ساتھ سڑک پر چلنے لگا۔ روزی تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی انہیں دیکھتی رہی‘ پھر ایک سرد آہ بھر کر ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگی۔

وہ دونوں تھوڑی دور تک خاموشی سے چلتے رہے پھر شائستہ نے کہا۔ ”تم شاید پہلی بار مجھے دیکھ رہے ہو لیکن میں برسوں سے تمہیں جانتی ہوں۔“

”کیسے؟“

”وسیم کی زبان سے تمہارا ذکر سنتی رہتی تھی۔ اس کے پاس تمہاری تصویر بھی دیکھی ہے۔“

”وسیم کہاں ہے؟“

”تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ موت کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔“

”وہ زندہ ہے لیکن اندر سے مر گیا ہے۔ تم اسے کیا مارو گے؟“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”میں فلسفیانہ باتیں نہیں سمجھتا۔ سیدھی زبان میں بتاؤ‘ وہ کہاں ہے؟“

شائستہ نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے اپنے دوپٹے کو درست کیا۔ دوپٹے کا آنچل لہرایا تو مراد کی نگاہوں کے سامنے ایک شعلہ سا لپک گیا۔

”وسیم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں سرخ اور نارنجی رنگ کا لباس پسند ہے۔ یہ لباس تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

”لباس بھی اچھا ہے اور تم بھی اچھی ہو۔ میرے خیال سے زیادہ خوبصورت ہو۔ وسیم کو قتل کرنے کے بعد میں تم سے شادی کی درخواست کروں گا۔“

اس کے رخسار حیا سے تمتمانے لگے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو تم.......... تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو اور وہ تم سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتا ہے۔ وہ آج بھی تمہاری خاطر اپنی جان دے سکتا ہے۔“

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اسی لئے اس نے ثمینہ کی جان لی تھی۔“

”اس نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ ثمینہ کی اشتعال انگیزی نے اسے مجبور کر دیا تھا۔“

”بکواس مت کرو۔ تم اپنے بھائی کی صفائی پیش کر کے میری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی ہو تم سمجھتی ہو کہ میں اسے معاف کر دوں گا۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میں ثمینہ کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

وہ چلتے چلتے رک گئی اور التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ان جھیل جیسی گہری آنکھوں میں التجا بھی تھی‘ دکھ بھی تھا اور بے انتہا محبت بھی۔ مراد سحر زدہ سا ہو کر چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا‘ پھر اپنی کمزوری کا احساس ہوتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔ نظریں جھکیں تو سانس لیتے ہوئے ریشمی بدن پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہاں بھی سحر تھا‘ شراب سے زیادہ نشہ تھا۔ وہ نظریں ہٹا کر آگے جانے والوں کو دیکھنے لگا۔ انہیں ایک جگہ رکتے دیکھ کر آگے جانے والی بگھی اور سپاہی بھی رک گئے تھے۔

شائستہ نے بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا۔ "مراد! تمہاری خوشی میں اس کی خوشی۔ تم اس کی دوستی اور محبت کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ وہ تمہاری خوشی کے لئے اپنی جان دے دے گا' بلکہ وہ تمہارے ہاتھوں سے قتل ہونے کے لئے اب تک چھپا بیٹھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم سے پہلے قانون کے ہاتھ اس تک پہنچ جائیں اور تمہارے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے۔"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا' پھر یقین نہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی لچھے دار باتوں سے مجھے بہلا رہی ہو۔ کون ایسا احمق ہے جو دانستہ کسی کے ہاتھوں قتل ہونے کی تمنا کرے؟"

"دوستی اور محبت میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب یہ دنیا اچھی نہیں لگتی۔ زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔ ایسے وقت محبوب کے ہاتھوں مرنے سے آرام آجاتا ہے۔

مراد! وہ ایسی جگہ چھپا ہے جہاں کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ وہاں صرف تم پہنچو گے.......... لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم قاتل بن کر اس کے سامنے جاؤ۔ تم ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اسے قتل کرو گے تو تمہاری زندگی بھی جیل کی چار دیواری میں ضائع ہوجائے گی۔ کیا یہ دانش مندی ہے؟"

مراد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور سوچا کہ لومڑی کی چال چلنی ہوگی۔ شائستہ کی ہاں میں ہاں ملا کر ہی وہ وسیم تک پہنچ سکتا ہے۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"اچھی بات ہے' میں اس سے دشمن بن کر نہیں ملوں گا۔"

"اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ تم برسوں سے انتقام کی آگ میں جل رہے ہو۔ پہلے تنہائی میں بیٹھ کر سوچو اور اس آگ کو ٹھنڈا کرو' اس کے بعد تم دوست بن کر آؤ یا دشمن بن کر.......... میں وسیم کی خواہش کے مطابق تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی.......... تم بھی ضدی ہو اور وہ بھی ضدی ہے۔ تم قتل کرنا چاہتے ہو' وہ قتل ہونا چاہتا ہے۔ بہرحال آج رات کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ' اس کے بعد میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گی۔ تم آؤ گے نا؟"

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ دشمنوں کی دعوت پر اسے قتل کرنے چلا آؤں۔" پھر اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں آج نہیں۔ تمہارے

مشورے کے مطابق میں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کروں گا۔ آج رات سوچوں گا۔ اگر تمہارا مشورہ قابلِ قبول ہوا تو میں کل رات کو تم سے ملنے آؤں گا۔"

وہ ذرا اداس ہوگئی اور ملتجی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "میری دلی تمنا ہے کہ آج کی شام تم میرے ساتھ گزارو اور رات کا کھانا.......... مگر نہیں۔ تم ہمیں دشمن سمجھتے ہو۔ تم اپنے طور پر محتاط ہو۔ مجھے تم سے شکایت نہیں ہے۔ میں کل شام کو تمہارا انتظار کروں گی اور تمہاری پسند کا سرخ جوڑا پہن کر تمہیں خوش آمدید کہوں گی.......... خداحافظ!"

مراد کی نگاہوں کے سامنے پھر وہی سرخ' قرمزی اور نارنجی رنگ جھلملانے لگے۔ لہو سرخ' لباس سرخ' ہونٹوں کے گلاب سرخ اور جذبوں کی آب و تاب سرخ۔ اتنے سارے رنگ گڈمڈ ہوکر نظروں سے دور ہوتے جارہے تھے۔ شائستہ جتنی دور ہوتی جارہی تھی' اتنا ہی اسے اپنے قریب کھینچتی جارہی تھی۔ پھر وہ بگھی کے اندر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆======☆======☆

آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر تھی۔ حویلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نچلی منزل کی تاریکی بتا رہی تھی کہ مسز گرانٹ اور دوسرے ملازم گہری نیند سو رہے ہیں۔ اوپر ایک کمرے میں مومی شمعیں روشن تھیں۔ شائستہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی' جیسے وہ اپنے آپ کو نہیں' کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ رہی ہو اور پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے جسم پر سفید ریشم کی نائٹی تھی۔ بالکونی کے ادھ کھلے دروازے سے آنے والی خنک ہوائیں اس نائٹی کو چھیڑ رہی تھیں اور بدن کی حدت کو ہولے ہولے تھپک رہی تھیں۔

اس کے دائیں طرف دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے سے کبھی کبھی وسیم کی آہ سنائی دیتی تھی۔ پھر دھیمی سی آواز رات کی خاموشی میں سسکنے لگی تھی۔

"آہ۔ کب یہ انتظار ختم ہوگا؟

وہ کب آئے گا؟

"آ.......... میری جان کے دشمن! کوئی آخری فیصلہ کرلے..........؟"

طویل سسکیوں کے بعد وہ آواز گم ہوجاتی۔ تھوڑی دیر کے لئے گہرا سناٹا چھا جاتا۔ اس کے بعد پھر وہی آہیں، پھر وہی فقرے دہرانے کی آواز آتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہوش و حواس میں نہیں ہے اور ایک رولنگ ٹیپ کی طرح بار بار اپنی آہوں اور فقروں کو دہراتا جارہا ہے۔

شائستہ غمگین اور پریشان نظروں سے اس کمرے کی جانب دیکھنے لگی اور سوچنے لگی۔

"وہ آئے گا.......... آج نہیں آئے گا.......... کل ضرور آئے گا.......... ہمیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کمرے سے گونجنے والی آہ و فغاں کو اب ختم ہوجانا چاہئے۔ وسیم کی آواز مجھے مایوس کردیتی ہے.........."

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شمعدان کے پاس آئی اور اسے اٹھا کر دوسرے کمرے کی جانب پلٹ گئی لیکن بالکونی کے دروازے سے گزرتے وقت اس کے قدم اچانک رک گئے۔

سامنے درخت پر سرخ رنگ لہرایا تھا۔ پھر مراد درخت کی شاخ سے جھولتا ہوا بالکونی کے پشتے پر آگیا۔ وہ گردن سے پاؤں تک سرخ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ شائستہ کو دیکھتے ہی وہ بالکونی میں ایک ذرا سا یوں جھک گیا جیسے اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا ہو۔ شائستہ بھی اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں شمعدان تھا اور بائیں ہاتھ کو اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیا تھا۔

پھر وہ لانبے لانبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں آیا۔ شائستہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔

"تم.......... تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آؤ گے؟"

وہ تلخی سے منہ بنا کر بولا۔ "میں نے اس لئے کہا تھا کہ تم میری طرف سے غافل رہو گی اور تمہیں میرے خلاف کوئی چال چلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم نے مجھے دعوت دی تھی کہ تمہارے بھائی کا دوست بن کر یا دشمن بن کر یہاں آؤں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ دشمن کے گھر دشمن بن کر آؤں گا تو میرا کیا حشر ہوگا؟

میں اپنے دماغ سے سوچتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔ ابھی یہاں چھپ کر آنے

کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ مجھے یہاں وسیم کی موجودگی کا علم ہوگیا ہے۔ ابھی میں نے اس کی آواز سنی ہے.........."

اسی وقت پھر وسیم کی آہیں سنائی دیں۔

"آہ۔ کب یہ انتظار ختم ہوگا.......... وہ کب آئے گا.......... آ.......... میری جان کے دشمن! کوئی آخری فیصلہ کرلے.........."

مراد نے دوسرے کمرے کی جانب دیکھا۔ پھر جنونی انداز میں دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا اور اس کے ہینڈل کو پکڑ کر جھٹکے دینے لگا۔ "دروازہ کھولو.......... بزدل.......... تم نے دروازے کو اندر سے بند کر رکھا ہے لیکن آج تم مجھ سے بچ کر نہیں جاؤ گے۔"

شائستہ نے شمعدان کو مینٹل پیس پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تحمل سے کام لو مراد۔ دروازہ کھل جائے گا مگر پہلے میری بات سن لو۔"

"نہیں۔ پہلے دروازہ کھولو!" وہ اپنے جسم سے لبادے کو اتارتے ہوئے بولا۔ "اس لبادے کی قسم، میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ ثمینہ کا خون آج بھی اس لبادے کی سرخی میں اپنے قاتل کو پکار رہا ہے۔ میں اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں کہ تم اپنی فریادوں سے، اپنی اداؤں سے اور اپنی نگاہوں سے مجھے کمزور نہیں بنا سکو گی۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے رہے گا اور ثمینہ انتقام کے لئے میرے اندر چیختی رہے گی۔ آواز دو اپنے بھائی کو۔ اس سے کہو کہ دروازہ کھول دے۔ ورنہ میں اس دروازے کو توڑ دوں گا۔"

"یو شٹ اَپ!" زینے کی طرف کھلنے والے دروازے سے مسز گرانٹ کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ وہ ہاتھ میں پستول لئے کھڑی تھی۔ مراد پستول کا رخ اپنی طرف دیکھ کر کسی درندے کی طرح غرانے لگا۔ اس کی جیب میں بھی ریوالور تھا لیکن مسز گرانٹ غافل نہیں تھی کہ اسے ریوالور نکالنے کا موقع دے دیتی۔ اس نے حقارت سے کہا۔

"یو فول۔ تم مِس کو مرڈر کو آیا ہے۔ ہم پولیس کو کال کرے گا۔ تم اپنا ہاتھ اوپر کرو، نئی تو ہم شوٹ کردے گا.........."

شائستہ جلدی سے مراد کے سامنے آکر ڈھال بن گئی۔

"نو مسز گرانٹ۔ آپ یہاں سے چلی جائیے۔ مراد کو میں نے یہاں بلایا ہے۔ آپ

نیچے جاکر ملازموں سے کہہ دیجیے کہ یہاں گولیاں چلنے کی بھی آواز آئے تو کوئی یہاں نہ آئے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

مسز گرانٹ نے حیرانی سے کہا۔ "مس! تم کیسا مافق بات کرتا ہے۔ یہ آدمی ڈینجرس ہے۔"

"ہونے دو۔ میں جو کہتی ہوں' وہ کرو۔ پلیز لیو اَس ایلون۔ میں اپنی حفاظت آپ کروں گی۔"

مسز گرانٹ تذبذب میں مبتلا ہوگئی۔ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ شائستہ نے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت وفادار ہیں۔ یہ بھی آپ کی وفاداری کا امتحان ہے۔ میرا حکم مانئے اور یہاں سے چلی جائیے۔"

مسز گرانٹ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہاں سے جانا نہ چاہتی ہو۔ پھر اس نے نظریں نیچی کرلیں اور مجبوراً سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

شائستہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ پھر وہ بالکونی کی طرف گئی اور وہاں کا دروازہ بھی بند کرنے لگی۔ مراد اس کی ان حرکتوں سے الجھن میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے بھائی کے دشمن کی حفاظت کیوں کر رہی ہے۔

شائستہ نے دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرنے کے بعد کہا۔ "اب تم محفوظ ہو۔ میں نے نچلی منزل سے آنے والوں کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ اب اگر تم وسیم کو قتل کرنا چاہو تو تمہارا ہاتھ کوئی نہیں پکڑے گا لیکن اس کے پاس جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو!" مراد نے کہا۔ "اب مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

شائستہ آہستہ آہستہ ایک اونچے سے اسٹول پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "شکاری شکار کھیلنے سے پہلے اپنے شکار کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔"

"میں وسیم کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں تم نہیں سمجھتے۔ میں وسیم کے ماضی کی چند باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ اگر تم غور سے نہیں سنو گے تو بعد میں تمہیں افسوس ہوگا۔

مراد! یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے ممی اور ڈیڈی کو ایک بیٹی کی آرزو تھی۔ بڑے گھرانوں میں بیٹیاں بوجھ نہیں سمجھی جاتیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ بیٹیوں سے گھر کی رونق بڑھتی ہے۔

بہرحال میرے والدین کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ان کی توقع کے خلاف وسیم پیدا ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ حمل کے دوران بچوں پر ماں باپ کی سوچوں' امنگوں اور خواہشات کا اثر پڑتا ہے' وسیم اپنی پیدائش سے ہی لڑکیوں جیسی نزاکت اور خوبصورتی لے کر آیا تھا۔

میری ممی اسے لڑکیوں کے فراک پہناتی تھیں اور لڑکیوں جیسے بال سنوارتی تھیں۔ جب اس نے توتلی زبان سے بولنا شروع کیا تو اس کی بولی بھی لڑکیوں جیسی تھی۔ پانچ سال کے بعد ڈیڈی نے میری ممی کو سمجھایا کہ اب اسے لڑکوں کے روپ میں آنا چاہئے کیونکہ اب وہ گھر کے ماحول سے نکل کر اسکول جایا کرے گا۔

وہ اسکول جانے لگا۔ وہاں کا ماحول اسے سکھاتا تھا کہ وہ لڑکا ہے۔ گھر میں ماں کا اندھا پیار سمجھاتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اسی کشمکش میں وہ عمر کی منزلیں طے کرنے لگا۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی ملاقات تم سے ہوئی۔ وہ تمہاری مردانہ شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ رفتہ رفتہ دوست بن کر تمہارے قریب آگیا۔

ڈیڈی اسے سمجھایا کرتے تھے کہ اسے مردوں کی طرح چلنا پھرنا اور بولنا چاہئے۔ اگر وہ عورتوں کی سی نزاکت کرے گا تو لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے۔ ڈیڈی کی عزت اور مرتبے کا خیال کرکے وہ زنانہ طرز زندگی سے پرہیز کرنے لگا۔ فیکٹری میں' کلبوں اور ہوٹلوں میں اور دیگر تقریبات میں اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ خود کو مکمل مرد ظاہر کرے۔ وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوگیا لیکن پیدائشی خصوصیات وقتی طور پر دب جاتی ہیں' بالکل ہی ختم نہیں ہوجاتیں۔ وہ تمہارے سامنے آکر کمزور پڑ جاتا تھا۔

اس کی دوستی کے پس پردہ وہ لڑکی چھپی ہوئی تھی جو ممی کی گود میں اور ان کے اندھے پیار کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔ وسیم بہت ہی ذہین اور صابر تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اندر بیٹھی ہوئی لڑکی کو کچلتا رہتا تھا۔ اس نے تم سے کبھی اس کشمکش کا ذکر نہیں کیا۔

وہ سوچتا تھا کہ نہ جانے تم اس کے متعلق کیسی رائے قائم کرو گے۔ اس کے علاوہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ڈیڈی کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دے گا۔

وہ تمہارے پاس اکثر آتا تھا۔ تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا تھا اور اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ بس اتنی قربت کافی ہے۔ وہ اس دوستی کے پردے میں چھپ کر اسی طرح ساری زندگی گزار لے گا لیکن‘ قدرت اس کے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں بڑی رازدارانہ پریشان کن تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے گھبرا کر ممی سے ذکر کیا۔ ممی نے ڈیڈی کو بتایا۔ ڈیڈی بوکھلا کر ڈاکٹروں سے کنسلٹ کرنے لگے۔ ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور کہا کہ یہ تبدیلیاں جنسِ مخالف کی تکمیل تک پہنچیں گی۔ اگر ان تبدیلیوں کے دوران کوئی رکاوٹ پیدا ہوجائے تو آپریشن اور میڈیکل ٹریٹمنٹ کی ضرورت پیش آئے گی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں استعمال کے لئے لکھ کر دے دیں۔

ڈیڈی کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ وسیم ان کی سوسائٹی میں ایک مذاق بن جائے گا۔ جب وہ کوٹ پتلون کی بجائے ساڑھی یا شلوار کرتہ پہن کر نکلے گا تو لوگ قہقہے لگائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سوسائٹی کو اور اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے اور تمام جائیداد بیچ کر لندن وسیم کے چچا کے پاس چلے جائیں گے۔

وسیم کو ڈیڈی کے ارادوں کا علم ہوا تو وہ تم سے بچھڑ جانے کے خیال سے پریشان ہوگیا۔ آخری بار تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے وہ تمہارے پاس آیا۔ اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور وہ تم سے کیوں بچھڑنے والا ہے۔ اس نے سوچا کہ جہاں اتنے عرصے تک رازداری رہی‘ وہاں اب جدا ہوتے وقت زبان کھولنا اور ڈیڈی جس سچائی کو راز بنا کر رکھنا چاہتے ہیں‘ اس راز کو فاش کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

لیکن وہاں ثمینہ کو تمہاری محبوبہ کے روپ میں دیکھ کر اس کے دل میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ پھر بھی اس نے ثمینہ سے نفرت اور تم سے محبت کا اظہار نہیں کیا‘ صرف تمہاری دوستی کا دم بھرتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد اسے ثمینہ کے ہرجائی پن کا علم ہوا تو اس نے تمہارے سامنے کھل کر اس سے نفرت کا اظہار کیا مگر تم اس سے نفرت

کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ تم نے وسیم سے کہا کہ تم ثمینہ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ وہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

یہ سرخ لباس والی بات وسیم کے دل میں بیٹھ گئی۔ رات کو جب کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ ثمینہ تمہارے ساتھ چلی گئی تھی تو وہ اس کی خواب گاہ میں آیا اور اس کی الماری سے یکے بعد دیگرے سرخ لباس نکال کر اپنے جسم پر سجانے لگا اور آئینے میں دیکھ کر سوچنے لگا کہ آپریشن کے بعد کیا وہ ایسے ملبوسات میں خوبصورت نظر آئے گا؟ کیا تم اسے بھی دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھو گے؟

وہ ایک ایک لباس پہن رہا تھا اور انہیں اتار کر اِدھر اُدھر پھینکتا جا رہا تھا۔ آخری بار اس نے سرخ لبادے کو ہاتھوں میں لیا تو ثمینہ خلاف توقع وہاں پہنچ گئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ وسیم اسے چاہتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے لباس کو سینے سے لگا کر اپنی حسرت پوری کرتا ہے‘ یہ سوچ کر وہ اسے محبت کے نام پر گناہ کی دعوت دینے لگی۔ وسیم پریشان ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس پر ثمینہ نے طعنہ دیا کہ وہ مرد نہیں ہے۔ یہ طعنہ اس کے دماغ میں ایک ہتھوڑے کی طرح لگا۔ برسوں سے جس راز کا علم کسی کو نہ تھا‘ وہ راز ثمینہ کی زبان پر آگیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اسے مارنے لگا۔ ثمینہ اسے اور زیادہ بھڑکانے لگی۔ اس نے دھمکی دی کہ وسیم نے اگر اس کی آرزو پوری نہ کی تو وہ دنیا والوں سے کہہ دے گی کہ وہ عورت ہے اور اسی لئے عورت سے دور بھاگتا ہے۔

وسیم نے پیتل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کردیا۔ وہ پاگل ہوگیا تھا جس راز کے لئے وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ یہ ملک چھوڑ رہا تھا‘ وہ ثمینہ کی زبان سے طشت از بام ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نسوانیت برداشت کرسکتا تھا مگر اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ دنیا والوں کے سامنے اس کے ڈیڈی کا سر جھک جائے۔ بس اس جذبے نے‘ اسی پاگل پن نے اسے قاتل بنا دیا.........“

شائستہ یہ کہہ کر ذرا دیر کے لئے خاموش ہوگئی اور مراد کو دیکھنے لگی۔ مراد بڑی محویت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ ایسے چونک گیا جیسے کسی دلچسپ کہانی کا طلسم ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو‘ وہ درست ہے۔ دروازہ کھولو‘ میں

اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم دیکھو گے اسے ضرور دیکھو گے مگر یہ بتاؤ' اگر میری باتیں درست ثابت ہوئیں تو کیا تم یہ تسلیم کرلو گے کہ ثمینہ بے وفا تھی۔ تمہیں دھوکا دے رہی تھی اور وسیم سے ایسی توقع رکھتی تھی جو کبھی پوری نہ ہوتی۔ اس عورت نے خود ہی اپنی موت کو آواز دی تھی۔ وسیم ایک معصوم اور مظلوم قاتل ہے۔ کیا تم تسلیم کرو گے؟"

"ہاں۔ وسیم کی میڈیکل رپورٹ دیکھنے کے بعد تسلیم کروں گا۔"

"جو رپورٹ کسی کو نہیں دکھائی گئی' اسے تم دیکھو گے' مگر یہ کسی کو کیوں نہیں دکھائی گئی؟ یہ تم سن لو اور سمجھ لو۔ وسیم سات سال تک لندن میں اپنے چچا کے پاس رہا...... رہا نہیں رہی۔ مکمل تبدیلیوں کے بعد جب وہ نئے ماحول میں گیا تو سب اسے لڑکی ہی سمجھتے تھے اور یہ غلط نہیں تھا۔ سات سال کے دوران اسے یہ ملک یاد آتا رہا۔ بلکہ تم یاد آتے رہے......."

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ دوسرے کمرے سے وسیم کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔

"آہ...... کب یہ انتظار ختم ہوگا۔ وہ کب آئے گا......."

شائستہ نے کہا۔ "وہ لندن میں تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ ثمینہ کا انتقام لینے کے لئے تم وہاں ضرور پہنچو گے۔ وہ اس ملک میں آنے سے کترا رہا تھا۔ یہاں آکر وہ اپنی سوسائٹی میں تماشہ بننا نہیں چاہتا تھا لیکن آخر کار دل سے مجبور ہوکر اس نے فیصلہ کیا کہ تمہارے ہاتھوں سے زندگی ملے یا موت؟ وہ دونوں کو قبول کرلے گا اور یہاں آکر جب تک تم سے ملاقات نہیں ہوگی وہ دنیا والوں کو اپنا چہرہ نہیں دکھائے گا۔

مسز گرانٹ اسے سمجھاتی تھیں کہ وہ دنیا والوں سے چھپ کر نہ رہے' خود کو ظاہر کردے۔ اس کے ظاہر ہونے سے جب یہ بات عام ہوگی اور تمہیں اس کا علم ہوگا تو تم یہاں ضرور آؤ گے۔ دوست بن کر یا دشمن بن کر...... وہ مسز گرانٹ کی باتوں سے قائل ہوگیا۔ آج صبح اس نے اپنی داستانِ حیات لکھنے کا ارادہ کیا۔ قلم اور کاغذ لے کر لکھنے بیٹھا تو کتنے ہی صفحات کانٹ چھانٹ کر ضائع کردیئے......."

"مجھے معلوم ہے۔" مراد نے کہا۔ "جو ردی باہر پھینکی گئی تھی' اس میں سے ایک کاغذ میرے ہاتھ آیا تھا۔ میں نے اسے پڑھا ہے۔ بس اب یہ کہانی ختم کرو۔ دروازہ کھولو'

میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی' خاموشی سے چلتی ہوئی مینٹل پیس کے پاس آئی اور وہاں سے شمعدان اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔

مراد کچھ مضطرب ہوکر دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ شائستہ کی ہول میں چابی ڈال کر اسے کھول رہی تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ ہاتھ میں شمعدان اٹھائے اندر چلی گئی۔

مراد بھی تیزی سے آگے بڑھا' پھر دروازے پر پہنچ کر ذرا ٹھٹک گیا۔

کمرہ لہو کی طرح سرخ تھا۔ در و دیوار سرخ۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے سرخ۔ بستر کی چادر اور تکیے کے غلاف سرخ اور فرش پر بچھا ہوا قالین بھی سرخ تھا۔ ثمینہ کی خواب گاہ سے سرخ لباس چرا کر اپنے جسم پر سجانے والے وسیم نے اپنے کمرے کو دنیا جہاں کی سرخیوں میں ڈبو دیا تھا۔

"لیکن وسیم کہاں ہے؟"

وہ کمرے میں آکر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

قریب ہی ایک تپائی پر رکھے ہوئے ریکارڈر پر رولنگ ٹیپ بولنے لگا۔

"آہ۔ کب یہ انتظار ختم ہوگا...... وہ کب آئے گا؟ آہ...... میری جان کے......"

مراد نے جھلا کر ریکارڈر کو ایک ٹھوکر ماری اور غصے سے چیخنے لگا۔ "وسیم کہاں ہے؟ جھوٹی...... مکار!"

وہ چیختا چنگھاڑتا ہوا شائستہ کے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر بولا۔ "بتاؤ' وسیم کہاں ہے؟ تم جھوٹی کہانیاں سنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔"

وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی۔ "کہانی جب تک مکمل نہ ہو وہ جھوٹی سمجھی جاتی ہے۔ پہلے میری بات سن لو۔"

اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوگئی۔ وہ مراد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ "وسیم کی کوئی بہن نہیں تھی۔ شائستہ درانی کا کوئی وجود نہیں ہے...... اب تو مجھے پہچان لو میرے قاتل......"

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ خاموش کھڑی زیرِلب مسکرا رہی تھی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی سرخیاں جھلمل کرتی ہوئی اس کے حسین چہرے پر منعکس ہو رہی تھیں.......... دنیا کی حسین ترین لڑکی..........!

مراد کی متجسس انگلیاں کانپتی ہوئی گردن سے چہرے پر آگئیں اس کے رخسار کو چھونے لگیں۔ اس کے ملائم ہونٹوں کی بھولی ہوئی گفتار کو یاد کرنے لگیں.......... انگلیاں آنکھیں بن گئی تھیں اور اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

باہر دروازے کو بہت سے لوگ پیٹ رہے تھے۔ مسز گرانٹ کہہ رہی تھی کہ ابھی شور سنائی دیا ہے۔ مِس کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ پھر وہ باڈی گارڈ کے ساتھ دوڑتی ہوئی ایک کوریڈور سے دوسرے کوریڈور میں آئی اور اس کمرے کے دروازے کو پیٹنے لگی، جسے سرخ کمرہ کہا کرتی تھی۔ باڈی گارڈ نے کہا۔

"یہاں بھی کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے.......... نہیں.......... آ رہی ہے.......... آواز آ رہی ہے.......... کوئی بول رہا ہے۔"

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر سننے لگے۔

بند دروازے کے پیچھے سے بہت ہی دھیمی دھیمی آواز ابھر رہی تھی۔

"وسیمہ.......... میری وسیمہ.......... میری وسیمہ! تم میری پہلی اور آخری محبت ہو..........!"

☆======☆======☆

منحوس تاریخ

خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بسنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کا فسانۂ عبرت۔ وہ اپنی بیوی کو بھول کر دوسری عورت سے عشق لڑانے چلا تھا۔
مقدر خراب نہ ہوں تو کوئی دن اور تاریخ منحوس نہیں ہوتی۔

وہ ایک پرانی شکستہ سی عمارت تھی۔ منزل بہ منزل پہنچانے والی لفٹ بھی عجیب پرانے ڈھنگ کی تھی۔ یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی تابوت کو اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور لوگ اس جہانِ فانی سے پرواز کرنے کے لئے اس میں داخل ہو رہے ہیں۔

گیری نسفورڈ اس تابوت نما لفٹ کو دیکھ کر ذرا سہم سا گیا۔ کئی سال پہلے وہ ایک بار اس لفٹ کے اندر گیا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی لفٹ تھوڑی دیر تک حرکت میں نہیں آئی۔ پھر ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر بلند ہونے لگی اور اس کے ہر جھٹکے کے ساتھ گیری کا سانس رکنے لگا۔ ایسے وقت اس پر گھبراہٹ طاری ہوجاتی تھی اگر اس کا بس چلتا تو وہ دروازہ توڑ کر باہر نکل جاتا۔ بدقسمتی سے وہ کلسٹروفوبیا کا مریض تھا۔ ایسے مریض، لوگوں کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ بند کمرے میں گھٹن محسوس کرتے ہیں اور لفٹ تو ایسی چیز ہے جو چاروں طرف سے قبر کی طرح بند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اس تابوت میں جانے کی جرأت نہ کرسکا اور زینے طے کرتے ہوئے ساتویں منزل کی طرف جانے لگا۔

ساتویں منزل پر معروف دندان ساز ڈاکٹر ٹیلنگ کا چیمبر تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دانتوں کے درد سے نجات دلانے کے لئے زود اثر دوائیں دی تھیں اور کہا تھا کہ ان دواؤں کے باوجو[illegible]ئے تو وہ کسی وقت بھی چیمبر میں آکر دوسری دوائیں لے سکتا ہے۔ گیری کے لئے یہ دوپہر کا وقت موزوں تھا کیونکہ دوپہر کو دوسرے مریض نہیں آتے تھے۔ اس تنہائی میں وہ ڈاکٹر کی خوبصورت اسسٹنٹ مارگو سے دو باتیں کرسکتا تھا اور ایمپائر کے رومان[illegible]حول میں اسے کچھ پینے پلانے کے لئے مدعو کر سکتا تھا۔ یعنی درد صرف دانتوں میں نہیں تھا، دل میں بھی تھا۔

ساتویں منزل پر پہنچ کر وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ چیمبر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے رومال نکال کر چہرے اور

گردن سے پسینے کو پونچھا، بالوں میں کنگھی کی تاکہ مارگو کی نظروں میں اسمارٹ نظر آئے۔

پھر وہ دروازہ کھول کر ویٹنگ روم میں داخل ہوگیا۔

حسب توقع ویٹنگ روم میں ایک بھی مریض نہ تھا۔ صوفے خالی تھے، درمیانی میز پر اخبار اور رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی وقت مارگو، ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر آئی اور اسے دیکھتے ہی بولی۔

"ہیلو مسٹر گیری! ڈاکٹر تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔"

"صرف ڈاکٹر؟ کیا تمہیں میرا انتظار نہیں تھا؟"

وہ جواباً مسکرانے لگی۔ گیری نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ "آج شام کو ایمپائر میں ملو گی؟"

"اوں ہونہہ۔ آج شام تک تم سرجری روم میں رہو گے۔ میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر آج خصوصی توجہ سے تمہارا علاج کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے دوسرے مریضوں سے فون پر معذرت کی ہے کہ آج وہ مصروف ہیں، کسی مریض کو اٹینڈ نہیں کرسکیں گے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ ڈاکٹر نے کبھی ایک مریض کی خاطر دوسرے مریضوں کو نظرانداز کیا ہو۔"

گیری نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں کچھ غیر معمولی خوبیاں ہیں۔ اسی لئے صرف ڈاکٹر ہی نہیں، تم بھی خصوصی توجہ دیتی ہو۔ بولو، آج شام ایمپائر میں آؤ گی نا؟"

"نہیں۔ آج میں بہت مصروف ہوں۔"

"صاف کیوں نہیں کہتیں کہ ڈاکٹر ٹیلنگ سے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ تمہیں دیکھ لے گا تو........"

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ وہ ڈاکٹر بھی تو تمہاری بیوی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتا ہے۔ کیا تمہاری بیوی تم سے ڈرتی ہے؟"

گیری کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ پہلی بار اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ڈاکٹر سے اس کی بیوی برنائس کی آشنائی ہے۔ اس نے مارگو سے مزید کچھ پوچھنا چاہا۔ اسی وقت ڈاکٹر ٹیلنگ کے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

"مارگو! تم نے ایکسرے رپورٹ کہاں رکھی ہے؟ ڈارلنگ تمہاری رکھی ہوئی چیزوں

کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔"

"جسٹ کمنگ ڈاکٹر!" مارگو نے جواب دیا۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مارگو کے قرب میں کسی دوا کی مہک تھی یا پھر اپنی بیوی برنائس کی بے وفائی کے خیال نے اس قربت میں بدمزگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گہری سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ برنائس ایسی نہیں ہے جیسا مارگو اسے پیش کر رہی ہے۔ نفسیات کی رو سے مارگو اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے برنائس پر تہمت تراش رہی تھی۔ یہ عورتیں حسد سے مری جاتی ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر عورتوں کی فطرت پر مسکرانے لگا۔ ڈاکٹر ٹیلنگ اپنے کمرے میں مارگو کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو۔ آج جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی ہے کہ مصروفیات کی وجہ سے انہیں اٹینڈ نہیں کر سکوں گا۔ یہ ایک مسٹر کیز رہ گئے ہیں۔ ان سے فون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اگر یہ آجائیں تو ان سے معذرت کر کے انہیں ویٹنگ روم سے ہی واپس کر دینا۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ میں مسٹر گیری کے ساتھ سرجری روم میں رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور گیری کی طرف جانے لگا۔ مارگو میز پر رکھے ہوئے کتابی کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔

کیلنڈر کے طاق صفحے پر سات تاریخ تھی۔ سات نمبر خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ سات تاریخ گزر گئی تھی سات تاریخ کو وہ گیری کے ساتھ ایمپائر میں گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر جام شیری نوش کیا تھا۔ شاید یہ سات نمبر کا کرشمہ تھا کہ وہ دونوں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہے تھے۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔ اس تاریخ میں جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ان کے ناموں پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا تھا۔ آج گیری نے پھر اسے ایمپائر میں مدعو کیا تھا لیکن مصروفیات کے باعث نہ تو گیری شام سے پہلے سرجری روم سے فارغ ہوتا اور نہ ہی اسے چھٹی ملتی۔ مارگو نے مایوسی سے سوچا۔ "آج کی آٹھ تاریخ بڑی منحوس

ہے۔"

گیری نے سرجری روم میں آکر ڈاکٹر ٹیلنگ سے کہا۔

"مجھے اس کمرے میں آتے ہی وحشت سی ہوتی ہے۔ کیا آپ نے میری میڈیکل ہسٹری شیٹ نہیں پڑھی ہے؟"

ڈاکٹر ٹیلنگ نے کہا۔ "میں نے ان تمام ڈاکٹروں کی رپورٹ بھی پڑھی ہے۔ جن کے زیر علاج تم رہ چکے ہو۔ دیکھو' اس لئے میں نے کھڑکی کھلی رکھی ہے تاکہ تمہیں گھٹن کا احساس نہ ہو۔"

گیری نے اُدھر دیکھا۔ کشادہ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے سامنے ایک کرسی تھی۔ کرسی کے ایک سرے پر ایک ہینڈل تھا۔ جسے گھمانے سے وہ کرسی ایزی چیئر کی طرح کھل جاتی تھی۔ اسی پر مریض کو بٹھا کر اس کے دانتوں کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ گیری نے کہا۔

"یہ کرسی تین طرف سے جکڑ دیتی ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرا گلا دبوچ رہا ہو۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ کرسی تمہارے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود تم تسلیم کرو گے کہ یہاں آکر تم جب بھی بیٹھتے ہو۔ میں تمہیں منفی پہلو سے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا ہوں۔ تمہاری ہسٹری شیٹ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار تمہیں کسی مکان میں گھٹن کا احساس ہوا تھا تم وحشت زدہ ہو کر جنونی انداز میں دروازہ کھول کر نکل بھاگے تھے اور باہر سڑک پر پہنچتے ہی ایک کار سے ٹکرا گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس حادثے میں بچ گئے۔ یہاں پر کسی قسم کے حادثے کا اندیشہ نہیں ہے اگر اس دروازے سے نکل کر بھاگو گے تو باہر ٹکرانے کے لئے تمہیں کوئی کار نہیں ملے گی۔ کیونکہ تم ساتویں منزل کی بلندی پر ہو۔ لہٰذا حوصلہ رکھو اور یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔"

گیری طوعاً و کرہاً کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ہینڈل گھما کر کرسی میں کشادگی پیدا کر دی اور اس سے کہا۔

"اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑکی پر رکھ دو اور آرام سے پھیل کر بیٹھو۔ قطعی

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ کھڑکی کے نچلے فریم کی اونچائی کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ لہٰذا اسے کھڑکی پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھنے میں دقت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ دل و دماغ میں جو اضطراب چھپا ہوا تھا' وہ پریشان کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ لو' یہ دو کیپسول پانی کے ساتھ نگل جاؤ۔ میرا دعویٰ ہے کہ تمہیں فوراً انجانی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ زود اثر دوا ہے۔"

وہ باتیں کرنے کے دوران واش بیسن کے پاس گیا اور وہاں سے پلاسٹک کے ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ گیری نے زور دے کر پوچھا۔ "یہ کیسا کیپسول ہے؟"

"یہ ماورائی کیپسول ہے۔ یہ تمہیں تمہاری سوچ اور پریشانیوں سے پرے لے جائے گا۔ تم منفی انداز میں سوچنے کے بجائے ہمیشہ مثبت انداز میں سوچو گے۔"

وہ دونوں کیپسولز نگل کر پانی پینے لگا۔

اتنے میں مارگو وہاں آکر ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی۔ جس پر سرجری کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اس حسینہ کی موجودگی ہی گیری کے لئے سکون کا باعث تھی۔ ڈاکٹر نے اسے منہ کھولنے کے لئے کہا۔ گیری کے منہ کھولتے ہی اس نے دانتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے آلے سے رکاوٹ کھڑی کر دی۔ تاکہ اس کا منہ کھلا رہے۔ پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

گیری خاموشی سے مارگو کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ کبھی اس کے بلاؤز کے بٹن گن رہا تھا اور کبھی ان ہاتھوں کی نزاکت کو محسوس کر رہا تھا۔ جنہیں تھام کر وہ آج شام کو ایمپائر کے کسی گوشے میں بیٹھنے والا تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے اور سوچنے کے باوجود اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب تب میں اس پر کلسٹروفوبیا کا مرض حاوی ہونے والا ہے۔ کسی بھی لمحے وہ وحشت زدہ ہو کر کرسی سے اٹھ جائے گا اور وہاں سے جنونی انداز میں نکل بھاگے گا۔

مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ توقع کے خلاف پُرسکون تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں' اس میں ایسا اطمینان اور ایسی بے پروائی تھی کہ اپنے دانتوں پر آلات اور ڈاکٹر کے ہاتھوں کا لمس بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ مارگو کے ملائم

ہاتھوں کو اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر محسوس کر رہا تھا۔

شام کو ایمپائر ہوٹل کے بار میں مومی شمعیں روشن تھیں۔ گیری نچلے برآمدے میں بیٹھنے کا عادی تھا لیکن آج وہ بار کے اندر آگیا تھا۔ دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اسے گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے بار کے گوشے میں ایک میز منتخب کی اور ویٹر کے آنے پر اپنے لئے ایک ڈبل اسکاچ اور مارگو کے لئے شیری کا آرڈر دیا۔ مارگو بھی عین وقت پر پہنچ گئی۔ اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے احسان جتایا۔

"میں تمہاری خاطر تمام مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ کر آئی ہوں۔"

"میں خوش نصیب ہوں مارگو! کہ تم میرے لئے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر آئی ہو۔ میں آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر اور کسی کو چھوڑ سکتی ہو یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھی؟"

ویٹر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو دونوں نے اپنا اپنا جام اٹھا لیا۔ گیری نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر یہ شہر چھوڑ دو۔ آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ تم ہو' تمہاری بیوی ہے اور پھر ایک بیٹی ہے۔"

"میری بیٹی کولن جوان ہوگئی ہے۔ اسٹیو نامی ایک نوجوان سے محبت کر رہی ہے۔ اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کیا ہے۔ اب اس کی ذمے داریاں مجھ پر نہیں ہیں؟"

"اور تمہاری بیوی؟" مارگو نے پوچھا۔

"برنائس سے میری نہیں بنتی۔ وہ مشرق ہے۔ میں مغرب ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ تم اس کے متعلق نہیں' اپنے متعلق سوچو۔ بخدا مارگو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ ہر عاشق یہی بات کہتا ہے مگر میں صدق دل سے کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی بے کیف ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارگو کا ہاتھ میز پر آکر اس سے مل گیا۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں لیکن ایک دشواری ہے۔"

"کیسی دشواری؟"

"میری ملازمت۔"

"اونہہ.........." اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی کوئی دشواری ہے۔ ملازمت چھوڑ دو۔ میں بھی اپنی ملازمت چھوڑ کر جاؤں گا۔ میرے پاس اتنی نقد رقم ہے کہ ہم تین سال تک بیٹھ کر کھاسکتے ہیں۔ ہم یہاں سے انگلینڈ جائیں گے اور لندن میں ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی گزاریں گے۔ وہاں مجھے کسی بھی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت مل جائے گی۔"

"یہ میں تسلیم کرتی ہوں لیکن.......... وہ ڈاکٹر ٹیلنگ مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

"کیوں نہیں چھوڑے گا۔ کیا تم اس کی ملکیت ہو؟"

"نہیں۔ مگر وہ یہی سمجھتا ہے۔ تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے ہر حال میں حاصل کرلیتا ہے۔ دو سال پہلے میں ایک بوڑھے ڈاکٹر ولی براڈ کے پاس کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر ٹیلنگ ایک روز کسی کام سے وہاں آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فیصلہ کرلیا کہ میں اس کے ہاں ملازمت کروں گی۔ اس نے ایک بھاری تنخواہ کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر ولی براڈ کو پتہ چلا تو اس نے بھی میری تنخواہ بڑھادی۔ پھر بھی ڈاکٹر ٹیلنگ نے مجھے حاصل کرلیا۔ جانتے ہو کیسے؟"

"کیسے..........؟"

"اس نے دو غنڈوں کو ڈاکٹر ولی براڈ کے پاس بھیجا تھا۔ ان غنڈوں نے اسے کہا کہ وہ میرے گھر سے آئے ہیں یعنی وہ دونوں میرے بزرگ ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر ٹیلنگ کے ہاں ملازمت کروں۔ اس وقت میں انکار کرسکتی تھی لیکن یہ سوچ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹیلنگ کی نظروں میں میری کتنی اہمیت ہے۔ وہ کتنی ہیراپھیری سے مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انسان وہیں جاتا ہے جہاں اس کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کے پاس چلی آئی۔ اب تم اس سے بھی زیادہ میری قدر کر رہے ہو۔ میری خاطر یہ ملک چھوڑ کر انگلینڈ جانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار نہیں کرتی لیکن میں ڈرتی ہوں کہ تم اچانک مجھے اس سے چھین کر لے جاؤ گے تو وہ تمہارا دشمن بن جائے

گا۔"

"اونہہ!" گیری نے حقارت سے کہا۔ "میں دشمنوں سے نمٹنا جانتا ہوں لیکن اصولاً میں ایک بار اس سے بات کروں گا۔ اگر وہ راضی ہوگیا تو پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔"

"کیا تم اس سے ابھی ملوگے؟" مارگو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں گھر جاکر فون پر اس سے بات کروں گا۔ جانِ من! رات کے سوا گیارہ بجے لندن کے لئے ایک فلائٹ ہے ہم اسی سے جائیں گے۔ تم ابھی جاکر سفر کی تیاری کرو۔ میں ساڑھے آٹھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔"

وہ دونوں اٹھ کر کاؤنٹر پر آئے۔ گیری نے ٹریول ایجنسی کو وہاں سے فون کیا۔ جب جہاز کی دو سیٹیں ان کے لئے مخصوص ہوگئیں تو اس نے مارگو کو رخصت کردیا اور اپنی تیاریوں کے لئے گھر آگیا۔ برنائس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے' آج کچھ پُھرتیلے نظر آرہے ہو؟"

"ہاں۔ زندگی ایک ایسے خوب صورت موڑ پر لے آئی ہے کہ آپ ہی آپ جوان ہوگیا ہوں۔" پھر اس نے پلنگ کے نیچے سے دو سوٹ کیس نکالتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں ڈاکٹر ٹیلنگ کا فون نمبر معلوم ہے؟"

"ہاں!" برنائس نے کہا۔

گیری نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "کک.......... کیا بات ہے؟"

اس نے روکھے پن سے کہا۔ "کچھ نہیں۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم نمبر ملاؤ۔"

وہ الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگا اور انہیں سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔ برنائس اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"تم ہمیشہ ایک سوٹ کیس لے جاتے ہو۔ آج دو کیوں لے جارہے ہو؟"

"میں کمپنی کی طرف سے نہیں جارہا ہوں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور یہ ملک بھی چھوڑ کر جارہا ہوں اور تمہارے ساتھ جو ٹوٹا پھوٹا سا برائے نام رشتہ رہ گیا تھا

اسے حتمی طور پر توڑ رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک گونگی بنی بیٹھی رہی۔ کتنے ہی سوالات اس کے دماغ میں تھے مگر اس نے صرف ایک سوال کیا۔

"کیا تم اکیلے جا رہے ہو؟"

"مارگو میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

برنائس نے ایک زور دار قہقہہ لگا کر کہا۔

"وہ۔ ڈاکٹر ٹیلنگ کی مارگو۔ وہ موٹی' بے ڈھنگی ملازمہ؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ جیسی بھی ہے۔ تمہاری طرح پتھر کا بے حس مجسمہ نہیں ہے۔"

"پہلے تو تم مجھے بے حس نہیں کہتے تھے؟"

"اب ہو گئی ہو۔"

"نہیں۔ تم نے مجھے بنا دیا ہے۔"

گیری سوٹ کیس کے پاس سے پلٹ کر اسے گھورنے لگا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ جس عورت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے اس سے بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "مجھے ڈاکٹر ٹیلنگ کا فون نمبر چاہئے۔"

وہ خاموشی سے میز کے پاس گئی۔ اس میں سے اپنی ڈائری نکال کر اس نے ایک کاغذ پر فون نمبر نوٹ کیا اور اسے لا کر دیتے ہوئے طنز کیا۔

"کیا تم نے مارگو کو نہیں بتایا کہ عورت تمہارے پاس آ کر بے حس بن جاتی ہے؟"

اس نے فخر سے کہا۔ "ابھی وہ میرے پاس سے گئی تھی تو بے حس نہیں تھی۔ بہت مطمئن تھی۔ بہت خوش تھی۔"

"مجھے اس بے چاری سے ہمدردی ہے اور تم سے بھی۔ بڑھاپے میں بیوی کو تو چھوڑ رہے ہو۔ اپنی جوان بیٹی کو بھی چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"کولن نے اپنے لئے راستہ بنا لیا ہے۔ میں لندن جا کر اسے خط لکھوں گا اور اس کی شادی ہونے تک اس کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔"

وہ دونوں سوٹ کیسوں میں تمام ضروری سامان رکھنے کے بعد فون کے پاس آیا اور

ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو!" ڈاکٹر ٹیلنگ کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"ہیلو ڈاکٹر! میں گیری نسفورڈ بول رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ تمہارے دانت کیسے ہیں؟"

"دانتوں کی کوئی شکایت نہیں۔ میں نے یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ میں ابھی لندن جا رہا ہوں۔"

"اچھا! یہ اچانک کیسے پروگرام بن گیا؟"

"یہ آپ کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ برنائس یہاں رہے گی۔ وہ یقیناً تم سے ملاقات کرے گی اور تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔ فی الحال میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھ مارگو کو لے جا رہا ہوں۔"

"میری مارگو کو؟" اس کی حیرت زدہ سی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ وہ میرے ساتھ راضی خوشی جا رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے جانے پر تم پریشان ہو جاؤ گے لیکن مجھے امید ہے کہ تم اس کی جگہ کوئی دوسری اسسٹنٹ رکھ لو گے۔"

"نہیں!" اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ "مارگو کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ تم اس طرح اسے مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں مجبوراً ایسا کر رہا ہوں۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔"

"میں دل کے معاملات نہیں جانتا۔ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں۔ دانت توڑنا جانتا ہوں۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ مارگو کو نہ لے جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"فضول دھمکی دے رہے ہو۔ ہم آج رات کی فلائٹ سے جا رہے ہیں اور کل صبح لندن پہنچ جائیں گے۔ میں اخلاقاً تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔ میری خوش اخلاقی کی قدر کرو اور صبر کرنا سیکھ لو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ریسیور رکھ دیا۔ جوشیلے انداز میں باتیں کرنے کی وجہ سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ برنائس طنزیہ انداز میں اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ گیری نے کہا۔

"ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔"

"پاگل تم ہو گئے ہو۔ گیری اب بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل دو۔ تم ڈاکٹر کو نہیں جانتے۔ وہ.........."

گیری نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ برنائس کا الوداعی بوسہ لے گا لیکن اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ دونوں سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"گڈ بائی۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔"

"ضرور ملیں گے۔ میں اس یقین کے ساتھ تمہارے جانے کا تماشہ دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ کر آؤ گے۔ گڈ بائی۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے چلتا ہوا باہر آگیا۔ کار میں سامان رکھ کر بیٹھنے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ برنائس سے بیزار ہو کر بہت جلدی گھر سے نکل آیا ہے۔ مارگو ایک نئی زندگی' ایک نئے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور ایک بار میں وقت گزارنے کے لئے چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ بار سے نکل کر مارگو کے ہاں پہنچا۔ نچلی منزل کے ایک حصے میں وہ کرایہ دار کے طور پر رہتی تھی۔ گیری اس کے کمرے میں آیا تو وہ دروازے کی جانب پشت کئے صوفے پر بیٹھی تھی' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا اور اس کا بدن ہولے ہولے یوں لرز رہا تھا جیسے وہ سسک رہی ہو۔ رو رہی ہو۔ گیری نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے مارگو؟"

اس کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی اور اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"وہ آیا تھا!"

وہ سہمی ہوئی تھی' اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ گیری نے اس کے گاؤن کے پھٹے ہوئے گریبان کو دیکھ کر پوچھا۔

"کون؟"

"ڈاکٹر۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تم سے فون پر بات ہو چکی ہے' وہ.......... وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔"

"کیا اسی نے تمہارے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے؟"

"ہاں۔ مگر اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" وہ غصے سے کانپنے لگا۔

"نہیں گیری! جانے دو۔ اب تو وہ جا چکا ہے۔"

"وہ کہاں بچ کر جائے گا؟ اس کا ہاتھ تمہارے گریبان تک پہنچ گیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ غصہ سے پلٹ کر جانے لگا۔ مارگو نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ "بات نہ بڑھاؤ گیری۔ یہ دانش مندی نہیں ہے۔ اگر تم اس کے پیچھے جاؤ گے تو پھر جہاز کا وقت نکل جائے گا۔"

جب وہ ایئر پورٹ پہنچے تو جہاز کسی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔ ایئر لائن کاؤنٹر پر اپنا سامان چیک کرانے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے اور اپنی پسند کے مطابق اسکاچ اور شیری پینے لگے۔ گیری نے پوچھا۔ "تم ڈاکٹر سے خائف تو نہیں ہو؟"

مارگو دور کہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ شیری کا جام اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ.......... وہ یہاں بھی آ گیا ہے۔"

گیری چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مارگو نے ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ.......... اُدھر کھڑا ہوا تھا۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی تیزی سے گھوم کر چلا گیا۔"

"ہم!" وہ غرا کر بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ تم یہاں بیٹھو' میں اس سے نمٹ کر آتا ہوں۔"

"نہیں۔" مارگو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر ہم اس کی پہنچ سے دور چلے جائیں گے۔"

اس نے معقول بات کہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس ملک سے دور جانے والے تھے۔ گیری نے یہی سوچا کہ صبر و ضبط سے کام لینا چاہئے۔ دشمن اپنی ناکامی پر جھنجلا رہا ہو تو اسے اہمیت نہ دے کر اور زیادہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنا چاہئے۔

اس نے مسکرا کر اپنا جام اٹھالیا اور دوسرا ہاتھ مارگو کی کمر پر رکھ کر اسے اپنی طرف یوں کھینچ لیا۔ جیسے اسے اپنے قریب لا کر دشمن سے اور زیادہ دور لے جارہا ہو۔

☆------☆------☆

سردی شباب پر تھی لیکن مارگو کی قربت میں ایسی حرارت تھی کہ گیری کو پسینہ آجاتا تھا۔ لندن میں وہ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ وہ اس دوران مارگو سے صرف دو گھنٹے کے لئے دور رہا تھا۔ اوکلیز ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں جاکر اس نے ملازمت کی درخواست دی تھی' اس کے بعد پھر مارگو کی بانہوں میں آکر قید ہوگیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دونوں لحاف میں دبکے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی بانہوں میں پیار بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نچلی منزل میں آٹو ریپئرنگ کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ جہاں ہر روز سات گھنٹے تک انجن شور مچاتے رہتے تھے اور لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

"آج مجھے ملازمت مل جائے گی۔ پھر میں کسی پُرسکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کرلوں گا۔" گیری نے کہا۔

مارگو نے پوچھا۔ "کیا ملازمت مجھ سے زیادہ اہم ہے؟ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمہارے پاس تو اتنی رقم ہے کہ ہم تین سال تک بے فکری سے زندگی گزار سکتے ہیں؟"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم بچت نہ کریں۔ صرف خرچ ہی کرتے رہیں۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ ہونا چاہئے۔ اس لئے میں ملازمت کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو تم ابھی جاؤ گے؟"

"ہاں۔ جانا بہت ضروری ہے۔ صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرے گا۔"

"پھر کہاں ملاقات ہوگی؟"

"نیشنل پورٹریٹ گیلری میں۔ روبرٹ لوئس اسٹیونسن کی تصویر کے سامنے ٹھیک ڈھائی بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی ٹھیک ڈھائی بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

وہ لحاف سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے دوران وہ سوچتا رہا کہ لندن میں اخراجات زیادہ ہیں۔ اسی مناسبت سے اسے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ پھر ایک خیال آیا کہ یہ نئی جگہ ہے۔ تنخواہ کتنی ہی ہو' اسے فی الحال آمدنی کا ایک ذریعہ بنا لینا چاہئے' مارگو بہت فضول خرچ ہے۔ محبوبہ جوان ہو اور دل و جان سے چاہتی ہو تو فضول خرچی سے اس کا ہاتھ روکا نہیں جاتا۔ اس کی رنگین اداؤں کے ساتھ اس سنگین ادا کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اوکلینز ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں پہنچا تو کمپنی کے ڈائریکٹر نے بڑی بے رخی سے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ گیری کا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پچھلی بار تو ڈائریکٹر نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"مسٹر گیری!" اس نے کہا۔ "آپ پہلے مونٹریال میں ملازمت کرتے تھے لیکن آپ اپنی کمپنی کو اطلاع دیئے بغیر یہاں آگئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"گیری نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ اطلاع آپ کو کیسے ملی؟"

"ٹمپلیٹن نامی ایک شخص نے اطلاع دی ہے۔"

میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔" گیری نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کسی نے فون پر آپ سے شرارت کی ہو۔ کچھ لوگ وقت گزاری کے لئے اس طرح فون پر جھوٹی سچی باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

ڈائریکٹر نے کہا۔ "اس نے فون پر اطلاع نہیں دی۔ وہ یہاں میرے سامنے آیا تھا۔ جہاں ابھی آپ بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی ملازمت' اپنا گھر اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ بیوی اور گھر کو چھوڑنا آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن ایک کمپنی کے اعتماد کو دھوکا دینے کے بعد آپ یہ کیسے سوچتے ہیں کہ دوسری کمپنی والے آپ پر بھروسہ کریں گے؟"

گیری ندامت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس شخص پر بھی غصہ آرہا تھا جس نے اس کے خلاف صحیح رپورٹ دی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں اعتماد کھو کر ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برائے مہربانی مجھے ٹمپلیٹن کا حلیہ

بتائیے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ ہے کون؟"

ڈائریکٹر اس کا حلیہ بتانے لگا۔

اس نے اتنا مکمل خاکہ پیش کیا کہ ڈاکٹر ٹیلنگ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ گیری کے دانتوں میں اچانک درد شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ دانت توڑنا جانتا ہے' اس نے ایسے دانت کو نکال کر پھینکا تھا کہ اب گیری کسی بھی کمپنی میں اپنا اعتماد بحال نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جھلا کر وہاں سے چلا آیا۔ پریڈ اسٹریٹ سے گزرتے وقت وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوگیا اور وہاں بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ یہ خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر تین ہزار میل سے اس کا پیچھا کرتا آیا ہے اور یہاں آکر اس کے راستے میں کانٹے بچھا رہا ہے۔

"کیا یہ بات ابھی مارگو کو بتانا مناسب ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ نہیں۔ اسے نہیں بتانا چاہئے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوجائے گی۔ میں اس کم بخت ٹیلنگ کو تلاش کروں گا اور اسے نرمی سے یا گرمی سے سمجھاؤں گا کہ وہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے' لیکن نہیں دشمن اتنی آسانی سے نہیں مانتا۔ وہ بہت ضدی ہے اور چالاک بھی ہے۔ آہ! میرے اس دانت میں کتنی تکلیف ہے۔ جس میں اس نے دوا لگائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے دوا کے بجائے زہر لگا دیا ہو' ایسا زہر جو آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے.........."

وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھا پیتا رہا اور سوچتا رہا پھر شراب کا بل ادا کر کے باہر آگیا۔ کھلی فضا میں آکر اس نے سوچا کہ وہ فضول اندیشہ کر رہا ہے۔ اس کے دانت میں کوئی زہریلی دوا نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ یہاں کے کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرائے گا۔ فی الحال اسے مارگو سے جا کر ملنا ہے۔

جب وہ نیشنل پورٹریٹ گیلری کی عمارت میں پہنچا تو وہ پندرہ منٹ لیٹ ہوگیا تھا۔ صدر دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ اندر جانے والوں کی تلاشی لے رہے تھے تاکہ کوئی بم یا کوئی تخریبی سامان عمارت کے اندر نہ لے جا سکے۔ وہ تلاشی دینے کے بعد اس کمرے میں آگیا جہاں رابرٹ لوئس اسٹیونسن کی تصویر آویزاں تھی۔ اس کمرے میں چند ہی لوگ تھے اور وہ بھی واپس جا رہے تھے۔ مارگو شاید انتظار سے اکتا کر دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دوسرے کمرے کی جانب دیکھا تو وہاں دروازے پر ڈاکٹر ٹیلنگ کھڑا ہوا

تھا۔

وہ مسکرا کر آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”ایک بار تم نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ تم مجھ سے مارگو کو چھین کر لے جا رہے ہو۔ میں بھی اخلاقاً اطلاع دینے آیا ہوں کہ اب مارگو میرے ساتھ جا رہی ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ گیری نے کہا۔ ”مارگو تمہارے ساتھ کبھی نہیں جائے گی۔“

ڈاکٹر نے حقارت سے کہا۔ ”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔ وہ اس وقت سفر کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ہم دونوں ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“

”تم اسے نہیں روک سکتے گیری! اگر روکنے کی کوشش کرو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“

گیری نے جھلا کر چھلانگ لگائی۔ بھاری بھرکم ٹیلنگ نے اسے دونوں ہاتھوں سے روک لیا اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ گیری کا سر دیوار سے ٹکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ٹیلنگ اس کا گلا دبوچ رہا تھا اور وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”میں...... میں تم سے کمزور...... نہیں ہوں۔ تم نے میرے دانتوں میں کوئی زہریلی دوا لگائی ہے۔ تمہاری اس دوا نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ میں ابھی جا کر تھانے میں رپورٹ کروں گا کہ تم نے مجھے زہر دیا ہے۔“

”جاؤ، ـــمت کرو۔ گیری، تم زندہ ہی کب ہو کہ میں تمہیں زہر دوں گا۔ تم تو ایک چلتی پھرتی لاش ہو۔ چلو اب ایک لاش کی طرح زمین پر گر پڑو......“

یہ کہہ کر اس نے گیری کو چھوڑ دیا۔ گیری نے دیوار کا سہارا لے کر کھڑے رہنے کی کوشش کی، لیکن اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھ کھولی تو کچھ لوگ نظر آئے جو اسے بے ہوش سمجھ کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر

دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر ٹیلنگ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا عمارت کے باہر آ گیا اور ایک ٹیکسی والے کو اپنا پتہ بتا کر پچھلی سیٹ پر نقاہت سے گر پڑا۔

پندرہ منٹ کے بعد آٹو ریپئرنگ ورکشاپ کے سامنے ٹیکسی آ کر رک گئی۔ گیری نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور زینے طے کرتا ہوا پہلی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کی رہائش تھی۔ مارگو ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ گیری نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”ہم۔ تو ٹیلنگ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم اس کے ساتھ جا رہی ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تمہارے جانے کے بعد وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے جبراً مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے ملنے کہاں جا رہی ہوں۔ بہت مجبور ہو کر مجھے بتانا پڑا کہ میں ڈھائی بجے تم سے نیشنل پورٹریٹ گیلری میں ملوں گی۔“

گیری نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ تمہیں جبراً یہاں سے لے جا رہا ہے؟ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا۔“

”گیری! یقین کی بات نہ کرو۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہوں۔“

”تمہارے جانے سے میری بھلائی نہیں ہو گی، میری توہین ہو گی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”تم سمجھنے کی کوشش کرو گیری! وہ تمہیں ہر قدم پر نقصان پہنچائے گا۔“

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں گلیوں میں سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں۔ مزید خطرہ محسوس ہوا تو ہم 999 نمبر ڈائل کر کے فوری طور پر پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

اسی وقت گلی میں کسی کار کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔

”وہ آ گیا!“ مارگو نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں شاید ٹیکسی ہے۔ ڈرائیور اسے مناسب جگہ پارک کر رہا ہے۔ میں نے اسے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں موجود ہو یا ٹیلنگ

تمہیں جبراً اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔ اب وہ تمہیں مجبور نہیں کرسکے گا۔ میں ابھی اس بدمعاش کا انتظام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

کچن کے اسٹور روم میں ایک لوہے کی سلاخ پڑی ہوئی تھی وہ آہنی سلاخ کو اٹھا کر اس کے وزن اور اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگا۔ اسی وقت دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر ڈاکٹر ٹیلنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ مارگو سے کہہ رہا تھا۔

"مارگو' میری جان! میں نے فضائی سفر کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میں تمہیں پیرس لے جاؤں گا۔ جسے جنت ارضی بھی کہتے ہیں۔ ہم یہاں سے کار میں ڈوور جائیں گے۔ وہاں سے لانچ میں بیٹھ کر کیلائس پہنچیں گے۔ کیلائس سے ٹرین کے ذریعے آج ہی رات کو پیرس پہنچ جائیں گے۔"

گیری تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آگیا اور اپنے ہاتھوں میں آہنی سلاخ کو تولتے ہوئے بولا۔

"تم پیرس میں نہیں' جہنم میں جاؤ گے۔"

مارگو دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور آہنی سلاخ کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"یہ کیا کر رہے ہو گیری۔ اسے پھینک دو۔"

"تم ہٹ جاؤ سامنے سے.........." اس نے مارگو کو ایک طرف دھکا دیا اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ٹیلنگ پر حملہ کر دیا۔ ٹیلنگ غافل نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی جھک گیا۔ آہنی سلاخ جو اس کے سر پر لگنے والی تھی' دیوار پر جا لگی۔ اس نے گیری کے منہ پر ایک زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ٹیلنگ اس کے منہ پر' سینہ پر اور پیٹ پر متواتر گھونسے برسانے لگا۔ اس کے ہاتھ سے آہنی سلاخ پہلے ہی گر پڑی تھی۔ وہ بھی پے در پے حملوں سے بوکھلا کر فرش پر گر پڑا۔ مارگو دوڑتی ہوئی ٹیلنگ کے سامنے آگئی اور اس کے بازو کو تھام کر' بوکھلا کر التجا کرنے لگی۔

"ڈاکٹر! اسے نہ مارو۔ اسے چھوڑ دو۔ پلیز ڈاکٹر! میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔

تم اسے نہ مارو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ اسے چھوڑ دو.........."

ڈاکٹر ٹیلنگ نے گیری کو حقارت سے دیکھا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے مارگو کی کلائی تھام لی۔ دوسرے ہاتھ سے سوٹ کیس کو اٹھایا اور مارگو کو کھینچتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

گیری فرش پر پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ جس حسینہ کے لئے وہ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ دشمن اس کو چھین کر لے جا رہا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر جانے لگا اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ٹیلنگ کی مکے بازی نے اس کے جبڑے ہلا دیئے تھے اور پسلیاں بھی دکھ رہی تھیں۔

وہ زینے سے اتر کر ٹیکسی کے پاس آیا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابھی جو کار یہاں سے گئی ہے۔ اس کا پیچھا کرو۔ میں تمہیں میٹر سے زیادہ پیسے دوں گا۔"

ٹیکسی چل پڑی۔ گلی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی ڈرائیور نے کہا۔ "وہ نیلے رنگ کی سیڈان میں جا رہے ہیں' میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ مگر وہ کافی فاصلے پر ہے۔"

گیری کے دانتوں میں درد ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے جبڑوں کو تھام کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ بہت دور نیلے رنگ کی کار تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار بھی تیز تھی مگر ان کے درمیان بہت سی دوڑتی ہوئی کاریں حائل ہو گئی تھیں' پھر ٹیلنگ کی کار نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ گیری نے ڈرائیور سے کہا۔

"وہ نیلی کار ڈوور جا کر رکے گی۔ تم اس راستے پر چلو۔"

یہ کہہ کر وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے دائیں جبڑے کو سہلانے لگا۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ مستحکم ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس حصے کے کسی دانت میں زہریلی دوا لگائی ہے۔ دانش مندی تو یہ ہوتی کہ وہ اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے فوراً ہی کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا لیکن عشق نے مت مار دی تھی۔ وہ اپنی جان سے زیادہ مارگو کو حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد نیلی کار نظر آگئی۔ وہ ایک آئس کریم ٹرک کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مارگو اور ٹیلنگ کار سے نکل کر آئس کریم کھا رہے تھے۔ ٹیکسی ان کے قریب جا کر رک گئی۔ مارگو اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ٹیلنگ نے ناگواری سے پوچھا۔

"تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟"

گیری نے خلافِ توقع مسکرا کر کہا۔ "پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے آیا ہوں۔ کیا تم تنہائی میں مجھ سے باتیں کرنا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں گیری! میں نے شروع ہی سے یہ کوشش کی ہے کہ ہمارے تعلقات میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔ مگر اب تمہیں عقل آئی ہے۔ آؤ ہم اُدھر چلتے ہیں۔"

وہ دونوں سڑک سے دور آکر ایک ڈھلوان سے اترنے لگے۔ گیری نے کہا۔

"مارگو تمہارے ساتھ راضی خوشی جارہی ہے۔ مجھے پہلے ہی سوچنا چاہئے تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ میں بوڑھا ہوچکا ہوں۔"

"نہیں گیری! اپنے متعلق ایسا نہ سوچو۔"

"اب تک میں ایسا نہیں سوچ رہا تھا۔ جب سے تمہارے دیئے ہوئے ماورائی کیپسول کھائے ہیں۔ اس وقت سے مثبت انداز میں سوچتا آرہا ہوں کہ میں کلسٹروفوبیا کا مریض نہیں ہوں اور نہ ہی بوڑھا ہوں۔ خود کو جوان سمجھ کر ایک جوان لڑکی کو بھگا لایا۔ مجھے افسوس ہے۔"

وہ نشیب میں آکر اپنے اطراف پھیلی ہوئی اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

"افسوس نہ کرو۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اچانک ہنستے ہوئے بولا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم وہ کیپسول کھانے کے بعد میری اسسٹنٹ کو لے اڑو گے تو میں تمہارے علاج کے لئے وہ کیپسول کبھی تجویز نہ کرتا۔"

وہ باتوں کی دھن میں دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ جب دوستانہ ماحول میں باتیں ہو رہی ہوں تو آگے پیچھے کا دھیان نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں کمزور دشمن بھی حاوی ہوجاتا ہے۔ گیری نے اچانک ہی ایک بھاری سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ ٹیلنگ نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر اس کی طرف پلٹ گیا لیکن حملہ اتنا زور دار تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کا سر لہولہان ہوگیا تھا' آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ ایسے رک رک کر سانس لے رہا تھا جیسے آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔

گیری پتھر کو ایک طرف پھینک کر واپس بھاگنے لگا آتے وقت راستہ آسان تھا۔

جاتے وقت اسے چڑھائی پر دوڑنا پڑ رہا تھا۔ وہ کسی طرح ہانپتے کانپتے اوپر آیا۔ پھر ذرا رک گیا۔ جب اس کی سانسیں اعتدال پر آگئیں تو وہ بڑے پُرسکون انداز سے چلتا ہوا ٹیکسی کے پاس آیا۔ اس نے ڈرائیو کو ٹیکسی کا کرایہ اور اس کا انعام دے کر رخصت کر دیا اور نیلی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مارگو سے بولا۔ "آؤ بیٹھو!"

"ڈاکٹر کہاں ہے؟" مارگو نے پوچھا۔

"تم بیٹھو میں بتا رہا ہوں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ گھبرا کر بولی۔ "کیا.......... کیا تم نے اسے مار ڈالا ہے؟"

اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں وہ مردہ ہے یا زندہ۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اب وہ ہمارا پیچھا کرنے کے قابل نہیں ہے۔"

"نہیں!" وہ چیخ کر بولی۔ "تم نے اسے قتل کیا ہے۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔ گاڑی روکو.........."

"تم پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی ہو۔ خاموش بیٹھی رہو۔ ہمیں جلد از جلد اس ملک سے نکل جانا ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں محبت میں اندھی ہو کر ایک قاتل کا ساتھ نہیں دوں گی۔ گاڑی روکو.........."

وہ اسٹیئرنگ کو پکڑ کر جھٹکے دینے لگی۔ تیز رفتاری سے بھاگنے والی کار قابو سے باہر ہوگئی۔ گیری نے فوراً ہی بریک لگایا۔ کار کے رکتے ہی مارگو دروازہ کھول کر بھاگنے لگی۔

"مارگو' رک جاؤ۔ وہ کار سے نکل کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

مارگو ایک پہاڑی کی بلندی کی طرف جارہی تھی' جہاں سے وہ گزر رہی تھی' وہاں چھوٹی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ دور بلندی پر ایک پرانا چرچ تھا جو نیچے راستے سے ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گیری اسے آوازیں دیتا ہوا اوپر کی طرف جارہا تھا۔

"مارگو! پاگل نہ بنو۔ تم کہاں جارہی ہو؟"

"میں قانون کا ساتھ دینے جا رہی ہوں۔ کہیں سے پولیس کو فون کروں گی۔ تم سے بہتر ٹیلنگ تھا۔ اس نے میرے کہنے پر تمہیں قتل نہیں کیا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ واپس آجاؤ۔"

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ مارگو ایک ابھری ہوئی چٹان پر چڑھ رہی تھی۔ گیری نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی۔

"رک جاؤ۔ تم مجھ سے دشمنی کر رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں ایک قاتل کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ گیری نے ایک جھٹکے سے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ یک بیک وہ چیخ مارتی ہوئی چٹان پر سے الٹ گئی۔ گیری تھرا گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی مختلف چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی نیچے جا رہی تھی۔ وہ بھی نشیب کی طرف دوڑنے لگا۔

نیچے سڑک پر کار سے ذرا دور خون میں لتھڑی ہوئی مارگو بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگا۔ کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور واپس موڑ کر لندن کی طرف جانے لگا۔

کار کی رفتار تیز تھی۔ اس کا ذہن بھی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے؟ کہاں جانا چاہئے؟ اس اجنبی دیس میں کوئی اسے پناہ دینے والا نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو ضرور اس سے انتقام لے گا۔ اگر مر چکا ہے تو پولیس خاموش نہیں بیٹھے گی۔ اس کا پیچھا کرے گی۔ اب بھلائی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد اس ملک سے باہر نکل جائے۔

پھر ایسے نازک وقت پر اسے اپنی بیوی برنائس کی یاد آئی۔ یاد آئی تو احساس ہوا کہ وہ بے چاری کتنی مظلوم ہے۔ وہ برسوں کا ساتھ چھوڑ آیا تھا۔ اس عورت نے اُف بھی نہیں کی تھی۔ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے۔ وہی اس نازک موقع پر اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اسے اپنی آغوش میں چھپا سکتی تھی۔

لندن پہنچتے ہی اس نے ٹیلنگ کی کار ایک جگہ چھوڑ دی۔ پھر وہ تیزی سے پیدل چلنے

لگا۔ بہت دور جا کر وہ ایک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس بوتھ میں اسے صرف برنائس کا نام اور فون نمبر یاد تھا۔ باقی وہ تمام دنیا کو بھول چکا تھا۔

"ہیلو!" سمندر پار سے برنائس کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو برنائس! میں گیری ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں اب تک انگلینڈ میں ہوں۔ یہاں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"تم خواہ مخواہ مصیبت مول لے رہے ہو۔ یہاں چلے آؤ۔"

"اوہ برنائس! کیا تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گی؟"

"کبھی نہیں۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اس کے باوجود ایک دوسرے کی مصیبتوں میں کام آنا ہمارا فرض ہے۔ یاد ہے' میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اس یقین کے ساتھ تمہارے جانے کا تماشہ دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ آؤ گے۔ لوٹ آؤ گیری۔"

آنے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے قتل ہو گیا ہے۔ پولیس کسی وقت بھی مجھے گرفتار کر سکتی ہے۔"

"اوہ! یہ تم نے کیا کیا گیری؟ بہرحال جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ فوراً یہاں چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں' گھبراؤ نہیں' میں ہر ممکن طریقے سے تمہاری حفاظت کروں گی۔"

"شکریہ برنائس! تم نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ میں یہاں کی پہلی فلائٹ سے آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بوتھ کے باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے لگا۔ پروگرام یہی تھا کہ وہاں سے سامان سمیٹ کر پہلی فلائٹ میں سیٹ حاصل کر لے گا اور اپنی بیوی کی آغوش تک پہنچ جائے گا۔

☆======☆======☆

گیری بخیریت اپنے ملک واپس آ گیا۔ برنائس اسے لینے ایئرپورٹ آئی تھی۔ ایک محبت کرنے والی ہستی کو دیکھ کر وہ بچہ بن گیا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ برنائس بڑی محبت سے اسے تسلیاں دینے لگی۔

"گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔ میں تم پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گی.........."

وہ تسلیاں دیتی ہوئی اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی اور خود ہی ڈرائیو کرنے لگی۔

گیری ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سیٹ پر پہلو بدل رہا تھا۔ کسی مجذوب کی طرح بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ وہ لندن کے تمام واقعات بتا رہا تھا لیکن بدحواسی اور گھبراہٹ کی وجہ سے آگے کے واقعات پیچھے اور پیچھے کے واقعات آگے بیان کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں ربط نہیں تھا۔ تمام باتیں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھیں۔

برنائس نے گھر پہنچ کر کہا۔ "تم بہت پریشان ہو۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔ کچھ دیر آرام سے بستر پر خاموش ہو کر لیٹے رہو اگر نیند آ جائے تو اچھا ہے۔ جب تک سوتے رہو گے' سوچ اور فکر سے آزاد رہو گے۔"

وہ جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ برنائس نے اس کے جوتے کھول کر نیچے رکھے۔ اس پر ایک چادر ڈالی' سرہانے تکیئے کو درست کیا اور کھڑکیوں پر پردے پھیلانے لگی تاکہ کمرے میں زیادہ روشنی نہ رہے۔ گیری نے ایک بار اسے محبت اور احسان مندی سے دیکھا۔ پھر اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

اسے گہری نیند آ گئی تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ پھر اس کو ایک دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز دور تھی۔ شاید دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔

وہ آواز۔ وہ آواز..........

گیری کی آنکھیں بند تھیں مگر اس نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز ڈاکٹر ٹیلنگ کی تھی۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

"تم گھبراتی کیوں ہو؟ تم اطمینان رکھو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ گیری بالکل بے بس ہے.........."

گیری کے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ڈاکٹر ٹیلنگ کہاں سے آ گیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک اس کے مکان میں آ گیا ہو؟ ممکن تو نہیں ہے مگر اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"برنائس میری جان؟ تم آرام سے اپنے گھر میں بیٹھی رہو۔ میں گیری سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کے بعد تمہیں فون کروں گا.........."

ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ گیری آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت تیز روشنی تھی۔ اس نے بمشکل تمام آنکھیں کھولیں تو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ برنائس نے کھڑکیوں پر پردے پھیلا دیئے تھے مگر سامنے والی کھڑکی پر پردہ نہیں تھا اور وہ اپنے بستر پر بھی نہیں تھا۔

وہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کھڑکی پر رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے نچلے فریم کی اونچائی' کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ اس لئے وہ آرام سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔

وہ بلاشبہ ڈاکٹر ٹیلنگ کے سرجری روم میں تھا۔ وہی کشادہ کھڑکی تھی' وہی چمڑے سے منڈھی ہوئی کرسی تھی' جس پر بیٹھنے کے بعد اس نے دو عدد ماورائی کیپسول پانی کے ساتھ نگل لئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ وقت سے بہت آگے بھاگ گیا تھا یا وقت اسے ماضی کی طرف کھینچ لایا تھا اسی وقت اپنے شانے کے قریب اسے ٹیلنگ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو گیری!" اس کے مضبوط ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ یک بیک اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ حالانکہ ڈاکٹر اس کا گلا نہیں دبوچ رہا تھا۔ پھر بھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اسے چاروں طرف سے جکڑ دیا گیا ہے۔ کیپسول کا

اثر ختم ہو چکا تھا۔ کلسٹروفوبیا کا مرض حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی گرفت سے خود کو چھڑا کر بھاگنے کے لئے اسے نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹروں کی یہ عادت ہے۔ وہ ہر مریض کو یہی تسلی دیتے ہیں کہ ذرا سی تکلیف ہوگی پھر آرام آجائے گا۔ میں تم سے بھی یہی کہتا ہوں کہ کھڑکی کے باہر ذرا سی تکلیف ہوگی۔ پھر تمہیں ہمیشہ کے لئے آرام آجائے گا.........."

یہ کہہ کر اس نے گیری کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر کھڑکی سے باہر کھینچ دیں۔ ایک جھٹکے سے اس کا جسم کرسی سے سرکتا ہوا، کھڑکی کے فریم سے گزرتا ہوا، ساتویں منزل کی بلندی سے زمین کی پستی پر پہنچ گیا۔

☆------☆------☆

پولیس انسپکٹر کے سامنے گیری کی میڈیکل ہسٹری شیٹ اور دوسرے ڈاکٹروں کی رپورٹ رکھی ہوئی تھیں اور برنائس بھی رو رو کر بتا رہی تھی کہ گیری پر بعض اوقات کس طرح جنون سوار ہو جاتا تھا اور وہ دروازے سے نکل کر یا کسی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر کھلی فضا میں چلا جاتا ہے۔

تمام شواہد کے پیشِ نظر پولیس کو یقین ہو گیا کہ گیری اپنی موت کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر ٹیلنگ بڑی خوبصورت اداکاری کر رہا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور خود کو الزام دے رہا تھا۔

"آہ۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں گیری کو سرجری روم میں ذرا سی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس کمرے میں آگیا تھا۔ آہ! ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر تم نے اسے کیپسول کھلا کر پُرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے پوری طرح اپنا فرض ادا کیا ہے مگر تمہاری احتیاطی تدبیر بھی اسے نہ بچا سکی۔"

برنائس نے بھی تائید کی۔ "ہاں ڈاکٹر! تم خود کو الزام نہ دو۔ میرے خاوند کے جنون اور پاگل پن نے اسے مارا ہے۔"

انسپکٹر ان سے رخصت ہو گیا۔ برنائس اور ڈاکٹر اسے لفٹ تک چھوڑنے گئے تھے۔ اس کے جاتے ہی برنائس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تم نے کمال کر دیا ٹیلنگ! ایسی مکمل پلاننگ کی ہے کہ سارا الزام مرنے والے پر عائد ہو گیا۔"

ٹیلنگ نے مسکرا کر کہا۔ "عورت کی خاطر بڑی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میں نے تو ایک چھوٹا سا جرم کیا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو میں تمہیں نیچے تک چھوڑنے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چیمبر میں واپس آگیا۔

سرجری روم میں مارگو کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور خالی کرسی کو تک رہی تھی۔ ٹیلنگ نے اندر آکر پوچھا۔

"تم یہاں کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟"

مارگو کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آگئی۔ اس نے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے ایکسرے رپورٹ دے کر مجھے ولی براڈ کے پاس بھیج دیا تھا۔ کاش کہ میں نہ جاتی۔ میں یہاں موجود ہوتی تو گیری کو کھڑکی سے چھلانگ لگانے کا موقع نہ دیتی۔ اُف! میں ذرا سی دیر کے لئے گئی اور ذرا سی دیر میں یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔"

"تم اس کے متعلق زیادہ نہ سوچو۔ ورنہ اسی طرح پریشان ہوتی رہو گی۔" ڈاکٹر واش بیسن کے پاس آکر اپنے دونوں ہاتھ دھونے لگا۔

مارگو نے چونک کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ٹیلنگ کے دائیں ہاتھ کی کلائی سے ذرا اوپر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ نل کا پانی ان خراشوں پر سے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ ذرا سی دیر کے لئے ڈاکٹر ولی براڈ کے پاس گئی تھی اور ذرا سی دیر میں ڈاکٹر ٹیلنگ کے ہاتھ پر خراشیں آگئی تھیں۔

اس نے تولیے سے ہاتھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں برنائس کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم بھی چیمبر کو لاک کر کے گھر چلی جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ مارگو تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر واپس نہیں آئے گا تو وہ دوسرے کمرے میں آگئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو انسپکٹر! میں ڈاکٹر ٹیلنگ کی اسسٹنٹ مارگو بول رہی ہوں۔ دیکھئے مجھے شبہ ہے کہ گیری کی موت کا ذمے دار کوئی اور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا خاموش ہوگئی۔ انسپکٹر نے کہا:

"گیری کی میڈیکل رپورٹ پڑھنے کے بعد یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی موت کا ذمے دار ہے۔ پھر ہم بغیر کسی ثبوت کے کسی اور پر کیسے الزام عائد کر سکتے ہیں؟"

"ایک ثبوت ہے انسپکٹر! ڈاکٹر ٹیلنگ کے دائیں ہاتھ پر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر آپ گیری کے ناخنوں کا طبی معائنہ کرائیں تو اس میں کسی کے خون اور گوشت کی ہلکی سی کھرچن ضرور ملے گی۔ آپ اس کھرچن کا موازنہ ڈاکٹر ٹیلنگ کے خون اور گوشت سے کر سکتے ہیں۔"

انسپکٹر کی جوشیلی آواز سنائی دی۔

"شکریہ مس مارگو! تم نے قانون کی بہت بڑی مدد کی ہے۔ میں ابھی ایکشن لیتا ہوں۔"

مارگو ریسیور رکھ کر تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے گیری بہت یاد آرہا تھا۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ خیالی دنیا کا رہنے والا گیری اسے بھی پہاڑی چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر چکا تھا۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کتابی کیلنڈر کھلا ہوا تھا۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔

اور وہ آٹھ تاریخ بڑی منحوس تھی۔

☆------☆------☆

خیال زدہ

جیل سے بھاگنے والے ایک مغرور قاتل کی کہانی۔ وہ صرف ایک بار اپنی بہن کو دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تقدیر اس کے مخالف تھی وہ جب بہن کے سامنے پہنچا تو......

بھلا اپنے آپ کو بھی کوئی سر سے پاؤں تک دیکھ سکتا ہے؟ صرف آئینہ دکھاسکتا ہے مگر وہاں آئینہ نہیں تھا۔ ایک سنسان سا راستہ تھا اور وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ رات کی تنہائی میں وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے سائے میں کھڑی ہے۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔ ہر لمحے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے' کوئی آ نہیں رہا؟ خوف کے مارے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہاں سے چلی جائے۔ جتنی تیزی سے بھاگ سکتی ہے' بھاگ جائے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو دور سے دیکھ رہی تھی مگر اپنے قریب جا کر اپنے آپ کو سمجھا نہیں سکتی تھی۔

اس کے سر پر بوڑھے برگد کا سایہ تھا اور اس کی بوڑھی لٹیں اس کے آس پاس اس طرح جھول رہی تھیں جیسے اسے اپنی گرفت میں لے کر یا اپنی لٹوں کا پھندا بنا کر پھانسی پر چڑھا دینا چاہتی ہوں۔ وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ برگد کے درختوں میں چڑیلیں پناہ لیتی ہیں لیکن وہ چڑیلوں سے نہیں ڈرتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی آسیبی خیال دہشت زدہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی انجانا سا خوف اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ تب اس نے دیکھا کہ جہاں اس کی ہمزاد کھڑی ہوئی تھی' ٹھیک اس کے پیچھے ایک انسانی سایہ سا جھلک رہا تھا۔ پہلے وہ سایہ واضح نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ برگد کا متحرک سایہ ہے جو اس کے وہمی تصور میں مجسم ہو گیا ہے.......... لیکن.......... جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا' تب دہشت سے اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز کو ان دیکھی مٹھیوں نے جکڑ لیا تھا۔

ہاں وہ ایک ہاتھ ہی تھا۔

جسے دیکھتے ہی اس کی جان نکل جاتی۔ وہ بھوتوں سے' چڑیلوں سے حتیٰ کہ موت سے

بھی نہیں گھبراتی تھی۔

لیکن وہ ظالم ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا اس کی پشت کی جانب سے بالکل سامنے آ گیا۔ اس کھردرے ہاتھ نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پیالے میں لے لیا اور اپنی انگلیوں سے اس کے شفق رنگ رخساروں کو بڑی بے دردی سے پھول کی طرح مسلنے لگا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ ان دیکھی مٹھیوں میں جکڑی ہوئی چیخ ایکدم سے ابھر کر رات کے سناٹے میں منتشر ہو گئی.......... پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ فوم کے ملائم بستر پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور سانس لیتا ہوا سینہ اپنی اٹھان سے اوپر دھڑک رہا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر خود کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایک خواب تھا' محض خواب۔

اس کی چیخ سنتے ہی سارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ پھر کتنے ہی ہاتھ خواب گاہ کے بند دروازے کو پیٹنے لگے۔ اپنوں کی آوازیں سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے انکل' آنٹی' کزن ایسے ہڑبڑا کر اندر چلے آئے جیسے دروازہ نہ کھلا ہو' سیلاب کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

انکل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے ماریہ؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے اس کے کزن نے کہا۔ "دیکھئے تو ڈیڈی! کیسی پیلی پڑ گئی ہے۔ میں سمجھ گیا محترمہ کیوں چیخ رہی تھیں۔"

اس کی آنٹی نے ناگواری سے کہا۔ "اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے' ہر دوسرے تیسرے روز ہماری نیند خراب کرتی ہے۔ پتہ نہیں رجب کا مہینہ کب آئے گا اور اس سے جان چھوٹے گی۔"

اس کے کزن نے کہا۔ "ممی! ماریہ نے آدھی رات کو چیخ ماری ہے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ٹھیک آدھی رات کے بعد سے رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد یہ سرخ جوڑا پہنے گی اور ہمارا پیچھا چھوڑ کر چلی جائے گی۔" اس کی آنٹی "اونہہ" کہہ کر چلی گئیں اور ان کے پیچھے ان کے بچے بھی چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد انکل نے کہا۔

"بیٹی! پتہ نہیں وہ ہاتھ تمہارے خوابوں اور خیالوں میں کہاں سے چلا آتا ہے۔ شادی کے بعد بھی تمہاری یہی حالت رہی تو سسرال والے تمہارے بارے میں پتہ نہیں کیسی رائے قائم کریں۔ میرا خیال ہے مجھے کسی ماہر نفسیات سے ملنا چاہئے۔ وہی تمہارے ذہن کو کریدے گا اور تمہیں سمجھائے گا کہ جو کچھ تم دیکھتی ہو، وہ محض وہم ہے یا ماضی کا کوئی معمولی سا واقعہ ہے جسے اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ تم اب آرام کرو۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ تمہیں اس طرح خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ میں صبح تمہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پھر ایک بار ماریہ کو گہری سنجیدگی سے دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ "بیٹیاں بڑی مشکل سے بیاہی جاتی ہیں۔ پہلے تو جسمانی عیب کو دیکھا جاتا ہے۔ بظاہر کوئی عیب نہ ہو تو رشتہ مانگنے والے دماغ کے اندر جھانک کر بھی اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھتے ہیں کہ لڑکی اندر سے بھی مکمل ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ علاج سے تمہاری یہ کمزوری دور ہو جائے۔ تم لڑکیوں کو بیاہنے کے لئے ماں باپ کو کتنے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں، دوسروں کو تاعمر فریب دینا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھو، جس لڑکے سے تمہارا رشتہ ہو رہا ہے، اسے یہ نہیں بتایا گیا کہ تمہارا بھائی ایک عادی مجرم ہے اور ان دنوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی جوانی کی قیمتی گھڑیاں گزار رہا ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہارے ہونے والے شوہر سے یہ بات کیوں چھپائی گئی ہے؟"

وہ اپنے پیچھے ایک سوال چھوڑ کر چلے گئے۔ ماریہ چند لمحوں تک بند دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں بند دروازے کو جواب دیا۔

"ہاں، میں جانتی ہوں کہ یہ بات کس لئے چھپائی گئی ہے۔ میرا ہونے والا شوہر پولیس انسپکٹر ہے۔ بھائی مجرم اور خاوند قانون کا محافظ، آگ کو پانی سے چھپا کر ہی رکھنا پڑتا ہے۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ایک نظر کھڑکیوں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر بستر پر آگئی۔

رات چپ تھی، دنیا سو رہی تھی اور کتنے ہی اندیشے جاگ رہے تھے۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اس کے ذہن کو کرید لے گا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس

راز تک پہنچے جو اچھی بھلی لڑکیوں کو عیبی بنا دیتے ہیں۔ انکل نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ سہاگ کا جوڑا پہننے کے لئے بہت سے جھوٹ اور فریب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ کیسا ہی ماہر نفسیات کیوں نہ ہو، میں اسے فریب دے دوں گی۔ اس لئے کہ ماں کے دامن پر داغ لگے تو وہ داغ سہاگن بیٹی کے ماتھے کا جھومر بن کر لوگوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔

ایک سہاگن بننے کا خیال آیا تو دور اس کی سماعت میں کہیں شہنائی سی گونجنے لگی۔ کھلی آنکھوں کے سامنے اس نے خود کو سرخ جوڑے میں دیکھا۔ وہ دلہن بنی جتنی حسین لگ رہی تھی، اتنا ہی اس کے ماتھے کا جھومر مرید نما لگ رہا تھا۔ جھومر کے رنگ برنگے نگوں سے سو پاور کے بلب کی روشنی منعکس ہو رہی تھی، رنگین شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان رنگوں کی ہلچل میں اس نے وہ تماشا دیکھا۔ وہ اس کی ماں کی خواب گاہ تھی۔ کوئی اجنبی کھڑکی کے راستے اندر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ چھ برس کی بچی تھی۔ بچوں جیسی گہری نیند سونے کی عادی تھی۔ نہ جانے اس کی آنکھ کیسے کھل گئی۔ ایک اجنبی کو دیکھتے ہی اس نے ڈر کر جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ کتنے ہی چور ڈاکوؤں کے سنے ہوئے قصے ایک اجنبی کے روپ میں سامنے آگئے۔

اس کی ممی ہڑبڑا کر اٹھ گئیں اور اپنا لباس درست کرنے لگیں لیکن سوتے وقت دوپٹہ پاس نہیں رہتا تھا۔ وہ دوپٹہ اٹھانے کے لئے آگے بڑھیں تو اجنبی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ "تمہیں میری خواب گاہ میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کیسا مقناطیسی شباب لئے پھرتی ہوئی کہ میں خود بخود کھنچا چلا آیا۔ شاہینہ! میں نے بہت برداشت کیا، دور دور سے دیکھ کر للچاتا رہا۔ میں سمجھتا تھا میری بوند بوند نگاہیں تمہاری پتھریلی سوچ میں میرے لئے جگہ پیدا کر دیں گی لیکن تم بڑی بے حس ہو۔ میرا ایک دوست ماہر نفسیات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان سے محبت کی بھیک نہ مانگی جائے بلکہ جبراً ان کو ان سے چھین لیا جائے اور میں چھیننے کے لئے آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے شاہینہ کو اپنی طرف کھینچا اور اپنے فولادی بازوؤں کی فصیل میں قید کر لیا۔ وہ تڑپنے لگی، مچلنے لگی، یہ بھول گئی کہ اتنی جذباتی قربت میں بدن کا ذرہ ذرہ

فصیل کی دیواروں سے ٹکراتا ہے، للچاتا ہے اور دیوانگی کو شہ دیتا ہے۔ اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"میرے ماہر نفسیات دوست نے یہ بھی کہا تھا کہ عورت زبان سے کچھ نہ کہے اور چیخنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ صرف خاموش اداؤں سے رسمی طور پر انکار کرتی رہے تو سمجھو کہ وہ دام میں آگئی اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری گرفت سے نکلنے کے لئے مچل تو رہی ہو مگر چیخنے کی تکلیف گوارا نہیں کر رہی ہو۔"

شاہینہ نے جھنجلا کر کہا۔ "زیادہ ماہر نفسیات بننے کی کوشش نہ کرو۔ ماریہ کے ڈیڈی پہلے ہی ہم دونوں پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ایک بار کہہ چکے ہیں کہ میں تم سے فری ہو کر باتیں نہ کروں۔ اگر میں نے چیخنا شروع کر دیا اور وہ آگئے تو کبھی یقین نہیں کریں گے کہ تم خود یہاں آئے ہو۔ ساری عمر کے لئے طعنہ بن جائے گا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا۔ عورت کی مجبوریوں کو سمجھو، خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔"

لیکن وہ نہ جا سکا۔ وہ اس شجر کے سائے تک پہنچ گیا تھا جہاں جانے کے لئے اس دنیا کے پہلے انسان کو بھی روکا گیا تھا اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس بات کے لئے اسے روکا جائے، اس بات کے لئے وہ زیادہ مچلتا ہے......... اور وہ مچلتا گیا۔

ننھی سی سہمی ہوئی ماریہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر دیکھتی تھی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی یوں لگتا جیسے وہ بھوت اس کی ماں کی بوٹیاں چبانے کے بعد اسے بھی کچا چبانے آ جائے گا۔ تب اس کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ "دیکھو، اب میں چیخنا شروع کر دوں گی۔ شیطان درندے! تُو میری خاموشی کا غلط مطلب سمجھ رہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو کو اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اجنبی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور ماریہ کے ڈیڈی کو آوازیں دیتی ہوئی وہاں سے بھاگنے لگی لیکن اجنبی اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک دم اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ماریہ نے اس ظالم ہاتھ کو دیکھا۔ وہ پیچھے سے آیا تھا اور اس ہاتھ نے ممی کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پیالے میں رکھ کر دبوچ لیا تھا۔ اس ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کی ممی کی چیخ گھٹ کر رہ گئی وہ ظالم انگلیاں اس کی ممی کے تمتماتے ہوئے رخساروں میں پیوست ہو گئی تھیں۔ ماریہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا چہرہ، اپنی ٹھوڑی اور

اپنے رخسار ان انگلیوں کے شکنجے میں آ گئے ہوں۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھوڑی سے سرکتا ہوا گردن پر آ گیا۔ پھر اس کا دم گھٹنے لگا۔ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ماں کا دم گھٹ رہا تھا اور بیٹی کی سانسیں رکی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر اِدھر سے اُدھر تڑپنے لگی۔ سانسیں تھیں کہ سینے تک پہنچنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ پتہ نہیں موت اسی طرح آتی ہے یا نہیں لیکن ماریہ عارضی طور پر مر گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے ڈیڈی تھے، ڈاکٹر تھا اور پولیس کے آدمی یہ پوچھنے آئے تھے کہ اس کی ممی کو کس نے ہلاک کیا؟ وہ صرف اتنا ہی بتا سکی کہ ایک اجنبی تھا لیکن یہ نہ بتا سکی کہ اس اجنبی نے اس کی ماں کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا۔ وہ چھ برس کی بچی تھی لیکن اس کے ذہن میں اپنی ماں کی یہ بات نقش ہو گئی تھی کہ اگر اس نے اس اجنبی کا نام لیا یا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک حصہ بھی اپنے بیان میں لکھوایا تو اس کی ماں بدنام ہو جائے گی۔ بچپن میں اس نے محض ماں کی محبت سے متاثر ہو کر یہ بات چھپائی تھی۔ جوان ہو کر پتہ چلا کہ یہ راز اس کے سہاگن بننے کے لئے بھی کتنا اہم ہے۔ اگر اس کے ہونے والے خاوند کو پتہ چل جائے کہ کوئی اجنبی رات کی تنہائی میں اس کی ماں کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا تو وہ بیٹی کے کردار پر بھی شبہ کرے گا۔ یہ مرد بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عورت اپنی زندگی کی پوری کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خاوند کو جی جان سے چاہے گی۔ اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔ سونے سے پہلے اپنی خواب گاہ کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند رکھا کرے گی تاکہ کوئی اجنبی ہاتھ اس کی ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے گردن تک نہ پہنچ سکے لیکن وہ ہاتھ جو اس کی ماں کی خواب گاہ سے چل کر اس کے ذہن کے تاریک تہہ خانے میں آ کر بیٹھ گیا ہے، اس کی حقیقت کبھی نہیں بتائے گی۔

☆======☆======☆

وہ دلہن بنی پھولوں کی سیج پر بیٹھی تھی۔ نصف چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے رس بھرے ہونٹ اور ٹھوڑی کی بیضوی گولائی گھونگھٹ سے باہر نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی ماحول میں آ گئی تھی اور اس کمرے میں جو ساری زندگی کا ساتھی بن کر آنے

والا تھا' وہ بھی اجنبی تھا' لیکن وہ سمجھتی تھی کہ ایسے اجنبی کا پیار جو آج رات ملے گا' زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ چلتا رہے گا۔

وہ تنہا گھٹنوں کی طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی تو اپنی عادت کے مطابق ماضی کی طرف لوٹ جاتی تھی اور وہاں سے جتنے زخم ملے تھے' ان پر امید کے مرہم رکھتی جاتی تھی۔ ایک زخم تھا ماں کی بدنامی' دوسرا زخم تھا بھائی کی جدائی جسے ہوش سنبھالنے کے بعد اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن آج اسے ماضی یاد نہیں آ رہا تھا۔ حنا کی خوشبو' زیورات کی جھلملاہٹ' سہاگ کے جوڑے کی آتشیں رنگت ایسی ہوتی ہے کہ لڑکیاں وقتی طور پر بڑے سے بڑے المیے کو بھلا دیتی ہیں۔ ایسے وقت گھونگھٹ کے سائے میں صرف مستقبل کا سپنا نظر آتا ہے۔

وہ صرف اپنے خاوند کے متعلق سوچ رہی تھی۔ محبت کے ان دیکھے تحفے جو اسے ملنے والے تھے' ان کے مسرور کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ کچھ اپنی بیاہتا سہیلیوں سے سنا تھا کہ سہاگ رات میں آنے والے کا انتظار کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ ہر آہٹ پر جان نکلتی ہے کہ پتہ نہیں آنے والا ظالم ہے یا مہربان؟ وہ مہربان ہو یا نہ ہو مگر محبت کے اصولوں سے آشنا ہو۔ ایسا شخص ظالم ہو تو نئی نویلی دلہن کی پیار بھری اداؤں سے پہلی ہی رات پگھل جاتا ہے اور جو پہلی رات دیوانہ بن جائے تو اس کی دیوانگی کا نشہ تمام عمر اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ پہلی رات بہت اہم ہوتی ہے۔ یا تو عورت ہمیشہ کے لئے اپنے خاوند کو جیت لیتی ہے یا پھر ہار جاتی ہے اور ساری عمر اس سے مرعوب رہتی ہے۔

اس کی سہیلی نے ایک بہت ہی اہم بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ جب خاوند اجنبی ہو اور اس کے مزاج سے واقفیت نہ ہو تو اسے آزمانے کا اور اس کے مزاج کو سمجھنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ عورت دلہن بن کر شرماتی رہے اور اپنے اجنبی ساتھی کی قربت سے سمٹتی رہے۔ جب وہ گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھنا چاہے تو پھر وہ اپنی گھبراہٹ کا اظہار کرے اور بڑے ہی شرمیلے لہجے میں پانی طلب کرے۔ اگر پہلی رات خاوند پانی اسے اپنے ہاتھوں سے پلائے تو سمجھ لینا کہ وہ فرمانبردار قسم کا خاوند ہے۔ ماریہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ بھی یہی نسخہ آزمائے گی۔

دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ وہ ایسے سہم کر سمٹ گئی جیسے اچانک ہی کسی شکاری نے رائفل کا گھوڑا چڑھایا ہو۔ سہمنے اور سمٹنے کے باوجود اس نے گھونگھٹ کے افق سے دیکھا' دروازہ بند نظر آیا' قدموں کی چاپ نہیں تھی اور اس تنہا کمرے میں کسی دوسرے کے وجود کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر کوئی تھا اور اس کے پیچھے تھا۔ سہاگ کے کمرے میں مدہم مدہم سی خواب آور روشنی اونگھ رہی تھی اور اس خواب دیکھنے والی کے پیچھے خواب و خیال کا وہ بھاری بھرکم اور کھردرا سا ہاتھ سرخ جوڑے کے پس منظر سے طلوع ہو رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ ذرا آگے بڑھا' اس کے بائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے گھونگھٹ کے سنہرے کنارے سے ٹکرا گیا۔ گھونگھٹ میں ذرا سی ہلچل مچ گئی۔ دل یکبارگی اچھل کر دھڑکنے لگا۔ ماریہ نے سہم کر سر اٹھایا۔ اسی وقت اس کی ٹھوڑی اجنبی ہتھیلی کے پیالے میں آ گئی۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دیدے پھیل گئے۔ چیخ کی آواز اس کے سینے سے اٹھی اور ہمک ہمک کر' اٹک اٹک کر یک بارگی آتش فشاں کے لاوے کی طرح اس کے رس بھرے لبوں سے منتشر ہو کر فضا میں گونج اٹھی۔

پھر اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے' کس دنیا میں ہے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ سہاگ کی سیج پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے ساس سسر' ایک ڈاکٹر اور ایک اجنبی نوجوان تھا جس کی روپہلی شیروانی بتا رہی تھی کہ وہ اس کا دولہا ہے۔ ڈاکٹر اس سے چیخنے اور خوفزدہ ہونے کی وجہ پوچھ رہا تھا' اس کا خاوند ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں اس کمرے میں آیا تھا' یہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر یہ خوفزدہ ہو جاتیں۔ انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا تھا' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آپ ہی آپ چیخ مار کر بے ہوش کیسے ہو گئیں؟"

ماریہ سے پوچھا گیا تو اس نے بڑی خاموشی سے کچھ اس طرح نقاہت کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر بڑی نرمی سے کہا۔ "ابھی کچھ نہ بولو' تمہیں خاموشی اور آرام کی ضرورت ہے۔"

پھر اس نے اس کے سسرال والوں سے کہا۔ "دلہن کو تنہا نہ چھوڑا جائے اور........" اس نے بات کو ادھوری چھوڑ کر اس کے خاوند کو دیکھا اور بڑی آہستگی سے

معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اور آج رات دلہن کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی دواؤں کا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔ اس کے ساس سسر تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتے رہے اور اسے سمجھاتے رہے کہ یہ اس کے لئے اجنبی ماحول ضرور ہے لیکن وہ سب اس کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر کسی سے خوف آتا ہو تو بلا جھجک کہہ دے اس کے دل سے خوف و دہشت دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسے سمجھانے کے دوران اس کی ساس نے اپنے خاوند کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ یہ سہاگ کا کمرہ میں نے اپنے بیٹے کے لئے سجایا ہے۔ چلو یہاں سے۔

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ کمرے میں صرف اس کا دولہا رہ گیا۔ وہ شرما کر اٹھنے لگی۔ تو اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شرمانے کا موقع نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ گیا ہے کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔“

وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر اس نے جبراً اس کے شانے کو تھام کر لٹا دیا اور مسکراتا ہوا بولا۔ ”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ صرف مجرم ہی مجھے دیکھ کر چیخ کر بھاگتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ جسے اپنی زندگی کا ساتھی بنایا وہ بھی مجھے دیکھ کر چیخ مارتی ہے۔“

وہ اپنی ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو چھپاتی ہوئی بولی۔ ”میں.......... میں آپ سے شرمندہ ہوں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم شرمندہ ہو اور میں بھی یہ سوچ کر شرمندہ ہوں کہ پولیس والوں کے چہرے کتنے بھیانک ہوتے ہیں۔“

وہ ندامت سے بولی۔ ”مگر میں نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی کسی کا ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن تک آ گیا۔“

اس کے انسپکٹر خاوند نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی وہ میرا ہاتھ تھا۔ کیا پیچھے سے ہاتھ آئے تو تم ڈر جاتی ہو؟“

اس نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پھر ایک بار ہنستے ہوئے بولا۔ ”عجیب اتفاق ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے میں اس بات کا عادی ہو گیا ہوں کہ مجرموں کو پیچھے سے جا کر پکڑتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا مگر میں اپنی عادت سے مجبور ہو

کر تمہارے پیچھے آ گیا تھا۔ میرا یہ مذاق بہرحال مجھے مہنگا پڑا۔ دیکھو نا ڈاکٹر معنی خیز انداز میں کہہ گیا ہے کہ میں تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔ اب تو میں حسرت سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور ساری رات دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اس کے نازک سے ملائم ہاتھوں کو تھام لیا اور اس کی گلابی ہتھیلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑنے کو تو منع نہیں کیا ہے۔“

ماریہ نے کہا۔ ”میں بزدل نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں پیچھے سے کوئی ہاتھ آئے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ محبوب کا ہاتھ کسی مجرم کا ہاتھ نہیں ہوتا کہ پیچھے سے آئے۔ آپ کا ہاتھ جب بھی محبت سے سامنے آئے گا' اس کی اہمیت میری جان سے زیادہ ہو گی۔“

اس کے خاوند نے حوصلہ پا کر اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ دستور کے مطابق پہلی بار مرد کی انگلیاں عورت کی ٹھوڑی کو چھوتی ہیں تاکہ ہلکا سا ٹھوکا دے کر اس کے چہرے کو اٹھائے' روشنی کی زد میں لائے اور چہرے کے نقوش کو جی بھر کر دیکھے۔

وہ وہی ہاتھ تھا جس کا لمس پاتے ہی وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی تھی لیکن اب وہ سامنے آیا اور محبت سے آیا تو وہ مارے شرم کے چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی۔ اس کے خاوند نے کہا۔ ”ہمارے رسم و رواج بڑے ہی فرسودہ ہیں۔ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ ماں باپ دیکھتے ہیں' پسند کرتے ہیں اور سہاگ کے اس رنگین پنجرے میں دو اجنبیوں کو قید کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکی ایک اجنبی کی موجودگی سے سہم کر بے ہوش ہو جاتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آؤ پہلے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ تم نے نکاح پڑھانے کے دوران میرا نام سنا ہو گا۔ میرا نام مراد علی ہے اور میں تمہارا نام جانتا ہوں لیکن اصل تعارف یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی ہو اور مزاج تو رفتہ رفتہ سمجھ میں آتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ماریہ کے پھول جیسے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا لیا۔

☆======☆======☆

جیل کی آہنی سلاخوں کو توڑ کر نکلنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قانون کے محافظ بھی مجرموں کا ساتھ دیں۔ ایک سپاہی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس دروازے کا تالا توڑنے میں اس کی مدد کی تھی اور اسے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ جب وہ جیل کے احاطے کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا تب اس سپاہی نے خطرے کا الارم بجایا۔ جیل کی وسیع چار دیواری میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وزنی بوٹوں سے زمین کی چھاتی دہلنے لگی لیکن وہ جیل کی اونچی دیوار پر دوڑتا رہا۔ دوڑنے کے دوران اسے پتہ چلا کہ کوئی اس کے بہت قریب اسے اپنی گرفت میں لینے آگیا ہے۔ اس نے دیوار کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بھی چھلانگ لگائی اور دونوں ایک ساتھ پانی میں آگرے۔ سرچ لائٹ کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ جہاں تھے' وہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ اس نے قریب آنے والے پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ دوسرے نے اس کے حملے کو روکتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہو' میں بھی تمہاری طرح ایک مجرم ہوں۔ لڑنے جھگڑنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ چلو بھاگو یہاں سے۔"

پھر وہ دونوں تیرتے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف جانے لگے۔ جب سرچ لائٹ گھومتی ہوئی ان کی طرف آتی تو وہ پانی میں غوطہ لگا دیتے اور اندر ہی اندر تیرتے ہوئے دور تک نکل جاتے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ چند لمحوں تک کتوں کی طرح ہانپتے رہے۔ انہوں نے پلٹ کر دور جیل کی چار دیواری کو دیکھا پھر پلٹ کر بھاگنے لگے۔ ان کے پیچھے سپاہی نہیں تھے لیکن جیل کا سائرن رات کے سناٹے میں دور تک چیختا ہوا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ راستے اور گلیاں ویران تھیں۔ اس لئے کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہوا۔ کبھی کبھی کسی گلی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ بہت دور جا کر وہ ایک ریلوے لائن تک پہنچ گئے۔ ان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ آؤٹر سگنل کی سرخ روشنی بتا رہی تھی کہ ٹرین کو آگے بڑھنے کے لئے سبز روشنی کا انتظار ہے۔ وہ ٹرین کی طرف بھاگنے لگے۔ مسلسل دوڑتے رہنے کی وجہ سے ان کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تھک ہار کر گر پڑتے لیکن وہ تھکنے اور ہارنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے ذرا بھی تاخیر کی تو پولیس والے انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دیں گے۔ تمام شہر کی ناکہ بندی کر دیں گے۔ لہٰذا وہ محاورے کے مطابق سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ آدھے فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے سرخ روشنی کو سبز روشنی میں بدلتے دیکھا۔ ٹرین اب چلنے ہی والی تھی۔ ان کے دوڑنے کی رفتار میں تیزی آگئی۔ جب پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تو انجن نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز انہیں بلا رہی تھی۔ "آؤ جلدی آؤ۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور میں جانے والی ہوں۔ تمہیں قانون کی گرفت سے دور لے جانے والی ہوں۔"

پھر ٹرین کے زنگ آلود پہیے حرکت میں آگئے۔ دونوں دانت کچکچاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ جیسے جیسے ان کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی' ٹرین کا آخری ڈبہ بھی ان کے قریب سے گزرتا جا رہا تھا۔ ایک نے اچھل کر ہینڈل کو پکڑ لیا اور پائیدان پر دونوں پاؤں جما کر اپنا دوسرا ہاتھ نیچے بھاگتے ہوئے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرا ساتھی دوڑنے کے معاملے میں اتنا تیز نہیں تھا لیکن ایک ہاتھ نے اسے بہت سہارا دیا۔ وہ ہاتھ کو تھام کر اچھلتے ہوئے پائیدان سے لپٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا آدھا نچلا جسم زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ پہیوں کی زد میں آتا' اس کے ساتھی نے اس کا گریبان پکڑ کر پوری قوت سے اوپر اٹھایا۔ دوسرے کے لئے اتنا سہارا کافی تھا۔ وہ بھی پائیدان پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔

وہ کسی آفیسر کا سپیشل کمپارٹمنٹ تھا۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ اندر ہلکی ہلکی نیلی روشنی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی برتھ پر بیٹھا ہوا ولایتی وہسکی کی چسکیاں لے رہا

تھا اور ایک نیم عریاں عورت اس کے شانے سے ٹیک لگائے ایک ہاتھ سے اس کا م رہی تھی۔ وہ دونوں مجرم دبک کر پائیدان پر بیٹھ گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔

"اس کمپارٹمنٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شراب پینے والا آدمی کوئی بہت بڑا ا ہے۔ اس کے پاس یقیناً ریوالور ہوگا۔ اگر نہ ہو تب بھی وہ ہمیں دیکھتے ہی زنجیر کھینچ کر

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا اور کہا۔ "ہاں' ہمیں ایسی کوئی حرکت نہیں چاہیے' جس سے ٹرین رک جائے۔ یہ ہمیں جتنی دور لے جا سکتی ہے' ہم جائیں گے۔ ا میں ہماری بہتری ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے پائیدان پر بیٹھے رہے۔ ٹرین شہری حدود سے باہر نکل آئی اور اب جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ آفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے دبک کر اپنے ساتھی سے بولا۔ "وہ کمبخت اسی طرف آ رہا ہے' اب کیا ہوگا؟"

دوسرے نے کہا۔ "اگر اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر ہمیں دیکھا تو میں اس کی ایسی تیسی کر دوں گا ورنہ وہ زنجیر کھینچ کر یا ہمیں ریوالور کی زد میں لا کر ہماری ایسی تیسی کر دے گا۔"

وہ دونوں پائیدان سے اٹھ کر شیشے کی کھڑکی کے اطراف ایکدم محتاط ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرین کھٹاکھٹ کی آواز کے ساتھ اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور تیز سے گزرنے والے درختوں کے پتے ان کے چہرے پر جھاڑو پھیرتے جا رہے تھے۔ وہ آفیسر شراب کے نشے میں جھومتا ہوا بالکل شیشے کے قریب آ کر رک گیا اور کھڑکی کے شیشے کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ڈارلنگ! ادھر آؤ۔ ذرا باہر کی تازہ ہوا کھائیں۔"

وہ اپنی جگہ ذرا نزاکت سے اٹھلاتی ہوئی بولی۔ "میں نہیں آؤں گی' ٹھنڈی ہوا سے مجھے زکام ہو جاتا ہے۔"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "نازک بدن حسیناؤں کی نزاکت کا کیا کہنا۔ انہیں تازہ ہوا سے بھی زکام ہو جاتا ہے۔"

اس عورت نے کہا۔ "کھڑکی نہ کھولو' دیکھو باہر کتنا اندھیرا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"عورت کے خوفزدہ ہونے سے مرد کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ سہم کر پناہ لینے کے لئے اپنے آپ ہی آغوش میں آ جاتی ہے۔ مرد تو خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوتا ہے۔" "یہ دیکھو میں باہر اندھیرے میں اپنا ہاتھ نکال رہا ہوں۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ تو نہیں لے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کے باہر اپنا ہاتھ نکال دیا۔ وہ ہاتھ ایک مجرم کے بالکل قریب سے گزر کر آگے کی طرف پھیل گیا۔ وہ دیدے پھیلا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھی نے اشارے سے سمجھایا کہ خطرہ ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچ لو۔

ٹرین طوفانی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ دونوں دروازے کے اطراف ہینڈل کو تھامے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک تیسرا ہاتھ تھا جو ان کی ذرا سی غلطی سے انہیں قانون کے حوالے کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ دونوں غیرقانونی حرکتوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے اندر اس عورت نے حیرانی سے کہا۔

"ہائے ڈارلنگ! تم کتنے دلیر ہو۔ کیا تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔ پلیز ذرا باہر دیکھو تو آسمان بالکل تاریک ہے یا تارے نظر آ رہے ہیں۔"

کچھ شراب کا نشہ تھا' اور کچھ یہ بات تھی کہ عورت کی موجودگی میں اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کا کوئی موقع ہاتھ آئے تو اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ اس نے ذرا اکڑ کر اپنی گردن جھکائی اور سر کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ وہ آسمان پر تارے دیکھنا چاہتا تھا لیکن دو طرف سے دو ہاتھوں نے آ کر اسے کتنے ہی رنگ برنگے تارے دکھا دیئے۔ تابڑ توڑ کتنے ہی گھونسے اس کے منہ پر پڑے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کمپارٹمنٹ میں واپس جاتا' دو ہاتھوں نے اس کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے جکڑ کر باہر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھڑکی پر آدھا اِدھر آدھا اُدھر ہو گیا۔ پھر ان دو ہاتھوں نے اس کے بالوں کو چھوڑ کر اس کی کمر پر پتلون میں ہاتھ ڈالا اور اسے پوری قوت سے باہر کی طرف کھینچ کر پھینک دیا۔ اس کی چیخیں دور تک سنائی دیتی رہیں۔ چونکہ وہ آخری کمپارٹمنٹ تھا اس لئے اس کی چیخیں پیچھے ہی رہ گئیں' آگے کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں۔

موت کا یہ تماشا دیکھنے والی صرف ایک عورت تھی جو ذرا دیر کے لئے سہم کر ایک جگہ دبک گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کی جان کا بھی خطرہ ہے' اسے خطرے کی زنجیر کھینچنا چاہیے۔ وہ زنجیر کھینچنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ موت

کا کھیل کھیلنے والے کسی کو اتنی مہلت کب دیتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ دونوں کھڑکی کے راستے اندر آ گئے تھے۔ ایک نے کھڑکی کا شیشہ گرایا' دوسرے نے اس عورت کا راستہ روک لیا۔ پھر اس عورت کی کلائی تھام کر اپنے ساتھی سے ہنستے ہوئے بولا۔

"یار یہ تو بڑی کراری چیز ہے۔ ماں کسم سات برس تک جیل کی ان سخت دیواروں کو دیکھا ہے۔ ایسا حسین مکھڑا دیکھنے کو تو ترس کر رہ گیا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے حسین مکھڑے کو اپنی جانب کھینچا تو وہ گھبرا کر چیخنے لگی۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی' میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل سے ٹکرائی اور فرش پر گر پڑی۔ وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بڑی سفاکی سے بولا۔ "سالی آواز کرتی ہے۔ ابھی اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ اری میں بھی تو مرد ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے' بدن پر قیدیوں کے کپڑے ہیں۔ لا! وہ صاحب بہادر کے کپڑے نکال۔ ابھی میں بھی تیرے ساتھ کھیلنے والا ایک شریف آدمی بن جاؤں گا۔"

اتنے میں دروازے کے قریب کھٹکا سا سنائی دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ٹائلٹ میں سے ایک نوجوان کی گردن پکڑ کر اسے کمپارٹمنٹ میں لا رہا تھا۔ پھر اس نے اس کے سر پر ایک چپت مار کر اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہ اُلو کا پٹھا ٹائلٹ میں چھپا ہوا تھا۔ ابے منہ سے بول! کیا کر رہا تھا ٹائلٹ میں؟"

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک چپت رسید کی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے کے انداز میں بولا۔ "تم دونوں کون ہو؟ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میرے بڑے صاحب کہاں گئے ہیں..."

دوسرے ساتھی نے پھر ایک چپت جماتے ہوئے کہا۔ "ابے ہم سے سوال کئے جا رہا ہے' ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ پہلے یہ بتا کہ تُو کون ہے؟ اور ٹائلٹ میں کیا کر رہا تھا؟"

اس کے ساتھی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس کی سگی بڑے صاحب کے ساتھ جوانی کے کھیل کھیل رہی تھی اور یہ اُلو کا پٹھا شرما کر ٹائلٹ میں چھپ گیا تھا۔ کیوں بے ہے نا یہی بات؟"

اس کے ساتھی نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "تُو بیچ میں نہ بول' مجھے اس سے پوچھنے

دے۔"

دوسرے نے کہا۔ "تُو تو کسی سپاہی کی طرح مجھے ڈانٹ رہا ہے۔ کیا میں تیرا قیدی ہوں؟ اچھی بات ہے میں تیرے بیچ میں نہیں بولوں گا۔ تُو اپنا کام کر میں اپنا کام کرتا ہوں۔"

وہ عورت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آؤ میری جان! آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ بھوکے بھیڑیئے کی طرح آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "انکار کرو گی تو اپنے بڑے صاحب کے پاس پہنچ جاؤ گی' سیدھی طرح میرے پاس چلی آؤ۔"

اس نے آگے بڑھ کر اس کی گداز بانہوں کو تھام لیا لیکن اسے سینے سے نہ لگا سکا۔ اچانک اس کے ساتھی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ پہلے ہمیں وہ کام کرنا چاہئے جس سے ہم دوسروں کی نظروں میں مشکوک نہ رہیں۔ یہ بڑھی ہوئی داڑھیاں' یہ جیل کے کپڑے۔ پہلے ان سے پیچھا چھڑاؤ۔ اس عورت سے پوچھو کہ اس آفیسر کے کپڑے اور شیو کرنے کا سامان کہاں ہے۔"

اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تُو تو کباب میں ہڈی بن گیا ہے۔ آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ یہ فرنٹیئر میل ہے۔ کسی بہت بڑے اسٹیشن پر جا کر ہی رکے گی۔ تب تک یہ حسینہ بھی کام آ جائے گی' اس بوتل کی بچی کھچی شراب بھی حلق سے اتر جائے گی اور بڑے صاحب کے کپڑے بھی ہمارے بدن پر آ جائیں گے۔"

"بیوقوفوں کی طرح باتیں نہ کرو۔ یہ گاڑی کہیں سگنل نہ ہونے کی وجہ سے بھی رک سکتی ہے اور بڑے صاحب کے ملازم جو دوسرے کمپارٹمنٹ میں ہوں گے' یہاں آ سکتے ہیں۔ اس لئے تجھے سمجھاتا ہوں کہ پہلے ہمیں اپنی حفاظت اور سلامتی کا کام کرنا چاہئے۔"

اس کے ساتھی نے مایوسی سے کہا۔ "تُو کہتا تو ٹھیک ہے۔ یہ بات میری کھوپڑی سے نکل گئی تھی کہ ٹرین کہیں بھی رک سکتی ہے۔ سالا اپنا مقدر ہی خراب ہے۔ سامنے شراب ہے' شباب ہے' سب [illegible] دکھانے کے لئے ہیں' کھانے

کے لئے نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ تمام سامان کی تلاشی لینے لگا۔ دوسرے نے پلٹ کر اس ٹائلٹ سے نکلنے والے نوجوان سے کہا۔ "ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟"

وہ نوجوان ایک مجرم کی طرف کمپارٹمنٹ کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں ایک جونیئر کلرک ہوں' میری ایک بیوی ہے جو اپنے جہیز میں ایک دائمی بیماری لے کر آئی ہے۔ چار بچے ہیں جو پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود اچھی چیزیں کھانے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ پھر میری اپنی زندگی کی ضرورتیں بھی ہیں جو ایک جونیئر کلرک کی تنخواہ سے پوری نہیں ہوتیں۔"

قیدی نے اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ "ابے میرے سامنے اپنی زندگی کا دکھڑا کیوں رو رہا ہے' تجھے یہ باتیں اپنے افسروں سے کہنی چاہئیں۔"

"میں نے افسروں سے کہا تھا مگر رشوت کے بغیر ترقی نہیں ہوتی۔ میرے محکمے کے ایک سینئر کلرک نے جس کی تنخواہ چار سو روپے ہے اور جس کی اوپری آمدنی آٹھ سو روپے ہے' اس نے مجھے رشوت دینے کا آسان طریقہ سکھایا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا بڑا صاحب بڑا رنگین مزاج ہے' وہ جب بھی دورے پر جاتا ہے تو اپنے ساتھ فرسٹ کلاس چھوکری لے کر جاتا ہے۔ تم بھی کسی فرسٹ کلاس چھوکری کا تحفہ پیش کرو تو تمہاری ترقی ہو جائے گی۔"

دوسری طرف دوسرے قیدی نے تمام سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس میں سے اس نے دو جوڑے کپڑے نکالے' شیونگ کا سامان نکالا' کھانے کا کچھ سامان لیا۔ پھر ان سب کو ایک تھیلے میں رکھ کر دوبارہ اس حسینہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس عورت نے شاید سمجھ لیا تھا کہ شور مچانے سے اور ان درندوں سے ٹکرانے سے جان نہیں چھوٹے گی لہٰذا وہ بڑی خاموشی سے اس کی آغوش میں آ گئی۔

اسی وقت جونیئر کلرک نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے اسے چھوڑ دو۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ مجھے ترقی نہیں چاہئے۔ میں اس کی عزت کو کھلونا نہیں بنانا چاہتا۔"

اس حسینہ کو آغوش میں لینے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابے ایسا ہی شریف آدمی

ہے تو پھر اپنے بڑے صاحب کے سامنے اسے کھلونا کیوں بنا رہا تھا؟"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں نے کہا نا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں فرشتہ نہیں ہوں' انسان ہوں۔ غلطی کی ہے تو پچھتا بھی رہا ہوں۔ آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔ میری بیوی سینی ٹوریم میں ہے' میرے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ اس لئے میں بہت مجبور ہو کر' بہت مجبور ہو کر اپنی بہن کو یہاں لے آیا ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس کے سامنے کھڑے ہوئے قیدی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ذہن کی تاریکیوں سے ایک بھائی اپنی بہن کو چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ "ماریہ........ ماریہ........ ماریہ........"

ماریہ میں تیرے لئے جیل کی سلاخیں توڑ کر آ رہا ہوں میری بہن! جتنی تیزی سے اس کا ذہن چیخ رہا تھا' اتنی ہی تیزی سے ٹرین بھاگتی جا رہی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی ہر تال پر بہن کا نام بج رہا تھا۔ وہ جو سامنے نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے' وہ سیدھے ایک مجرم بھائی کے دل پر ٹپک رہے تھے۔ اس نے غراتے ہوئے پلٹ کر اس قیدی کو دیکھا جو ایک بھائی کی بہن کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا۔ اس حسینہ کی جگہ اسے ماریہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایکبارگی دوسرے قیدی پر چھلانگ لگائی۔ پھر اسے کھینچتا ہوا دور تک لے گیا۔ اس کے بعد اسے ایک گھونسہ مار کر زمین پر گراتے ہوئے بولا۔ "میں نے تجھے منع کیا تھا کہ اس عورت کو ہاتھ نہ لگانا۔"

مار کھانے والا جھلا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "سالے! یہ کیا تیری بہن ہے کہ تو منع کرتا ہے۔" یہ کہتے ہی پھر اس کے منہ پر ٹھوکر لگی۔ وہ پھر زمین پر آ گیا۔

ٹھوکر مارنے والے قیدی نے کہا۔ "ہاں' یہ میری بہن ہے۔ اگر ایک بھائی بے غیرت بن کر اپنی بہن کا سودا کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا بھائی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر تو میری غیرت کو آزمانا چاہتا ہے تو اس عورت کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ میں تیری آنکھیں نکال لوں گا۔ آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگا' میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تو بہت بڑا قاتل ہو' نامی گرامی بدمعاش ہو لیکن میرا نام بھی بابر ہے۔ اور بابر کا نام سن کر صرف قاتل اور مجرم ہی نہیں' قانون کے محافظ بھی تھراتے ہیں۔"

زمین پر گرا ہوا قیدی اپنی باچھوں سے رستے ہوئے خون کو پونچھتے ہوئے بپنے

مخاطب کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ زمین پر سے اٹھتا ہوا اور اس عورت کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا سوچنے لگا۔ بابر کا نام تو میں نے بھی سنا ہے' واقعی یہ ہے تو بڑا خطرناک' لیکن میں اس سے کمزور تو نہیں ہوں اور پھر ایک عورت کے سامنے مار کھا کر خاموش رہ جانا بڑی شرم کی بات ہے۔ ابھی اس نے میرا ہاتھ نہیں کھایا ہے' ذرا میں بھی اسے دو چار ہاتھ کا مزا چکھا دوں۔

یہ سوچتے ہی اس نے یک بیک اس پر حملہ کیا۔ بابر اس خوش فہمی میں مار کھا گیا کہ اس کا مخالف اس سے مرعوب ہو گیا ہے۔ اس نے بچ بچ بڑے کرارے ہاتھ جمائے تھے پھر اسے رگیدتا ہوا دروازے تک لے گیا تھا۔ اس کے بعد بابر بھی سنبھل گیا' اس نے بھی جوابی داؤ پیچ دکھائے۔ وہ دونوں بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے نہ ہار مان رہے تھے اور نہ ہی ہار جیت کا فیصلہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

بہت دیر بعد ان دونوں کو ذرا ہوش آیا کیونکہ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ وہ لڑائی جھگڑا بھول کر دروازے کے باہر دیکھنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے' ان کے راستے الگ الگ تھے لیکن خطرہ ایک تھا۔ قانون کے محافظوں کا خطرہ' جیل کی چار دیواری میں دوبارہ بھیج دیئے جانے کا اندیشہ۔ دونوں اس خیال سے کانپ گئے کہ کہیں پولیس والوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

جب ٹرین رک گئی تو ایک قیدی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بابر! مجھے یاد رکھنا' میرا نام شوکت ہے۔ شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا آسان ہے لیکن شوکت کی آغوش سے کسی حسینہ کو چھین لینا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔ آئندہ تو کبھی میرے سامنے آئے گا تو اپنی موت کے سامنے آئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ بابر نے اندھیرے کی جانب حقارت سے دیکھا پھر اس نے کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی اس نوجوان عورت اور اس کے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اور اب شرافت کی زندگی گزارو۔ ماں اور بہن کے مقدس رشتے کا بیوپار نہ کرو۔ اگر آئندہ میں نے تم دونوں کو اس روپ میں دیکھا تو وہیں تمہیں ذبح کر کے رکھ دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ بھی اپارٹمنٹ سے باہر تاریکی میں گم ہو گیا۔

☆======☆======☆

ماریہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سنگھار میں مصروف تھی۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا' قیمتی زیورات تھے اور پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ اب وہ اپنے ماضی کے متعلق نہیں سوچتی تھی' صرف اپنے خاوند مراد علی کے متعلق سوچتی تھی۔ خاوند کا تعلق صرف حال اور مستقبل سے ہوتا ہے' اس لئے وہ مراد کے ساتھ مستقبل کے سہانے سپنے دیکھتی رہتی تھی۔ البتہ جب وہ مراد کو پولیس انسپکٹر کی وردی میں دیکھتی تو اس وردی کی نسبت سے اسے اپنا مجرم بھائی یاد آ جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتی۔ "بھائی کیسا ہو گا؟ کیا اسے یاد کرتا ہو گا۔"

اسے بھائی کے ساتھ گزری ہوئی بچپن کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ پتہ نہیں وہ یادیں بھائی کو بھی تڑپاتی تھیں یا نہیں؟ ایک بہن کے لئے بھائی کا رشتہ کتنا قابل فخر ہوتا ہے مگر اس نے مراد کو فخر سے اب تک یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا بھائی ایک مجرم ہے جو بچپن سے لاپتہ ہے اور اس کی یاد اسے بہت تڑپاتی ہے۔

ماضی کی یادیں بڑی مکار ہوتی ہیں۔ کتنی ہیرا پھیری سے بھائی کی محبت کا سہارا لے کر پچھلی یادوں کے دریچے کھول دیتی ہیں اور وہ جسے دعویٰ تھا کہ ماضی کو بھول چکی ہے' وہ نادانستگی میں پھر اسی طرف لوٹ جاتی تھی۔

باہر موٹر سائیکل کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ مراد آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے چہرے کے میک اپ کو آخری ٹچ دینے لگی۔ وہ بڑی عجلت سے اپنے چہرے کی نوک پلک درست کرتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھی تو مراد اندر آ گیا۔ وہ پولیس انسپکٹر کی وردی میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ماریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ آپ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے ہیں۔"

"پولیس کی ڈیوٹی ہی ایسی ہے کہ تھکن اور پریشانیاں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔"

"میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ کے فرائض کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن آج سے پہلے آپ کبھی اتنے پریشان نظر نہیں آئے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ آج کوئی خاص

قسم کی پریشانی ہے۔"

"ہاں' تمہارا خیال درست ہے۔ پچھلی رات جلال آباد کی سنٹرل جیل سے دو قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بابر نام کا مجرم بہت ہی خطرناک ہے اور میری جان کا دشمن ہے۔"

بابر کا نام سنتے ہی ماریہ کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چند ساعتوں تک اس پر سکتہ سا طاری رہا۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے بھائی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے انکل کبھی کبھی اس کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور یہ بھی تاکید کرتے رہتے تھے۔ "بھائی کو میکے کی چہار دیواری میں یاد کرو اور سسرال کی وسیع دنیا میں جا کر بھول جاؤ کہ تم کسی کی بہن ہو۔"

انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا بھائی بابر ان دنوں جلال آباد کی سنٹرل جیل میں ہے۔ سکتے کے عالم میں وہ چند ساعتیں صدیوں کی طرح گزر گئیں۔ مراد نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم تو بالکل پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو۔ شاید یہ بات تمہیں خوفزدہ کر رہی ہے کہ بابر میری جان کا دشمن ہے۔ اونہہ' اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ کتنے ہی مجرم جو میرے ہاتھوں سے گرفتار ہوتے ہیں اور جن کے خلاف میں ٹھوس ثبوت فراہم کرتا ہوں' وہ سب میرے دشمن بن جاتے ہیں۔ میری ملازمت ہی ایسی ہے۔ آج سے پہلے میں کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا لیکن آج کی پریشانی محض تمہاری وجہ سے ہے۔"

وہ چونک کر مراد کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے خیال کے مطابق درست کہہ رہا تھا اور وہ اپنے طور پر سوچ رہی تھی کہ میرا بھائی میرے سہاگ کا دشمن ہے لہٰذا بھائی کے ناطے میں مراد کی پریشانیوں کا باعث بنوں گی۔ اس کے جی میں آیا کہ اپنے خاوند کے سامنے یہ حقیقت اگل دے کہ بابر جیسا خطرناک مجرم اس کا بھائی ہے اور جب بھائی کو معلوم ہوگا کہ آپ میرا سہاگ ہیں' آپ میری زندگی ہیں تو وہ بہن کی کلائیوں کی چوڑیاں نہیں توڑے گا۔

لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ بچپن ہی سے اس کے انکل اسے سمجھاتے آئے تھے۔ "ہماری عزت کا خیال کرو۔ تمہارے ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں نے تمہیں عزت و آبرو سے اپنے پاس رکھا ہے لیکن اس گھر میں کبھی تمہارے بھائی کا نام بھی آیا تو میری عزت مٹی

میں مل جائے گی۔"

برسوں کے سکھانے پڑھانے کا بڑا گہرا اثر تھا لہٰذا اس نے مراد کے سامنے اپنی کتابی زندگی کے اس ورق کو چھپا لیا جس پر اس کے بھائی کا نام لکھا ہوا تھا۔

مراد نے کہا۔ "تم شاید نہیں سمجھیں کہ میں تمہاری وجہ سے کس لئے پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میں تنہا تھا' کوئی ذمے داری میرے سر پر نہیں تھی۔ مگر اب تمہاری ذمے داریاں میرے سر پر ہیں۔ صرف ذمے داریاں ہی نہیں تمہاری وہ محبت بھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں یاد آتی رہتی ہے اور تڑپاتی رہتی ہے۔ ان سب باتوں نے مجھے کمزور بنا دیا ہے۔ سوچتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا کیا ہوگا؟"

ماریہ نے تڑپ کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور پریشان ہو کر بولی۔ "آپ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ آپ کو کچھ نہ ہوگا' میری محبت سچی ہے۔ اگر بابر اس دروازے پر آئے گا اور میری پیار بھری خوشگوار زندگی کو دیکھے گا تو خاموشی سے سر جھکا کر لوٹ جائے گا۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ "بعض اوقات تم بالکل ننھی سی بچیوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔ یہ چور' بدمعاش اور قاتل اپنے سینے میں فولاد کا دل رکھتے ہیں۔ بیوی' بیٹی یا بہن کی خوشیاں بھی انہیں موم نہیں بنا سکتیں۔"

ماریہ نے کہا۔ "آپ اپنے تجربات کے اعتبار سے درست کہتے ہیں لیکن آپ میری بات مان لیں۔ کسی طرح مجھے اس مفرور قیدی سے ملنے کا موقع دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔"

"ماریہ! ذرا عقل سے کام لو۔ اگر میں تمہیں اس سے ملنے کا موقع دے سکتا تو کیا اب تک اسے گرفتار نہ کر لیتا۔ کیا مفرور قیدی یہ بتا کر جاتے ہیں کہ وہ کس پتے پر ملاقات کریں گے؟"

ماریہ الجھ گئی۔ بھائی کے وجود کو چھپانے کے لئے پتہ نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں کئے جا رہی تھی۔ مراد نے اسے پیار سے چومتے ہوئے کہا۔ "میری پریشانیوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے۔ تمہارا دماغ اس وقت معقول باتیں سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ اس وقت تمہیں تفریح کی ضرورت ہے اور مجھے یاد ہے کہ آج ہم نے انگریزی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تم تو تیار ہو چکی ہو۔ اب مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں لباس بدل کر

تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ماریہ نے کہا۔ "پہلے آپ غسل کریں۔ غسل کرنے سے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ پھر گرما گرم چائے پلاؤں گی۔ سنا ہے چائے پینے سے فرحت اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم پکچر دیکھنے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ تفریح کے لئے باہر نکلے۔ بہت دیر تک سمندر کے ساحل پر ٹہلتے رہے۔ وہ ماحول بڑا رومان پرور تھا لیکن رومان پرور گفتگو کے دوران ان دونوں کے دماغ میں ایک کانٹا کھٹک رہا تھا۔ مراد کے دماغ میں ایک مفرور قیدی کی چبھن تھی جو اس کا جانی دشمن تھا اور ماریہ کے دماغ میں ایک مجرم بھائی کا رشتہ چبھ رہا تھا۔

جب وہ سنیما ہال میں آ کر بیٹھے تو ان کا خیال تھا کہ کم از کم دو گھنٹے تک انہیں تمام سوچ و فکر سے نجات مل جائے گی اور وہ فلمی کہانی کی خیالی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ جب فلم شروع ہوئی تو اسکرین کے مناظر بڑے بھیانک ثابت ہوئے۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ پولیس انسپکٹر نے مقابلے کے دوران ایک مجرم کے ہاتھ کو کلائی سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ مجرم اسی وقت مر گیا لیکن اس کے بعد کہانی نے ایک بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ مجرم کے مرنے کے بعد بھی اس کا کٹا ہوا ہاتھ زندہ رہا۔ اب وہ ہاتھ اپنی انگلیوں کے بل پر آہستہ آہستہ زمین پر رینگتا تھا اور پولیس انسپکٹر کا پیچھا کرتا تھا۔

اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہی ماریہ کی جیسے جان نکلنے لگی تھی لیکن خوف و دہشت ابھی انتہا کو نہیں پہنچی تھی۔ ابھی وہ رینگتا ہوا ہاتھ نگاہوں کے سامنے ہی تھا اور جو ہاتھ سامنے سے آئے اس سے ماریہ خوفزدہ نہیں ہوتی تھی البتہ کسی بہت بڑے خطرے کے پیش نظر اس نے احتیاطاً مراد کے بازو کو تھام لیا تھا۔

فلم کا ہر منظر ایسا تھا کہ وہ ہر منظر کے نکتہ عروج پر کانپ کانپ جاتی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے لرزتے ہوئے لہجے میں مراد سے التجا کی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز یہاں سے چلئے۔ یہ تفریح عذابِ جاں بن گئی ہے۔"

مراد نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی ننھی سی بچی ہو۔ بھئی یہ تو محض ایک فلم ہے، سچ مچ کا واقعہ تو نہیں ہے کہ وہ ہاتھ تمہارے پاس چلا

آئے گا۔ میری جان! تم پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ تمہیں دلیر بن کر رہنا چاہئے۔"

اس نے پھر التجا نہیں کی۔ دلیر بننے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ ہاتھ کہانی کے کلائمکس تک پہنچ رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ دہشت انگیز بنتا جا رہا تھا۔ اس ہاتھ نے چشم تصور میں اس کی ماں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور وہ چھ سال کی بچی سہمی ہوئی اپنے بستر پر سکڑی سمٹی سی پڑی ہوئی تھی اور وہ ہاتھ اس کی ماں کی لاش پر سے گزرنے کے بعد اس کی طرف آ رہا تھا اور پیچھے سے آ رہا تھا کیونکہ اس نے ہال کے اندھیرے میں بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ کی کلائی کو اپنی گردن سے مس ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر وہ ہاتھ اس کے دائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے رخسار کو چھوتا ہوا اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی کا پیالہ بن گیا۔ اس نے ایک زور کی چیخ ماری پھر اسے ہوش نہ رہا کہ اس کی چیخ نے سنیما ہال میں کیسی کھلبلی مچا دی تھی اور مراد کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ ہال کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی پیاری بیوی کو چومنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆======☆======☆

بابر صبح سے شام تک جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ شام کے قریب وہ ایک بستی میں پہنچ گیا۔ بستی میں داخل ہونے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کے فرار ہونے کی خبر اس علاقے کے تھانے تک پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ وہ بستی چھوٹی سی تھی۔ سو ڈیڑھ سو کچے پکے مکانات پر مشتمل تھی۔ بستی کے سرے پر جو مکان تھا وہ کھیتوں کی طرف دوسرے مکانات سے ذرا دور ہٹ کر تھا۔ کھلیان میں سوکھی زرد گھاس پر اونچا سا ایک پہاڑی نما ڈھیر تھا۔ وہ چھپتا چھپاتا اس گھاس کی بلندی تک پہنچ گیا۔ اس نے سوکھی ہوئی زرد گھاس کے تنکوں کو اپنے اوپر ڈال لیا اور ایک ذرا سا سر نکال کر بستی کا جائزہ لینے لگا۔ دور بہت دور جہاں بستی کی گھنی آبادی تھی وہاں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لئے لوگ اپنے مکانوں کی چار دیواری تک محدود ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھ یا سات برس کی لڑکی بستی کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اچانک اسے ماریہ یاد آ گئی۔ آخری بار جب اس نے ماریہ کو دیکھا تھا تو وہ چھ برس کی تھی اور وہ بیس برس کا جوان تھا۔ زندگی کے چھ برس بھائی بہن نے کتنی محبت سے گزارے تھے۔ اس محبت کا ایک ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

تقدیر کتنی ظالم ہوتی ہے۔ صرف چھ برس کے لئے ننھی سی معصوم بہن کی محبت دی پھر اسے عمر بھر کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا۔ کاش وہ مجرم بننے سے پہلے یہ سوچ لیتا کہ بہن ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گی اور اس کی محبت کے بغیر چچا اور چچی کی محتاج بن کر اپنی زندگی گزارے گی۔

لیکن وہ قاتل بننے پر مجبور تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ڈیڈی کو شراب نوشی

نے بے حد کمزور بنا دیا تھا۔ ڈیڈی وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے تھے اور ممی وقت گزرنے کے بعد بھی جوان تھیں اور ڈیڈی کا ایک عیاش دوست شمشاد علی اس کی ماں پر بری نظر رکھتا تھا۔ وہ اس رات جاگ رہا تھا جب شمشاد علی چوروں کی طرح اس کی ماں کی خواب گاہ میں کھڑکی کے راستے داخل ہوا تھا۔ اس نے شمشاد علی کو خواب گاہ میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا' اسے واپس بھاگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے للکارنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کی ماں بدنام ہو جاتی۔ وہ ماں کی موت پر بظاہر خاموش رہا لیکن انتقام کی آگ اس کے اندر لاوے کی طرح پکتی رہی۔ دوسری رات اس نے شمشاد علی کی خواب گاہ میں جا کر اسے قتل کر دیا۔ انتقام کی آگ تو سرد پڑ گئی لیکن بہن کا بچپن اور اس کی تنہائی اسے ڈسنے لگی۔ ایک سال کے بعد اس کے چچا نے آ کر بتایا کہ اس کے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ ماریہ کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔ وہ وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن ہو گیا لیکن دس سال بعد جب اسے پتہ چلا کہ اس کی بہن جوان ہو چکی ہے اور بیاہنے کے قابل ہو گئی ہے تو وہ بہن کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ گیا۔ اس کے چچا نے کہا تھا۔

"تمہاری محبت اس کی زندگی نہیں سنوار سکتی۔ تم نے جو قتل کیا ہے اس جرم کا داغ تمہاری بہن کی پیشانی پر اس قدر نمایاں ہو گیا ہے کہ اب میں جلال آباد چھوڑ کر حسن آباد جا رہا ہوں۔ یہاں اس کا رشتہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک قاتل کی بہن ہے۔ تم نے دس سال کے عرصے میں کئی بار جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تم کبھی فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ تو ماریہ کی طرف رخ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کو بتانا کہ تم اس کے بھائی ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بہن سہاگن بنے تو ایک بار پھر قاتل بن کر بھائی کے رشتے کو قتل کر دو۔ اس کے لئے مر جاؤ۔ بس میں یہی کہنے آیا تھا۔"

یہ کہہ کر اس کے چچا جانے لگے۔ بابر نے جیل کی سلاخوں سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "ٹھہریئے! میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اجنبی بن کر ہی اسے ایک بار دیکھ لوں؟"

اس کے چچا نے سختی سے کہا۔ "نہیں۔ میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ تم اس کے لئے مر جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے مر جائے۔ کیونکہ کوئی بھی عورت خواہ وہ

بیٹی ہو یا بہن' اپنے سہاگ پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتی اور میں تمہاری اطلاع کے لئے کہہ دوں کہ اس کا رشتہ انسپکٹر مراد علی سے ہونے والا ہے جس نے تمہیں گرفتار کیا اور جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ جیل کی سلاخوں سے باہر آگیا تو اسے ضرور قتل کرو گا۔ اب تم ان سلاخوں کے پیچھے سوچتے رہو' کیا اپنی بہن کا سہاگ اجاڑ سکتے ہو؟"

وہ سوچتا رہ گیا اور اس کے چچا چلے گئے۔ وہ چند دنوں تک بڑی کشمکش میں رہا۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی معصوم بہن کے سہاگ کا دشمن بن جاتا۔ پھر جس دن اسے بہن کی شادی کی اطلاع ملی' اس نے اسی دن انسپکٹر مراد علی کو معاف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب جیل کی چار دیواری میں زندہ نہیں رہے گا اور یہاں سے فرار ہو کر باقی زندگی کسی دوسرے ملک میں گزارے گا۔ یہاں رہ کر بہن کی یاد تڑپاتی رہے گی مگر یہاں سے جانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بہن کو دیکھے گا۔ ایک بار اس کی زبان سے اپنا نام سنے گا۔ پتہ نہیں بہن کی زبان میں کیسی مٹھاس ہوتی ہے کہ نام کیسا ہی ہو' اس زبان کی ادائیگی سے خوبصورت بن جاتا ہے۔ بابر کو مجرم کہنے والوں کی دنیا میں صرف ایک ہی تو زبان تھی جو اسے بھائی کہہ سکتی تھی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر جیل کی چار دیواری سے لوٹ آیا اور گھاس کے ڈھیر میں لیٹے ہی لیٹے پھر اس چھ سالہ لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اب وہ لڑکی قریب آگئی تھی۔ بابر بے خوف و خطر گھاس کے ڈھیر سے باہر آگیا۔ وہ لڑکی ٹھٹک کر بولی۔ "کون ہو تم؟"

بابر نے آرام سے دونوں پاؤں کو گھاس پر پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بھول گئیں ماریہ کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔"

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرا نام ماریہ نہیں مریم ہے اور تم میرے بھائی کیسے ہو سکتے ہو؟ تم اِتنے بڑے ہو' تمہاری داڑھی بھی کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ تم تو بوڑھے ہو' تم میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔ میرا بھائی تو اتنا بڑا ہے' جوان ہے اور لام پر گیا ہوا ہے۔"

بابر نے کہا۔ "جب ماریہ چھ برس کی تھی تو میں بھی تمہارے بھائی کی طرح جوان تھا اور تمہارے بھائی کی طرح زندگی کی جنگ لڑنے چلا گیا تھا۔ جب تمہارا بھائی لام سے واپس آئے گا تو وہ بھی میری طرح بوڑھا نظر آئے گا۔ دیکھو تم میری ماریہ بن جاؤ' میں تمہارا بھائی بن جاتا ہوں۔ تم ابھی بچی ہو' تم نہیں سمجھو گی کہ اس طرح دورِ ماضی میں بھائی بہن

کی محبت کے گزرے ہوئے لمحات پھر ہماری مٹھی میں آجائیں گے۔"

لڑکی نے معصومیت سے ہاتھ نچا کر کہا۔ "پتہ نہیں تم کیسی ٹیڑھی میڑھی باتیں کرتے ہو۔ میرا بھائی بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ اس لئے میں تمہیں بھائی کہتی ہوں۔ آؤ اب میرے ساتھ گھر چلو۔ یہ میرا گھر ہے' یہاں میرے بوڑھے بابا رہتے ہیں۔ میں اپنے بابا کے ساتھ روز اپنے بھائی کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور بچی کا نازک سا ہاتھ تھام کر اس کے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ مریم نے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تک بتی نہیں جلائی۔ گھر میں اندھیرا ہو تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مگر ابھی تو تم میرے ساتھ ہو نا.......... مجھے ڈرنا نہیں چاہئے۔"

بابر نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہاں' تمہیں نہیں ڈرنا چاہئے۔ میری بہن ماریہ بہت دلیر ہے۔ چونکہ تم میری بہن بن گئی ہو' اس لئے تمہیں بھی دلیر بننا چاہئے۔"

وہ مکان کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ مریم نے اونچی آواز میں کہا۔ "بابا' تم بتی کیوں نہیں جلائی؟ دروازہ کھولو۔ دیکھو میرا ایک بھائی واپس آگیا ہے۔"

مکان کی تاریکی سے ایک بوڑھی اور جذبات سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "میرا بیٹا.......... میرا بیٹا شاید لام سے واپس آگیا ہے۔ مجھے جانے.........."

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی آواز اندھیرے میں گھٹ گئی۔ یوں لگا جیسے بوڑھے کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی سرگوشیاں سنائی دیں۔

بابر جیسا مجرم ایک دم سے محتاط ہو گیا۔ اس نے مریم کے کان کے پاس منہ لے جا کر بڑی آہستگی سے پوچھا۔ "کیا تمہارے بابا کے علاوہ اور بھی کوئی اس مکان میں رہتا ہے؟"

مریم نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی وقت اندر سے بوڑھے کی آواز آئی۔ "بیٹی اپنے بھائی سے کہو' ابھی اندر نہ آئے۔ اندر اندھیرا ہے اور.......... اور خطرہ.........."

پھر اس کی آواز گھٹ گئی۔ آواز بالکل دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ بابر نے سمجھ لیا کہ بوڑھے کی آواز کو دبانے والا بھی دروازے کے قریب ہی ہے۔ اس نے مریم کو

اشارے سے کہا کہ وہ برآمدے کے آخری سرے پر چلی جائے۔ وہ دوڑتی ہوئی چلی گ
اسی وقت بابر نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ دروازہ یکبارگی کھلا اور اس
پیچھے کھڑے ہونے والے اس کی زد میں آکر دور تک لڑکھڑاتے چلے گئے۔ بابر نے اندر
کر دروازے کو بند کر دیا۔

اندر گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بابر کمرے کے حدود اربعہ
واقف نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ آگے بڑھتے
نہ جانے کس سے ٹکرا گیا' دوست سے یا دشمن سے.........؟ لیکن وہ جو اندھیرے میں
تھے وہ کسی قدر تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئے تھے لہٰذا بابر اندھے پن میں مار کھا گیا
اچانک ہی کسی کا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اسے اندھیرے میں تارے نظر آ گئے۔ اس
حماقت کا احساس ہوتے ہی کہ اسے دروازے پر جم کر نہیں رہنا چاہئے وہ فوراً ہی ہٹ گیا
لیکن دوسری جگہ پہنچتے ہی دوسرا گھونسہ اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ تکلیف کی شدت سے
کراہتے ہوئے ذرا جھک گیا۔ جھکتے ہی تیسرا گھونسہ اس کے منہ پر آیا لیکن اس بار اس نے
مارنے والا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔

"تم دیر سے اس کمرے میں ہو' اس لئے اندھیرے میں دیکھ لیتے ہو لیکن اب میں
تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہم اسی طرح لپٹ کر ایک دوسرے کی خیریت پوچھ لیں گے۔"

دوسرا بھی اس سے لپٹ کر اسے ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری آواز
تو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے' کون ہو تم؟"

"ہوں۔" بابر نے غراتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے تمہاری
آواز سے پہچان لیا کہ تم شوکت ہو۔"

"اچھا' تو تم بابر ہو۔"

وہ ایک دم سے بپھر کر اسے پوری قوت سے رگیدنے لگا۔ بابر تھوڑی دیر تک
سنبھل نہ سکا۔ اس درندے کے بہاؤ میں آکر پیچھے ہی پیچھے لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے
ٹکرا گیا۔ تب اسے سنبھلنے کا موقع ملا۔ اتنی دیر میں اب وہ بھی اندھیرے میں دیکھنے کے
قابل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سر سے شوکت کے سر پر ایک زوردار ٹکر ماری۔ شوکت کا
دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی سر کی دوسری ٹکر اس کی ناک پر لگی۔

وہ ایسی زبردست ٹکر تھی کہ شوکت بلبلا کر رہ گیا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہنے
لگی۔ تب بابر نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ پے در پے کتنے ہی گھونسے ناک' منہ اور
ٹھوڑی پر پڑتے رہے۔ شوکت پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر اپنے پاؤں پر کھڑا نہ
رہ سکا' چکرا کر کسی چیز سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لئے زمین پر گر پڑا۔ تب بابر نے کہا۔

"مریم آجاؤ۔ اپنے بابا سے کہو کہ بتی جلائے۔"

مریم دوڑتی ہوئی دروازے پر آگئی۔ پھر اندھیرے میں ماچس کی تیلی روشن ہوئی۔
بوڑھے بابا نے ایک لیمپ کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ "اس بدمعاش نے مجھے گھر میں
روشنی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پتہ چلتا ہے کہ جیل سے بھاگا ہوا
قیدی ہے۔"

بوڑھے نے یہ کہہ کر لیمپ کی روشنی میں بابر کو دیکھا پھر ذرا سہم کر بولا۔
"م.......... مگر تمہارے کپڑے بھی ویسے ہی ہیں۔ کیا تم بھی جیل سے بھاگے ہوئے قیدی
ہو؟" بابر نے سر ہلا کر کہا۔

"جی ہاں۔ بدقسمتی سے میں بھی ایک مجرم ہوں اور جیل کی سلاخیں توڑ کر یہاں تک
پہنچا ہوں لیکن آپ مجھ سے خوفزدہ نہ ہوں۔ مریم نے مجھے بھائی بنایا ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹا
سمجھ کر ایک رات کے لئے پناہ دے سکیں گے؟"

بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ "تم تو بڑی شرافت سے پناہ مانگ رہے ہو لیکن یہ
بدمعاش جس نے اپنا نام شوکت بتایا ہے' یہ جبراً یہاں پناہ بھی لینا چاہتا تھا اور وہ زیورات
بھی جو میں مریم کی شادی کے لئے ابھی سے جمع کر رہا ہوں' چھین کر لے جانا چاہ رہا تھا۔"

بابر نے پلٹ کر شوکت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر
تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے فرش پر سے اٹھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک کرسی کا
سہارا لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "بابر' میں غلطی پر تھا۔ مجھے تم سے اس لئے نہیں
لڑنا چاہئے تھا کہ ہم دونوں مجرم ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد سے قانون کو دھوکہ
دے سکتے ہیں اور اس ملک سے باہر جا سکتے ہیں اور اس کے لئے آج رات ہمیں پناہ کی
ضرورت ہے اور آئندہ پیسوں کی ضرورت ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک میز کی طرف گیا۔
میز پر کپڑے کی ننھی سی گٹھڑی رکھی تھی۔ اس گٹھڑی کو اس نے اٹھا کر بابر کو دکھاتے

ہوئے کہا۔ ''دیکھو! مریم کے سارے زیورات میں نے باندھ لئے ہیں۔ ان کی مالیت کم کم پانچ ہزار روپے ہے۔ سرحد تک پہنچنے کے لئے یہ روپیہ کافی ہے۔ ہم آج رات دوستوں کی طرح یہاں رہیں گے اور صبح یہ زیورات لے کر چلے جائیں گے۔''

بابر نے گٹھڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ' یہ گٹھڑی مجھے دے دو۔''

شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم دوست بن گئے ہیں تو یہ زیورات کس کے پاس رہیں' کیا فرق پڑتا ہے' یہ لے' اسے تو ہی رکھ لے۔''

یہ کہہ کر اس نے گٹھڑی بابر کی طرف اچھال دی۔ بابر نے اسے ہاتھوں میں روکتے ہوئے کہا۔

''ہم چور' بدمعاش اور قاتل ہیں لیکن کیا تجھے نہیں معلوم کہ چور اپنے گھر میں کبھی چوری نہیں کرتا اور یہ میرا گھر ہے' اس لئے کہ ایک معصوم بچی مجھے بھائی بنا کر یہاں لائی ہے۔ اگر تو دوستی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو تو بھی اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر ان زیورات کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔''

اس کی بات سنتے ہی شوکت کے تیور بگڑ گئے۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جہاں پہنچتا ہے' عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی بہن بنا کر میرا نقصان کرتا ہے۔ میں یہ نقصان برداشت نہیں کروں گا۔ ابھی میں دھوکے میں مار کھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تجھ سے کمزور ہوں۔ اگر تو بھلائی چاہتا ہے تو وہ گٹھڑی مجھے واپس کر دے۔''

بابر نے کہا۔ ''یہ زیورات ایک بہن کے سہاگ کی آبرو ہیں۔ میں اپنی بہن ماریہ کی شادی میں اسے کچھ نہیں دے سکا تھا۔ پھر دوسری بہن کے زیورات چھین کر تجھے کیسے دے دوں؟''

اس کی بات ختم ہوتے ہی شوکت نے یکبارگی اچھل کر اس کے سینے پر لات ماری۔ بابر کو اس حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے پیچھے ایک کرسی پر الٹ پڑا۔ شوکت بھاگتا ہوا مریم کی طرف پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس بچی کو اٹھایا اور اس کی چھوٹی سی گردن میں اپنے دوسرے بازو کا پھندا ڈال کر کہا۔ ''بابر! تو جہاں ہے وہیں رک جا۔ اگر تو مجھ پر حملہ کرے گا تو اس سے پہلے ہی میں تیری اس منہ بولی بہن کو اتنی سختی سے دباؤں گا

اس کا دم نکل جائے گا۔''

بابر ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ بوڑھے نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں' میری بچی کو نہ مارو۔ میرے بڑھاپے کی یہی ایک معصوم ساتھی ہے۔ اس کے بدلے تم زیورات لے لو اور جو کچھ یہاں سے سمیٹ کر لے جانا چاہتے ہو' لے جاؤ۔''

بابر مریم کی جانب بے بسی سے دیکھتا رہا۔ شوکت نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''جہاں جاتا ہے کسی نہ کسی کو بہن بنا کر میرا کباڑا کرتا ہے۔ دیکھ! تیرے ہاتھ میں زیورات ہیں اور میرے شکنجے میں تیری بہن۔ زیورات اپنے قبضے میں رکھے گا تو بہن کی ڈولی کبھی نہ اٹھے گی' تجھے اس کا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا۔ فیصلہ کر لے' بہن عزیز ہے یا زیورات۔''

مریم کی گردن اس کے بازو کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ دیدے پھیلائے بابر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''تو جیت گیا' میں ہار گیا۔ یہ زیورات لے اور مریم کو چھوڑ دے لیکن کیا ضمانت ہے کہ زیورات لینے کے بعد تو مریم کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟''

شوکت نے کہا۔ ''میں بھلا کیا ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اس بچی کی جان لے کر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ البتہ یہ زیورات مجھے سرحد پار پہنچا دیں گے۔ میں دروازے کے باہر جاتا ہوں تو وہ گٹھڑی میری طرف پھینک دے۔ گٹھڑی ملتے ہی میں مریم کو کمرے میں چھوڑ کر دروازے کو باہر سے بند کر کے چلا جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ دو دشمنوں کے درمیان تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ قائم ہو گیا۔ بابر نے زیورات کی گٹھڑی اس کی طرف اس انداز میں اچھالی کہ وہ اس کے سر پر سے ہوتی ہوئی اس کے پیچھے جا گری۔ شوکت ذرا دیر کے لئے بھک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر سے گزرنے والی گٹھڑی کو دیکھا اور ایک ہاتھ اٹھا کر اسے لپکنے کی کوشش کی پھر اسی دھن میں گٹھڑی کی طرف پلٹ گیا۔ بابر کے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ جب شوکت گٹھڑی اٹھانے کے لئے زمین پر جھکا تو اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ ڈنڈا جس نے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بابر نے اسے اتنا موقع نہیں دیا۔ ٹوٹے ہوئے ڈنڈے سے ہی اس کی مرمت کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے

بے ہوش ہو کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ پھر وہ اسے کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لا بوڑھے بابا سے ایک مضبوط رسی طلب کی اور بڑی مضبوطی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے فرش پر چھوڑ دیا۔

مریم باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر بولی۔ "تم کتنے بہادر ہو! میرا بھائی بھی بڑا بہادر ہے۔ اب تم میرے پاس ہی رہنا۔ جب بہن بنایا ہے تو چھوڑ کر نہ جانا۔"

بابر نے اسے میز پر بٹھا دیا اور کرسی پکڑتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر اپنی ایک بہن کی محبت کا قرض ہے۔ اس قرض کی ادائیگی کے لئے میں ماریہ کے پاس جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔"

مریم نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک بہن ہے۔ اس کا نام ماریہ ہے۔ کیا تم مجھے ماریہ کے پاس لے چلو گے؟"

"وہ بہت دور رہتی ہے۔ دور نہ بھی ہو تب بھی میری پہنچ سے دور ہے کیونکہ اس کی زندگی کا محافظ ایک پولیس انسپکٹر ہے اور میں ایک مجرم بھائی ہوں۔ پتہ نہیں اپنی بہن تک کیسے پہنچوں گا۔ جب میں راستہ نہیں جانتا تو تمہیں کس طرح وہاں تک لے جا سکتا ہوں۔"

اتنے میں بوڑھے نے روٹی اور سالن کی پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! یہ اسی طرح تمہارا سر کھاتی رہے گی۔ تمہارے کھانے کی اسے فکر نہیں ہے۔ ویسے یہ معصوم کیا جانے کہ جیل سے بھاگنے والے کس طرح بھوکے پیاسے بھاگتے ہیں۔"

بابر واقعی بھوکا تھا۔ بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے دوران بوڑھے نے کہا۔ "تم نے مجھ بوڑھے پر جو احسان کیا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو لیکن میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجرم کیسے بنے کیونکہ بعض اوقات حالات ایک شریف آدمی کو جرائم کی پستی میں پھینک دیتے ہیں۔ ویسے تم نے یہ بہت برا کیا۔ قانون کے خلاف تمہیں جیل سے فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

بابر نے جواب دیا۔ "میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ آپ بتایئے کیا میں اسی لئے پیدا

ہوا ہوں کہ ساری زندگی ایک پنجرے میں بند رہ کر گزار دوں۔ مانا کہ مجھ سے ایک قتل ہوا ہے لیکن سزا دینے والوں کا فرض تھا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ان حالات کو پیشِ نظر رکھتے' جنہوں نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ انہوں نے یہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں اصلاح کے قابل تھا۔ انہوں نے میرے ہنستے کھیلتے مستقبل کو جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جیل کی تنہائی میں ہر لمحہ اپنی بہن کی یاد مجھے تڑپاتی رہی۔ میں سوچتا رہا کہ بہن اس جیل کے باہر ہے' مجھ سے زیادہ دور نہیں لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا' اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ محبت کی یہ محرومیاں مجھے مارے ڈالتی تھیں۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا' مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں جیل کی سلاخیں توڑ کر باہر آگیا۔ لوگ دولت کی ہوس میں یا کسی عورت کے عشق میں قانون سے کھیلتے ہیں لیکن مجھے تو ایک بہن کی پاکیزہ محبت یہاں تک لے آئی ہے۔ بابا! تم صرف میرے جرم کو دیکھتے ہو' میرے پیار کی پاکیزگی کو بھی تو دیکھو۔"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں بیٹا! ہم محبت کی نظر سے دیکھیں تو قانون بہت ہی ظالم نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ہم قانون کا احترام کرنے کے باوجود محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی دیکھو نا کہ میرا فرض تو یہ تھا کہ میں اس علاقے کے تھانے سے مدد لیتا اور تمہیں قانون کے حوالے کر دیتا لیکن اس معصوم مریم کے وجود میں ہم دونوں کی محبت مشترک تھی۔ تم نے محبت سے مریم کی جان بچائی' اس کے زیورات بچائے' کیا میں تمہیں قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا؟ ایسے ہی مقام پر پہنچ کر محبت افضل ہو جاتی ہے اور قانون کانٹے کی طرح چبھنے لگتا ہے۔ بہرحال اب تم یہ بتاؤ کہ کہاں جاؤ گے؟"

بابر نے جواب دیا۔ "میں جنگلوں میں بھٹکتا ہوا اس بستی کی طرف آگیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں سے حسن آباد کتنی دور ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "حسن آباد تو یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے کیا تمہاری بہن اسی شہر میں رہتی ہے؟"

"ہاں۔ اسی شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں جا کر معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کس محلے میں رہتی ہے۔ میں دن کے اجالے میں نہیں جا سکتا' رات کی تاریکی ہی سازگار رہے گی۔ سوچتا ہوں جب پندرہ میل کا فاصلہ ہے تو ابھی کیوں نہ چلا جاؤں۔ کیا آپ مجھے پہنچنے

لئے کوئی معقول سالباس دے سکتے ہیں؟"

"ہاں' ضرور دے سکتا ہوں لیکن تم بہت زیادہ تھکے ہوئے ہو۔ میرا مشورہ ہے آج رات یہاں آرام کرلو۔ کل تمام دن میں تمہیں چھپا کر رکھوں گا۔ رات ہوتے ہی حسن آباد چلے جانا۔"

بابر نے کہا۔ "نہیں بابا! منزل کے قریب پہنچ کر صبر نہیں ہوتا۔ میری ماریہ مجھ سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔ میرا جانا ہی بہتر ہے۔"

بوڑھا ایک صندوق کے پاس گیا اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ "یہاں آکر دیکھو اس صندوق میں میرے جوان بیٹے کے کپڑے ہیں جو تمہیں پسند ہوں' پہن لو۔"

بابر نے صندوق کے پاس آکر ایک لباس نکالا اور اسے پہننے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بوڑھے نے پوچھا۔ "یہ بدمعاش ابھی تم سے سرحد پار کرنے کی بات کر رہا تھا' کیا تم بھی اس ملک سے باہر چلے جاؤ گے؟"

بابر نے دوسرے کمرے سے جواب دیا۔ "ہاں۔ آزادی کی سانس لینے کے لئے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ میں بہن کے ساتھ اس لئے نہیں رہ سکتا کہ میری بدقسمتی سے اس بہن کی خوش قسمتی سے اس کا خاوند ایک پولیس انسپکٹر ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ مجرم قانون کے سائے میں اپنی بہن سے محبت کیسے کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر دل دکھتا ہے کہ میں نہیں بہن کو جی بھر کر دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔"

وہ لباس پہن کر دوسرے کمرے سے نکل آیا۔ شوکت اب تک بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد رسیوں کی بندش سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ بابر نے کہا۔ "بابا! تم اور مریم میرے ساتھ چلو۔ مکان کو باہر سے مقفل کر دو۔ میں حسن آباد کی طرف چلا جاؤں گا۔ تم تھانے میں جاکر یہ بیان دینا کہ دو مفرور قیدی یکے بعد دیگرے تمہارے مکان میں داخل ہوئے تھے ا بیٹی کے زیورات کے لئے آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔ جھگڑے کے نتیجے میں ایک نے دوسرے کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پھر اسے رسی سے باندھ کر میرے مکان کے ایک کمرے میں چھوڑ گیا اور میری بیٹی کے زیورات لے کر بھاگ گیا۔"

بوڑھے نے چونک کر کہا۔ "یہ کیا کہتے ہو بیٹا! کیا میں تم پر چوری کا جھوٹا الزام لگاؤں

گا؟"

بابر نے کہا۔ "مجھ پر جھوٹا الزام لگانا ہی ہوگا۔ اگر تم نے میری ہمدردی اور محبت میں میری حمایت کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ چونکہ تم اور مریم مجھ سے متاثر ہو' اس لئے تم نے مجھے فرار ہونے کا موقع دیا ہے اور صرف ایک ہی مفرور قیدی کو قانون کے حوالے کر رہے ہو۔"

بوڑھے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ مریم کی زندگی اور اس کے زیورات کی حفاظت کی ہے۔ یہ زیورات یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ پھر میں کس زبان سے تمہیں چور کہوں۔"

"مجبوری سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شوکت گرفتار ہونے کے بعد بیان دے گا کہ زیورات کے لئے ہمارا جھگڑا ہوا تھا اور تم بیان دو گے کہ میں تم سے زیورات چھین کر نہیں لے گیا تو پھر بات بگڑ جائے گی۔ پولیس والے تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تفتیش کے دوران وہ تمہیں حراست میں رکھیں۔ ایسی صورت میں ننھی مریم یہاں تنہا رہ جائے گی۔ کیا تم اپنی معصوم بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ سکتے ہو؟ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ فی الحال مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔ میں تو پہلے ہی بے شمار الزامات کا نشانہ بنا ہوا ہوں اور ایک عادی مجرم کہلاتا ہوں۔ اگر الزامات کے سمندر میں تم جھوٹ کا ایک چھوٹا سا کنکر پھینک دو گے تو کوئی ہلچل نہیں مچے گی۔ ہاں یہ جھوٹ بول کر بھی تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو۔"

"وہ کیا؟" بوڑھے نے جلدی سے پوچھا۔

بابر نے کہا۔ "تم اپنے بیان میں یہ نہ لکھوانا کہ بابر حسن آباد کی طرف گیا ہے۔ مجھے پولیس کے تعاقب سے بچانا چاہتے ہو تو انہیں کسی دوسری سمت لگا دینا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مریم کو ساتھ لے کر باہر آ گئے۔ بوڑھے نے مکان کے تمام دروازوں کو مقفل کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لو۔ میرے پاس اتنے ہی نقد روپے ہیں۔ شاید یہ تمہارے کام آ جائیں۔"

"نہیں بابا! صرف پندرہ میل کا سفر ہے۔ میں پیسوں کے بغیر بھی وہاں تک پہنچ سکتا

ہوں۔"

وہ انکار کرتا رہا۔ بوڑھا بابا اصرار کرتا رہا کہ وہ باپ بن کر اسے روپے دے رہا اسے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بے حد اصرار پر بابر نے اس رقم کو لیتے ہوئے ک "تم ٹھیک کہتے ہو۔ باپ محبت سے دے تو بیٹے کو انکار نہیں کرنا چاہئے اور بھائی محبت دے تو بہن کو بھی انکار نہیں کرنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر اس نے مریم کو پکڑا' اس کی ہتھیلی کھولی اور اس پر ایک ہزار روپے دیئے۔ مریم نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "بھائی میں ان پیسوں کی ایک ب خوبصورت بولنے والی گڑیا خریدوں گی۔"

بابر نے مریم کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوم لیا۔ پھر اسے فضا میں اسی طرح بل رکھتے ہوئے بولا۔ "تو میری بولنے والی گڑیا ہے۔ یہ معصوم رشتے صاف ستھری محبت ا پاکیزہ جذبے جیل کی چاردیواری میں نہیں مل سکتے تھے۔ میں ایک آزاد پنچھی ہوا آزادی سے اڑتا ہوا اپنی ماریہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

بوڑھے نے کہا۔ "خدا تمہیں ضرور منزل تک پہنچائے گا۔"

"بابا! عزم سفر ہو تو منزل مل جاتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ جب تم خانہ کع کی طرف جاؤ' یا مسجد کی طرف جاؤ یا کسی بھی مقدس مقام تک پہنچنے کا عزم کرو تو را میں نیکیاں کرتے جاؤ۔ میں بھی بہن کے مقدس دیار کی طرف جا رہا ہوں۔ میں بھی نیکیا کرتا جا رہا ہوں اور دریا میں ڈالتا جا رہا ہوں۔ آج رات میں ضرور اپنی بہن تک پہ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر مریم کو چوما پھر اسے بابا کی گود میں دے کر حس آباد کے راستے پر جانے لگا۔

بوڑھا بابا اسے سمجھا رہا تھا۔ بابر کو دور تک اس کی آواز بتا رہی تھی کہ اسے حس آباد پہنچنے کے لئے کن راستوں سے گزرنا چاہئے پھر بابا اور مریم دور رہ گئے اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب اس کے جسم پر جیل کے کپڑے نہیں تھے۔ ایک سادہ سا لباس تھا۔ اس کے باوجود وہ چہرے سے خطرناک نظر آتا تھا کیونکہ جیل کی پتھریلی زندگی نے اس کے چہر کو بھی سخت اور کھردرا بنا دیا تھا۔ اس پر بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں رات کے وقت بڑی بھیانک لگتی تھیں۔

وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ کبھی وہ تیز رفتاری سے چلتا تھا کبھی ایک ہرکارے کی طرح سُست روی سے دوڑتا جاتا تھا۔ ہر قدم پر اس کی بہن قریب آتی جا رہی تھی۔ رات کے گیارہ بجے اسے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو وہاں رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حسن آباد اتنا بڑا شہر تھا کہ سمندر کی طرح اس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک اجنبی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں اپنی بہن کی رہائش گاہ ڈھونڈ نکالتا لیکن جس طرح پولیس تھانوں میں شہر کے تمام چوروں اور بدمعاشوں کے پتے لکھے ہوتے ہیں' اسی طرح ہر چور بدمعاش کے دماغ کی چھوٹی سی ڈائری میں پولیس والوں کے رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے کے اوقات' مقامات اور مصروفیات کی معلومات درج ہوتی ہیں۔ وہ کسی بدمعاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔

بابر نے وہاں پہنچ کر سب سے پہلے شراب اور جوئے خانے کا پتہ چلایا پھر وہاں کے ایک بدمعاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ دریافت کیا۔ اس بدمعاش نے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ "میرے پڑوس میں ایک شخص محسن علی رہتا ہے۔ انسپکٹر مراد علی اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔"

بابر نے کہا۔ "محسن علی تو میرے چچا ہیں۔ تم مہربانی کر کے مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے بدمعاش نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار حلیے سے تو ہماری برادری کے معلوم ہوتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ پولیس والوں کے رشتے دار ہو۔"

تقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے۔ کبھی کبھی چور اور سپاہی کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتی ہے۔"

اس بدمعاش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے مکان کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں راستے میں محسن علی کے گھر کا پتہ بتا دوں گا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اڈے سے باہر نکل آئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد بابر اپنے چچا محسن علی کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے مکان تک پہنچانے والا آگے بڑھ گیا تھا۔ بابر نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز پر اس کے چچا ہی نے دروازہ کھولا پھر اسے

دیکھتے ہی چونک کر بولے۔ ''تم............ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہاری چچی نے جب سے سنا ہے کہ تم جیل سے فرار ہوئے ہو' تب سے وہ یہی کہہ رہی ہیں کہ تم بھاگ کر یہ آؤ گے اور ہمارے لئے مصیبت بن جاؤ گے۔''

بابر نے کہا۔ ''انکل! پہلے مجھے اندر تو آنے دیجئے۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آ لوگوں کے لئے مصیبت نہیں بنوں گا۔''

اس کے چچا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کی اجازت دی پھر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر مراد یہاں آگیا اور اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہم اسے م دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''اس بات کو میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ آپ یقین کریں' اگر وہ آبھی گیا میں آپ لوگوں سے اپنا رشتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ میں صرف ماریہ کو ایک نظر دیکھنے آ ہوں۔ میں نے ایک جگہ سے مراد کا پتہ حاصل کیا ہے۔ آپ بتائیں کیا یہ پتہ درست ہے؟''

اس نے پتہ بتایا۔ اس کے چچا نے کہا۔ ''پتہ درست ہے مگر تمہیں وہاں نہیں جانا چاہئے۔ کیا وہاں جاؤ گے تو مراد سے سامنا نہیں ہوگا؟''

''میں چھپ کر جاؤں گا۔ وہاں میری ماریہ ہوگی۔ میں اسے دور سے دیکھوں گا۔ اگر وہ تنہا ہوئی تو اس سے دو باتیں کروں گا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے دور جانے سے پہلے کیا میں دو باتیں کرنے کا بھی حقدار نہیں ہوں؟''

اس کے چچا نے کہا۔ ''یہ دانش مندی نہیں ہے۔ تم جیل سے فرار ہو کر ایک پولیس انسپکٹر کے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ اگر اس سے سامنا ہو گیا تو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ کیا تم بھی اپنی بہن کے سہاگ کو نقصان پہنچا سکو گے؟''

''میں تمام راستے نیکیاں کرتا آیا ہوں۔ منزل پر پہنچ کر کسی کی برائی یا نقصان کیسے چاہوں گا۔ میں صرف اپنی بہن کے پتے کی تصدیق کرنے کے لئے آیا تھا۔ آپ اطمینان رکھیں' اگر مراد سے سامنا ہو گیا تو میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردوں گا۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ میری گرفتاری سے مراد کو ترقی ملے گی اور مراد کی ترقی سے میری بہن کو خوش حالی نصیب ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے

چلا گیا۔

☆======☆======☆

ماریہ ایک دم سے بیمار ہو کر بستر کی ہوگئی تھی۔ جب سے اس نے وہ فلم دیکھی تھی' تب سے اس کا یہی حال تھا۔ وہ کٹا ہوا ہاتھ کئی بار اس کی چشم تصور میں آچکا تھا۔ مراد اسے تفریح کے لئے لے گیا تھا لیکن وہ تفریح اسے مہنگی پڑ گئی تھی۔ وہ سنیما ہال ہی میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ پہلے اسے منیجر کے کمرے میں لے جا کر ہوش میں لایا گیا۔ گھر آنے کے بعد ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا' دوائیں دیں' اسے حوصلہ دیا کہ اسے ان دیکھی چیزوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ ماریہ نے خود ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ ایک ہاتھ اکثر اس کے خوابوں اور خیالوں میں آکر اسے دہشت زدہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا۔ ''وہ محض ایک خیالی ہاتھ ہے۔ وہ تمہارے پاس کیسے آئے گا؟ حقیقتاً اس ہاتھ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پھر اس سے ڈرنا کیسا؟ پھر یہ کہ تم ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ اگر کوئی تمہارا دشمن ہوا بھی تو وہ ایک پولیس انسپکٹر کے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

ماریہ نے نقاہت سے کہا۔ ''میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ پھر کوئی بلاوجہ اپنا ہاتھ میری گردن تک کیوں لائے گا۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھتی ہوں اور اپنے دل کو اچھی طرح سمجھاتی ہوں' اس کے باوجود دہشت زدہ رہتی ہوں۔''

ڈاکٹر نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں صرف وہم کی بیماری ہے۔ مراد صاحب! آپ انہیں تنہا نہ چھوڑیں۔ خصوصاً رات کے وقت ان کے پاس کسی کو موجود رہنا چاہئے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ پھر دوسری رات کو بھی اس نے آکر ماریہ کو دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے بدن سے خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس کے اندر جو ایک ان دیکھا ہاتھ تھا' وہی اس کا لہو نچوڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر مایوس ہو کر چلا گیا اور مراد سے کہہ گیا کہ ماریہ کے دماغ میں بچپن ہی سے خوف سمایا ہوا ہے۔ اس خوف کی جڑیں بہت گہرائی تک مضبوط ہو چکی ہیں۔ اس کے دماغ سے دہشت کو نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر درست کہہ گیا تھا۔ واقعی وہ ناقابل علاج ہوگئی تھی۔ اب تو ہلکی سی آہٹ سن

کر چونک جاتی تھی۔ اگر دروازہ زور سے بند ہوتا تو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگتا۔ مراد نے گھر کی ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ وہ آہستگی سے دروازہ کھولے اور بند کرے۔ اگر بیگم صاحبہ سو رہی ہوں تو چپ چاپ کمرے کی صفائی کر کے چلی جایا کرے۔

ملازمہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر چپ چاپ کمرے میں آنا بھی مہنگا پڑا تھا۔ ایک بار ماریہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ بعد میں اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کمرے میں ملازمہ ہے۔

اس رات بھی مراد ہمیشہ کی طرح ماریہ کے ساتھ خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا اور اسے مختلف لطیفے سنا کر اس کا دل بہلا رہا تھا۔ ٹھیک آدھی رات کو ایک سپاہی نے آکر دروازے پر دستک دی۔ مراد نے ماریہ سے کہا۔ ”میں باہر کا دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔ میرے آنے تک ملازمہ تمہارے پاس رہے گی۔“

ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بستر پر پڑی رہی۔ مراد نے ملازمہ کو بلا کر کمرے میں رہنے کے لئے کہا پھر باہر کا دروازہ کھولنے کے لئے وہاں سے چلا گیا۔

ماریہ گم صم پڑی ہوئی تھی۔ پچھلی رات سے اس کی یہی حالت تھی۔ وہ سوچتی زیادہ تھی اور بولتی کم تھی۔ وہ مراد کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ اس کا دل کس قدر کمزور ہو گیا ہے اور وہ کس طرح اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔

مراد نے کمرے میں آ کر ماریہ سے کہا۔ ”اس وقت میرا تھانے پہنچنا بہت ضروری ہے۔ یہاں سے پندرہ میل دور جیل سے فرار ہونے والا ایک مجرم شوکت پکڑا گیا ہے۔ وہ اور بابر دونوں ایک ساتھ فرار ہوئے تھے۔ اب ہم شوکت سے یہ معلوم کر لیں گے کہ بابر کس علاقے کی طرف گیا ہے۔“

ماریہ اپنے بھائی کا نام سن کر اٹھ بیٹھی۔ مراد نے سمجھا کہ وہ گھبرا رہی ہے۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں تنہا نہیں رہو گی۔ میں سپاہی کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہارے پاس ملازمہ رہے گی اور باہر سپاہی پہرہ دیتا رہے گا۔ تم ڈرو گی تو نہیں؟“

ماریہ نے نفی میں سر ہلایا۔ مراد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا چونکہ ملازمہ نیند سے اٹھ کر ماریہ کے کمرے تک آئی تھی‘ اس لئے اس کی آنکھوں

میں نیند کا خمار تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک جبراً جاگتی رہی پھر آہستہ آہستہ اونگھنے لگی۔ ماریہ تھوڑی دیر تک اسے بہلاتی رہی تاکہ وہ کسی طرح جاگتی رہے لیکن وہ سو گئی اور کیوں نہ سوتی؟ اسے کسی کا خوف تو نہیں تھا کہ ڈر کے مارے جاگنے میں ماریہ کا ساتھ دیتی۔

ماریہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ بیچاری بوڑھی عورت تمام دن گھر کا کام سنبھالتی ہے۔ اس وقت اسے سونے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ پھر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دور فرش پر ملازمہ سو رہی تھی۔ پچھلی شب کی ہواؤں سے کھڑکیوں کے پردے لہرا رہے تھے۔ ان کی ہر لہر سے اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑکی کے راستے کوئی پردے کو ہٹا کر آ رہا ہو۔

اور وہ آ رہا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے اپنا چہرہ بڑا ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا حالانکہ وہ بدصورت نہیں تھا مگر حالات نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”بہن سے بچھڑے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ وہ مجھے نہیں پہچانے گی۔ رات کے وقت میرا یہ چہرہ دیکھ کر ڈر جائے گی اور اگر اس نے ڈر کر چیخ ماری تو گھر کے دوسرے لوگ اٹھ کر آ جائیں گے۔ انسپکٹر مراد علی کو تو میں نے اس گھر سے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کی طرف سے تو اطمینان ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟ جتنے بھی ہوں‘ اگر انہوں نے شور مچایا تو مجھ پر مصیبت آ جائے گی لہٰذا مجھے اچانک ہی ماریہ کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ پھر قریب پہنچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ تب اسے سرگوشی میں بتاؤں گا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کے بعد بہن اپنے منہ پر محبت کا ہاتھ دیکھ کر اسے چوم لے گی۔“

دوسری طرف ماریہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑکی یا دروازے پر کھٹکا سا محسوس ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئی تھیں۔ خوف سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھاتی ہوئی دروازے کی طرف جا رہی تھی تاکہ سپاہی کو آواز دے کر اندر بلائے۔ اپنی خواب گاہ سے باہر نکل کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کے بعد ایک برآمدہ تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑے ہوئے سپاہی کو اندر بلانا چاہتی تھی۔ اسی کمرے میں پیچھے سے بھائی آ رہا تھا۔

اس نے اپنی بہن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "زندگی راستے میں عجیب موڑ آتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ محبت کے لئے دشمن کی ط بڑھتا ہے کیونکہ پیچھے سے آنے والا ہاتھ ہمیشہ دشمن کا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ بھی پیچھے بڑھ رہا ہے مگر یہ ایک بھائی کا ہاتھ ہے۔"

ماریہ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ پہلے اسے اپنی گردن کے پیچھے بالوں میں سرسراہ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی زہریلا سانپ رینگتا ہوا آ رہا ہو۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا وہ ہاتھ اس کے بائیں کان کے پاس سے گزرتا ہوا ٹھوڑی کے نیچے آ کر ہتھیلی کا پیالہ گیا۔ چھ برس کی ماریہ کے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ اس دھماکے کی زد میں سولہ بر کی ماریہ آ گئی۔ بچپن سے جوانی تک خوف کا سفر مکمل ہو گیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکی، بے آوا ہو گئی۔

ایک سرگوشی نے کہا۔ "میری بہنا! میں تیرا بھائی بابر ہوں، شور نہ مچانا۔"

اس نے شور نہیں مچایا۔ محبت کے ہاتھ نے بار بار پیار سے دستک دی لیکن وہ پھر بولی۔

☆======☆======☆

خوگرفتہ

انسان کی اچھی بری عادات بدلی جا سکتی ہیں لیکن کوئی عادت اگر فطرت بن جائے تو اسے بدلنا ناممکن ہے۔

ایک سیدھی سادی لڑکی کا دلچسپ قصہ، اسے نت نئے زیورات پہننے کی عادت تھی اور اس کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔

وہ ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے آدھے چہرے پر روشنی تھی اور آ چہرہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا آدھا منہ اُجلا اور آ کالا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دیدۂ بینا سے وہ کالک نظر نہیں آتی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے کشادہ سڑک کے اس پار جیولری کی ایک دکان تھی۔ ا دکان کے سامنے ایک سرخ رنگ کی کار آکر رک رہی تھی۔ کار ڈرائیو کرنے والی لڑکی دیکھ کر وہ دیوار کی آڑ میں آگیا تھا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔ جب وہ کار سے باہر آئی اس کا دلنشین سراپا نظر آیا۔ گہرے رنگ کی پھول دار میکسی اس کے بدن پر سج رہی تھی سیاہ زلفوں میں زرد رنگ کا پھول یوں لگ رہا تھا جیسے رات کو سورج نکل رہا ہو۔

شام کا وقت تھا۔ بادل چھانے کے باعث قمقمے پہلے ہی روشن ہوگئے تھے۔ روشنی ا تاریکی کے سنگم پر وہ آدھا منہ سفید اور آدھا منہ کالا کئے کھڑا تھا۔ حسینہ کو دیکھتے ہی اس کچھ شبہ سا ہوا۔ دماغ نے کہا اسے اس لڑکی کے پیچھے جانا چاہئے۔ جب دماغ حکم دیتا ہے ت پاؤں اس راہ پر بے اختیار چل پڑتے ہیں۔ وہ کشادہ سڑک کو پار کرنے لگا۔

لڑکی اپنے پرس کو ایک ادائے ناز سے شانہ پر رکھے جیولری کی دکان میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ کار کے پاس آکر ذرا دیر کے لئے رک گیا۔ لڑکی کا ملازم جو پچھلی سیٹ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر کار کو لاک کر رہا تھا۔ وہ ملازم پر ایک سرسری سی نظر ڈال جیولری کی دکان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ شوونڈو کے شیشے کے اس پار لڑکی شوکیس پر جھ ہوئی زیورات پسند کر رہی تھی۔ دکان کے مالک نے مسکرا کر اس سے کچھ کہا۔ آواز باہر تک نہ آسکی۔ لڑکی نے جواباً مسکرا کر سر ہلایا پھر وہ دونوں دکان کے پارٹیشن کے پیچھے چلے گئے۔

وہ چلی گئی تو نظارہ خالی ہوگیا۔ دکان کے باہر وہ کھڑا رہ کر سوچنے لگا۔ "اب کچھ ہو والا ہے؟ لیکن کیا ہونے والا ہے۔ یا تو لڑکی سے دوستی ہوجائے گی یا پھر اس لڑکی کو کوئ

حادثہ پیش آئے گا۔"

وہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دماغ اندر سے بولتا ہے۔ یوں تو سب ہی کے دماغ سوچ کی زبان سے بولتے ہیں لیکن اس کی بات کچھ اور تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ دماغ کے کسی چور خانہ سے آواز آتی ہے کہ یہ کرو۔ آگے بڑھو پیچھے ہٹو۔ فلاں پر شبہ کرو اور فلاں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادو۔ بس ایسی ہی ہدایت یا احکامات ملتے تھے۔ جیسے کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اسکے دماغ کو کبھی کنٹرول کر رہا ہو یا کبھی بے لگام چھوڑ رہا ہو۔

بہرحال دماغ میں کوئی چور تھا۔ اس چور نے اسے حکم دیا کہ اسے بھی دکان کے اندر پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہئے۔ لہٰذا وہ دکان کے اندر پہنچ گیا۔ دکان کے منیجر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "فرمایئے!"

اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "میں اس پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔"

منیجر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام آصف حمزہ ہے۔"

وہ کارڈ بتا رہا تھا کہ آصف حمزہ انٹیلی جنس کا چیف آفیسر ہے منیجر کے ہاتھ میں وہ کارڈ کانپنے لگا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی کال کرتا ہوں۔ سیٹھ صاحب پارٹیشن سے باہر آجائیں گے۔"

اس نے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی آصف حمزہ نے ٹیلی فون اور ریسیور کو اپنے ہاتھ کے چوڑے پنجے سے ڈھانپ دیا۔ "کوئی کال یا کوئی اشارہ اُدھر نہیں پہنچنا چاہئے۔"

منیجر نے عاجزی سے کہا۔ "ہماری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ایک بار معاف کردیں۔ ہم آپ کا ہر مطالبہ پورا کریں گے۔"

"تم نے اس دروازے کو باہر سے لاک کیا ہے۔ میرا مطالبہ ہے کہ چابی میرے حوالے کردو۔"

اس نے دراز کھول کر نوٹوں کی ایک بھاری گڈی آگے رکھ دی۔ آصف حمزہ کا دماغ پھر بولنے لگا۔ "میں ایک ایمان دار افسر ہوں۔ رشوت قبول نہیں کرسکتا۔ مجھے چابی

چاہئے۔"

اس نے منیجر کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر دوسرا ہاتھ اس کی جیب میں ڈال کر چابی نکال لی۔ اس کے بعد اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ پیچھے جا کر پارٹیشن کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار کے دوسری طرف ایک مرد کی اذیت ناک کراہیں سنائی دیں۔

آصف حمزہ شوکیس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر دروازے کے پاس پہنچا۔ پھر بڑی پھرتی سے چابی کے ذریعے دروازہ کھولتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ وہ چاقو لئے کھڑی تھی۔ چاقو کے پھل سے لہو ٹپک رہا تھا۔ دکان کا مالک اپنے لہو میں بھیگا ہوا فرش پر تڑپ رہا تھا۔ لڑکی نے اسے دیکھتے ہی شدید حیرانی سے پوچھا۔ "آصف تم؟"

دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ "یہ لڑکی میرا نام جانتی ہے۔ میرا کام بھی جانتی ہوگی۔ بہت دور تک پہنچی ہوئی ہے۔ اسی لئے تو قتل کرنا بھی آتا ہے۔"

یہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ "اچھا تو تم میرا نام جانتی ہو؟ لیکن میں تمہاری جیسی آوارہ لڑکیوں کو پہچاننا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"آصف! ایسا نہ کہو۔ اس وقت میں مصیبت میں ہوں۔ تم ہی مجھے قتل کے الزام سے بچا سکتے ہو۔"

یہ کہتے ہی اس نے میکسی کے دامن سے چاقو کے ہتھے کو پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔

"اچھا تو تم ثبوت ضائع کر رہی ہو لیکن مجھ جیسے چشم دید گواہ کی آنکھیں کیسے پھوڑ سکتی ہو؟"

وہ آگے بڑھی۔ پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ سکتی ہوں مگر تمہاری یہ آنکھیں جو مجھے دیکھنے اور مجھے پہچاننے کے لئے ہیں۔ میں ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی ہوں تاکہ ایک دن تم اپنی سائلہ کو پہچان سکو۔"

"سائلہ......... سائلہ........." یہ نام اس کی کھوپڑی کے گنبد میں گونجنے لگا۔ پھر اس کے دماغ نے کہا۔ "نہیں میں سائلہ نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ یہ فراڈ ہے۔ مجھ پر اپنے حسن و شباب کا جال پھینک رہی ہے۔ مجھے ایک سراغ رساں کی ذمہ داری پوری کرنی چاہئے۔"

اس وقت تک سائلہ نے اس کی گردن میں اپنی بانہوں کا ہار پہنا دیا تھا۔ جال کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ آصف حمزہ نے اس کی بانہوں کے ریشمی جال کو توڑتے ہوئے کہا۔ "دور ہٹو میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تم سے کوئی برا سلوک نہ کروں تو میرے سوالات کا سیدھی طرح جواب دو۔"

اتنے میں دکان کا منیجر اندر آچکا تھا۔ اپنے مالک کی لاش دیکھ کر وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ آصف نے اس سے کہا۔ "دکان کا شٹر گرا دو۔ کوئی گاہک یہاں نہ آنے پائے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں ابھی دکان بند کر دیتا ہوں مگر یہ قتل کا کیس ہو گیا۔ میں سجاد صاحب کو سمجھاتا تھا کہ شراب اور شباب سے توبہ کریں۔ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ اب وہی انجام سامنے آگیا۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ آصف نے سائلہ سے پوچھا۔ "اب بتاؤ کیا مقتول کا نام سجاد ہے؟"

"ہاں۔" سائلہ نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ یہ بری نیت سے مجھے یہاں لائے گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری پسند کا ایک سیٹ یہاں اندر رکھا ہوا ہے۔ میں یہاں دیکھنے آگئی۔ اس نے مجھے للچانے کے لئے زیورات کی یہ الماری کھول دی۔"

آصف نے دیکھا۔ ایک طرف کھلی ہوئی الماری میں سونے چاندی، ہیرے موتیوں کے زیورات جگمگا رہے تھے۔ اس نے سائلہ کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔ "ایسی جگہ پہنچ کر عورت کی حرص و ہوس ہر اچھے برے مرحلہ سے گزر جاتی ہے یہی تم نے کیا۔؟"

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ یہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں باہر جانے لگی تو یہ چاقو کھول کر کھڑا ہو گیا لیکن یہ ہوس کے مارے بوکھلایا ہوا تھا۔ چاقو کھول کر آگے بڑھتے ہی لڑکھڑا گیا۔ میں نے اپنے پرس کو زور سے اس کے ہاتھ پر مارا تو چاقو گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ گھبرا کر پارٹیشن کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھو اِدھر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے قریب آکر اس کے سینے کی طرف چاقو تان کر کہا۔ "اب میرا راستہ روکو گے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن اسی وقت باہر سے پارٹیشن کی دیوار کو کسی نے دھکا مارا۔ جس کے نتیجہ میں یہ اِدھر دھکا کھا

کر چاقو کی نوک پر آ گیا.........."

آصف حمزہ کو یاد آیا کہ اس نے منیجر کا گریبان پکڑ کر اسے دھکا دیا تھا اور منیجر اسی جگہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیوار کا معائنہ کیا۔ اس ہارڈ بور دیوار کے ایک طرف کیلیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اندر کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو ا دھکا لگ سکتا تھا۔

اس کے دماغ نے کہا۔ "سائلہ کا بیان درست ہو سکتا ہے۔ اگر وہ چاقو سجاد کا ہ اس نے سائلہ کو دھمکی دینے کے لئے وہ چاقو نکالا ہو۔"

اس نے منیجر سے پوچھا تو تصدیق ہو گئی کہ چاقو سجاد کا تھا۔ سائلہ نے کہا۔ "آصف اب تمہیں یقین ہو جانا چاہئے کہ میرے ہاتھ کا چاقو مقتول کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ مقتول اس چاقو پر آ گیا تھا۔"

انسان کا دماغ اس کا سب سے بڑا رہنما ہوتا ہے۔ وہ صحیح راہ بھی دکھا سکتا ہے ا غلط بھی۔ وہ اندر بیٹھ کر ہر حال میں بولتا ہے۔ لہٰذا وہ بولنے لگا۔ "اگر میں منیجر کو دھکا نہ تو وہ دیوار سے نہ ٹکراتا اور سجاد کا سینہ اس چاقو کی نوک پر نہ جاتا۔ ایسی صورت میں ا سائلہ سے غیرارادی طور پر قتل ہوا ہے تو اس قتل کا مرتکب میں بھی ہوں کیونکہ میں ن منیجر کو دھکا دے کر سجاد کو چاقو پر گرایا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ نادانستگی میں ہوا۔ تاہم ا غیرارادی قتل کے عمل میں' میں اور سائلہ برابر کے شریک ہیں۔"

جب تک وہ سوچتا رہا منیجر بولتا رہا۔ "جناب آصف صاحب میری سمجھ میں نہیں آ یہ کیا ہو گیا۔ آپ نے مجھے دھکا دیا تھا میں نے دیوار سے ٹکرانے کے بعد سجاد صاحب ک کراہیں سنی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت اس لڑکی نے انہیں قتل کیا ہے۔"

سائلہ نے کہا۔ "اچھا تو آصف نے تمہیں دھکا دیا تھا تب تو میرے بیان کی سچ ثابت ہو جاتی ہے۔ قتل میں نے نہیں کیا اگر الزام مجھ پر آتا ہے آصف! تو اس الزام م تم بھی میرے برابر کے شریک ہو۔ آگے میرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ پیچھے سے تمہارا ارسا کردہ دھکا تھا۔ اب بولو مجرم کون ہے؟"

وہ سوچنے لگا۔ کبھی کبھی دماغ فیصلہ کن انداز میں بول نہیں سکتا۔ اس لئے اد اُدھر سوچنا پڑتا ہے۔ منیجر رونے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "جناب! سجاد صاحب ایک مع

خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر اس مقدمہ میں یہ بات آئے گی کہ انہوں نے کسی لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا تو ان کی جوان بیٹیاں بدنام ہو جائیں گی۔ آپ کسی طرح اس معاملہ کو یہیں ختم کر دیجئے۔"

سائلہ نے اس کی تائید کی۔ "ہاں آصف! یہ منیجر ہمارا ساتھ دے گا۔ اس معاملہ کو یہیں ختم کر دو۔ ہم دونوں خواہ مخواہ کے الزامات سے اور عدالتوں کے چکر لگانے سے بچ جائیں گے۔ میں پہلے بھی تمہاری تھی۔ یہاں سے نکل کر آئندہ بھی تمہاری رہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ بازو سے ایسا بدن لگا کہ آصف کا دل آپ ہی آپ دھڑکنے لگا۔ دماغ کے کہنے سے ہی دل دھڑکتا ہے۔ "اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ قتل کے مقدمہ میں پریشانیاں ہیں اور پیار کے مقدمہ میں آرام اور سکون ہے اس کی بات مان لینا چاہئے۔"

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ "قتل کو چھپایا نہیں جا سکتا کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ لاش کو کہیں چھپا دیا جائے۔"

"ہاں اگر ایسا ممکن ہے تو ضرور چھپا دینا چاہئے۔"

"ناممکن ہے۔" منیجر نے کہا۔ "یہاں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے کہ لاش چھپا دی جائے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ سجاد مرحوم عزت و احترام سے سپرد خاک کئے جائیں تو کوئی انہیں ہوس پرست نہ کہے۔"

سائلہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "واہ بڑے وفادار اور نمک حلال ملازم ہو۔ اپنے مالک کی عزت رکھنا چاہتے ہو اور میری عزت تو جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔"

منیجر نے کہا۔ "میں آپ کی بھی عزت رکھنا چاہتا ہوں۔ آصف صاحب چاہیں تو اسے ڈکیتی اور قتل کا کیس بنا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ آپ دونوں یہاں مجھے اچھی طرح باندھ کر چلے جائیں۔ میں بعد میں پولیس والوں کو بیان دوں گا کہ چند آدمی معزز گاہک بن کر آئے تھے لیکن لباس کے اندر ریوالور اور چاقو رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں پارٹیشن کے پیچھے جانے پر مجبور کیا ہم یہاں آئے تو پہلے انہوں نے مجھے رسیوں سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ سجاد صاحب نے شور مچانے کی کوشش کی تو انہوں نے چاقو سے ہلاک کر دیا۔"

سائلہ نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت عمدہ تدبیر ہے۔" وہ پھر آصف سے لپٹ
"ہاں آصف! جلدی اس کی بات مان لو نا۔"

وہ ہیرے کی کنی تھی۔ دہکتا ہوا انگارہ تھی۔ انگارہ جہاں جہاں بدن سے چپکتا ہے حصوں کو جلاتا ضرور ہے۔ آصف کا ہاتھ بے اختیار اس کی کمر کے خم پر آگیا۔ جیسے کہ ہو۔ "اور جلاؤ.........."

سائلہ اسے سوچتے دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ شکاری کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہوتا ہے وہ اعتماد سے بولی۔ "اسے ڈکیتی کا کیس بھی بنانا ہے۔ اس لئے میں یہاں سے اپنی پسند زیورات سمیٹ کر لے جاؤں گی۔"

منیجر نے کہا۔ "میں اپنے مالک کی زندگی میں نمک حلال اور وفادار رہا مجھے وفاداری کا کچھ صلہ ملنا چاہئے۔ جتنا مال آپ یہاں سے لے جائیں گی۔ اس کے تین حصے ہوں گے۔ ان میں سے ایک حصہ آپ ابھی میری گھر والی کے پاس پہنچائیں گی۔ میں گھر پتہ بتا رہا ہوں۔ آسان ہے آپ یاد کر لیں۔"

اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔ سائلہ نے پتہ یاد کرنے کے بعد وعدہ کیا۔ "میں ایک گھنٹہ کے اندر تمہارا حصہ تمہاری بیوی کے پاس پہنچا دوں گی۔"

"دیکھئے سائلہ صاحبہ! میں اور آصف صاحب آپ کو قتل کے الزام سے بچا رہے ہیں۔ اگر حصہ پہنچانے میں بے ایمانی ہوگی تو میں بعد میں اپنا بیان بدل دوں گا۔ ان سے کہوں گا کہ سائلہ اور آصف حمزہ صاحب نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں آپ دونوں کا ذکر نہ کروں۔ ورنہ آپ لوگ میرے بچوں کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ میں اپنے بچوں کو ننھیال [illegible] کے بعد صحیح بیان دے رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں کتنی آسانی سے اپنا بیان بدل سکتا ہوں۔"

وہ سمجھ گئی۔ بستر کی چادر اٹھا کر کھلی ہوئی الماری کے پاس بچھا دی پھر سونے چاندی اور ہیرے موتیوں سے بنے ہوئے زیورات اٹھا اٹھا کر چادر پر رکھنے لگی۔ دس منٹ بعد جب اس نے گٹھڑی باندھ کر آصف کو دیکھا تو وہ منیجر کو اچھی طرح باندھ کر فرش پر ا گٹھڑی بنا چکا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

وہ دونوں زیورات کی گٹھڑی اٹھا کر دروازے کے پاس آئے۔ اسے ایک طرف

رکھا۔ دروازے کا شٹر گرا ہوا تھا۔ آصف شوکیس پر چڑھ کر وینٹی لیٹر سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر قمقمے روشن تھے۔ کشادہ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس دکان کے فٹ پاتھ پر بھی لوگ چل رہے ہوں گے۔ جو نظر نہیں آ رہے تھے۔ سائلہ کا ملازم کار کے پاس کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

آصف نے شوکیس سے اترتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ابھی ہم باہر نہیں نکل سکتے۔"

وہ پیار سے اس کا بازو تھام کر بولی۔ "میں مصیبت نہیں تمہاری محبت ہوں' افسوس کہ تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔"

آصف نے پہلے تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ دماغ نے کہا۔ "نہیں' میں اسے نہیں پہچانتا۔" پھر اس نے سائلہ کے رخسار کی لالی کو اور لبوں کی پنکھڑیوں کو چھو کر دیکھا۔ دماغ کے چور خانہ سے کسی نے کہا۔ "یہ چہرہ میں دیکھ چکا ہوں۔ شاید ایک بار دیکھا ہے۔ اس لئے بھول گیا ہوں مجھے پہچاننے کی کوشش کرنا چاہئے۔"

وہ اسے اپنے بازوؤں میں لئے پہچاننے لگا۔ سائلہ نے سانسوں کی ہلچل میں پوچھا۔ "ہم یہاں سے کب نکلیں گے؟"

وہ ہلچل مچاتی ہوئی سانسوں میں بولا۔ "نکل جائیں گے پہلے مجھے پہچاننے دو.........."

شٹر کے پیچھے دکان کے اندر خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کے پیچھے شوکیس تھا۔ شوکیس کے پیچھے دیوار تھی اور دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر جلی ہندسوں میں انیس سو ساٹھ لکھا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

مینٹل ہسپتال کی ایک دیوار پر ایک کیلنڈر آویزاں تھا۔ اس پر جلی ہندسوں میں انیس سو ساٹھ لکھا ہوا تھا اور کیلنڈر کا ورق دسمبر کا مہینہ بتا رہا تھا۔

مینٹل ہسپتال کے پیچھے ایک پاگل خانہ تھا۔ اس کے ایک آپریشن تھیٹر میں ایک حسینہ ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں چمڑے کے تسموں سے بندھے ہوئے تھے۔ بیڈ کے اطراف دو زنانہ پولیس ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک اسسٹنٹ نظر آ رہے تھے۔

بیڈ پر لیٹی ہوئی حسینہ پسینے سے شرابور تھی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اسے دماغی جھٹکے

پہنچائے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر ایک تولیہ سے اس کے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر کا اشارہ پاکر دونوں پولیس عورتیں اس کی بندشوں کو کھولنے لگیں۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ نقاہت سے بولی۔ "میرا نام سائلہ ہے۔"

"تم اپنا نام یاد رکھتی ہو مگر یہ یاد نہیں رکھتیں کہ تمہاری ایک خراب عادت سے کتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"مجھے شاک نہ پہنچاؤ۔ اب یاد رکھوں گی۔"

"بتاؤ' تمہاری عادت یا تمہاری کمزوری کیا ہے؟"

"زیورات........" وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی۔

"کیا تم زیورات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں؟"

"رہ سکتی ہوں۔ اب میں کسی عورت کا زیور نہیں اتاروں گی۔"

"تم نے پہلے بھی وعدہ کیا تھا۔ تمہاری باتوں اور طور طریقوں سے پتہ نہیں چلتا کہ تم پاگل ہو۔"

"پاگل نہیں پگلی کہو۔ ڈاکٹر تمہاری گرامر درست نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے جھینپ کر لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "شاباش سائلہ! تم تو بہت ذہین ہو۔ دوسروں کی غلطیاں پکڑ لیتی ہو۔ کیا اپنی ایک غلطی سے باز نہیں آسکتیں؟"

"میں باز آگئی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔"

"ایک ماہ پہلے تمہیں نارمل سمجھ کر چھٹی دے دی گئی تھی۔ ایک ماہ تک تم بالکل ٹھیک رہیں۔ صرف اپنے زیورات پر صبر کرتی رہیں۔ تین دن کے بعد تم نے بیگم حشمت بیگ کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا۔ گیس سلنڈر کو کھول کر انہیں کچن میں بند کر دیا۔ تم یہ نہیں جانتی تھیں کہ تمہیں عارضی رہائی دی گئی تھی اور ہمارا ایک آدمی برابر تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔ اگر وہ موقعہ پر تمہیں گرفتار نہ کرتا اور کچن میں نہ پہنچتا تو گیس کی زیادتی سے بیگم حشمت بیگ کا دم گھٹ جاتا۔"

سائلہ نے کہا۔ "میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ان کے گلے سے ہار اتارتے

وقت وہ مجھ سے الجھ رہی تھیں۔ میں نے ہار اتارتے ہی انہیں دھکا دیا۔ وہ سلنڈر سے جا کر ٹکرائیں۔ سر پر چوٹ لگتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ شاید ان کے ٹکرانے سے سلنڈر کی چابی گھوم گئی تھی۔"

"کچھ بھی ہو۔ تمہیں زیورات سے اتنی محبت ہے کہ تم نے اس بے ہوش عورت سے ہمدردی نہیں کی۔ کچن کا دروازہ بند کر کے بھاگنے لگیں۔ اگر عین وقت پر وہ نہ آجاتا تو تم ایک نیکلس کے لالچ میں قاتل بن جاتیں۔"

"چلو یہ تو ثابت ہو گیا کہ میں بیگم صاحبہ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"ہاں بیگم حشمت بیگ کے بیان سے تم بچ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ تم نے گیس آن نہیں کی تھی۔ سلنڈر سے ٹکرانے کے بعد بھی وہ چند لمحوں تک ہوش میں رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا ہاتھ لگنے سے سلنڈر کی چابی گھوم گئی ہے۔ وہ گیس کو خارج ہونے سے روکنا چاہتی تھیں مگر اسی لمحہ ان کا سر چکرا گیا لیکن ہم یہاں بیگم حشمت کی نہیں تمہاری باتیں کر رہے ہیں۔ تم کب تک الزامات سے بچتی رہو گی۔ اگر چوری اور چھینا جھپٹی کے دوران کسی کی جان جائے گی تو تم قاتل کہلاؤ گی۔"

"قاتل نہیں قاتلہ کہو۔ لیڈی ڈاکٹر تمہاری گرامر بھی درست نہیں ہے۔"

اس بار لیڈی ڈاکٹر جھینپ کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "سائلہ! تم بہت بڑی فراڈ ہو۔ ہم تمہاری بھلائی کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تم ایک نارمل لڑکی ہو لیکن تمہارا وکیل عدالت میں ایسے ٹھوس دلائل پیش کر کے تمہیں ذہنی مریضہ ثابت کرتا ہے کہ تمہیں جیل خانہ کے بجائے پاگل خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں تم پاگل خانہ کے ایک کمرہ میں آکر آرام فرماتی رہتی ہو۔"

"ڈاکٹر! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ تم مجھے اب سے پہلے بھی بجلی کے جھٹکے پہنچا چکے ہو۔ میں ایسے اذیت ناک جھٹکے برداشت کرنے کے لئے جان بوجھ کر پاگل خانہ میں نہیں آسکتی۔"

"اپنی عادت سے مجبور ہو کر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے بعض لوگ پھانسی کے تختہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ زیورات کو دیکھ کر تم پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر تم کس مرض کی دوا ہو ڈاکٹر۔ جب تم دیکھ چکے ہو کہ دماغ کو جھٹکے پہنچانے

کے باوجود میرا یہ جنون نہیں جاتا تو پھر دوسرا طریقہ علاج کیوں نہیں اختیار کرتے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "پلیز ڈاکٹر! آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ سائلہ فراڈ یا ہے۔ یہ ہمارے لئے صرف ایک مریضہ ہے۔ اس کے وکیل نے عدالت میں جو باتیں وہ سب درست ہیں۔ یہ دوسری عورتوں سے زیورات ضرور چھینتی ہے لیکن کچھ شوق سے پہننے کے بعد مختلف ذرائع سے انہیں واپس کر دیتی ہے۔ پولیس رپورٹ کے حق میں ہے۔ رپورٹ کا متن یہ ہے کہ سائلہ چور نہیں' صرف ذہنی مریضہ ہے۔"

"اور ہم ڈاکٹر نہیں' گھسیارے ہیں۔" ڈاکٹر نے چڑ کر کہا۔ "میں دعوے سے ہوں کہ یہ فراڈ ہے۔"

"فراڈ نہیں' فراڈن کہو۔ تذکیر و تانیث کا خیال رکھا کرو۔"

ڈاکٹر نے بولنے کے لئے منہ کھولا مگر غصہ کی زیادتی سے سمجھ میں نہیں آیا کہ بولے۔ اس نے منہ بند کر لیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے سائلہ کو مخاطب کیا۔ "سائلہ! جب تم حشمت کا نیکلس چھین کر فرار ہونا چاہتی تھیں۔ تب کچن کے باہر ہمارے ایک آدمی تمہیں پکڑ لیا۔ بتاؤ کہ تم نے اس آدمی کو دیکھتے ہی کیا کہا تھا؟"

"میں اسے دیکھتے ہی حیرانی سے بولی' آصف تم؟"

"اس کا نام راشد ہے۔ تم نے اسے آصف کیوں کہا؟"

"اس لئے کہ یہ میرے محبوب کا نام تھا۔ کیا آپ نے میری ڈائری نہیں پڑھی؟"

لیڈی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کے ہاتھ سے ایک ڈائری لے کر کہا۔ "تمہاری ڈائری میں لکھا ہے کہ ایک بار تم سیٹھ کریم کی کوٹھی سے زیورات کا ایک سیٹ لے فرار ہو رہی تھیں۔ اگر ایک نوجوان تمہیں اپنی کار میں لفٹ نہ دیتا تو تم پکڑی جاتیں۔ اس سے متاثر ہو گئیں اس کا نام آصف جمال تھا۔"

سائلہ نے کہا۔ "ہاں' میں اس سے متاثر ہو گئی تھی مگر وہ یو۔کے سے آیا تھا۔ ملاقاتوں کے بعد واپس چلا گیا۔ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ اب چوری کرنے کے بعد کوئی نوجوان میرے سامنے آتا ہے تو میں اسے آصف کہتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے آصف کہتے ہی وہ مجھے پیار کی بانہوں میں سمیٹ کر چوری کے الزام سے بچا کر لے جائے گا۔"

لیڈی ڈاکٹر نے سوال کیا۔ "یعنی تمہیں آصف جمال کا پورا نام اچھا نہیں لگتا

صرف آصف کہتی ہو؟"

سائلہ نے کہا۔ "پورا نام پسند ہو۔ تب بھی مختصر نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔"

"میں نہیں جانتی سائلہ! تمہیں آصف کے ساتھ جمال کا اضافہ پسند نہیں تھا۔ تم نے ڈائری میں جمال کو کاٹ کر حمزہ لکھ دیا ہے۔ یعنی اب پورا نام آصف حمزہ ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو.........."

اس نے ڈائری آگے بڑھا دی۔ سائلہ اِدھر اُدھر سے اوراق الٹ کر دیکھنے لگی۔ جہاں جہاں آصف جمال لکھا ہوا تھا۔ اب وہاں جمال کاٹ کر اس کے اوپر حمزہ لکھ دیا گیا تھا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ کس نے آصف حمزہ لکھا ہے؟ یہ میرے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے۔"

"ڈائری تمہارے پاس رہتی ہے۔ تمہارے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔"

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے نہیں لکھا ہے یہاں میرا کمرہ باہر سے بند کیا جاتا ہے۔ صرف یہ دونوں لیڈی کانسٹیبل ڈیوٹی کے اوقات میں آتی ہیں۔ میرے سونے کے دوران ان میں سے کوئی یہ ڈائری اٹھا کر لے گئی ہو گی اور اس میں اپنے یار کا نام لکھ دیا ہو گا۔"

ایک لیڈی کانسٹیبل نے کہا۔ "اے بی بی! ہمارا نام نہ لو تمہاری ڈائری میں کسی دوسرے کا نام لکھ کر ہمیں کیا مل جائے گا۔ تم پتہ نہیں کیسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی ہو۔ کبھی پاگل پن کا دورہ پڑا ہو گا اور تم نے یہ نام لکھ دیا ہو گا۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر لیڈی کانسٹیبل کو بولنے سے منع کیا پھر کہا۔ "سائلہ! میں تمہارے متعلق رپورٹ تیار کر رہا ہوں کہ تم پاگل نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے کہ پگلی نہیں ہو۔ اگر فراڈ ہو تو یہ سمجھنا پولیس والوں کا کام ہے۔ میں کل تک تمہیں چھٹی دے دوں گا۔"

سائلہ بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "ڈاکٹر! آپ نے میری رہائی کی خبر سنا کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کم از کم آپ کی بیوی کا زیور کبھی نہیں لوں گی۔ آپ کی بیوی کہاں رہتی ہے؟"

"جہنم میں۔" وہ غصہ سے پلٹ کر چلا گیا۔

سائرہ نے کہا۔ "پھر تو میرا وعدہ قائم رہے گا۔ میں ایک زیور کے لئے جہنم میں جاؤں گی۔"

لیڈی ڈاکٹر مسکراتی ہوئی بولی۔ "تم کتنی اچھی باتیں کرتی ہو۔ اسی طرح ایک نارمل زندگی گزارو۔ ہمیں پریشان نہ کرو۔ دو ہفتے پہلے دو پاگل یہاں سے فرار ہو گئے ان کا تعاقب کرنے والا انٹیلی جنس کا ایک آفیسر مارا گیا ہے۔ وہ جب تک پکڑے نہ جائیں گے۔ شہریوں کی جان و مال کو خطرہ لاحق رہے گا۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم ہماری پریشانیوں کا باعث نہیں بنو گی۔"

سائرہ نے بیڈ سے اتر کر لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر گہری سنجیدگی سے بولی "میں جب تک یہاں رہی' آپ مجھ سے بڑی بہنوں جیسی محبت سے پیش آتی رہیں۔ دل کہتا ہے کہ میں آپ کو پریشان نہ کروں اگر اب مجھ پر زیورات کا جنون سوار ہوگا تو بھاگ کر آپ کے پاس آجاؤں گی۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر کا پتہ بتائیں گی؟"

"ضرور۔ میں اپنا پتہ لکھ کر دوں گی۔ جب بھی تمہیں احساس ہو کہ تم بہک رہی تو فوراً میرے پاس چلی آنا.......... یہاں سے نکلنے کے بعد یہ یاد رکھنا کہ ایک سراغ رساں ہمیشہ تمہاری نگرانی کرتا رہے گا۔ جب بھی چوری کرنا چاہو گی۔ وہ تمہیں باز رکھنے کے لئے پہنچ جائے گا۔"

لیڈی ڈاکٹر کی ہمدردانہ محبت پا کر سائرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اسے تسلی دیتی رہی۔ محبت کے میٹھے بول بولتی رہی۔ پھر اس سے الگ ہو کر ڈائری اس کی طرف بڑھا دی۔ ڈائری لیتے وقت پھر ایک بار وہ کھل گئی۔ اس ڈائری سے ایک تصویر نکل کر گر پڑی۔

سائرہ نے فرش سے اسے اٹھاتے وقت دیکھا۔ وہ ایک نوجوان کی تصویر تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے سامنے ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "پتہ نہیں یہ تصویر ڈائری میں کہاں سے آگئی"

"یہ کس کی تصویر ہے؟" لیڈی ڈاکٹر نے پوچھتے ہوئے تصویر کو الٹ کر دیکھا۔ تصویر کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ "آصف حمزہ۔"

لیڈی ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے سائرہ کو دیکھا۔ سائرہ نظریں جھکائے آصف کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس وقت تصویر میں

آصف جمال نظر آرہا تھا۔

☆------☆------☆

آصف جمال سے وہ دو بار مل چکی تھی۔ وہ بہت ہی مختصر ملاقاتیں تھیں۔ پہلی ملاقات میں آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے تھے اور دو شخص اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ بہرحال جب کار آگے بڑھ گئی اور اس کا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تو آصف جمال نے ڈرائیو کرنے کے دوران اپنا ایک ہاتھ سائرہ کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ فوراً ہی دروازے کی جانب کھسک گئی۔

بعض لوگ اچھے لگتے ہیں مگر ان کی بے باکی اور جلد بازی اچھی نہیں لگتی۔ آصف جمال نے مسکرا کر کہا۔ "میں یو۔کے سے آیا ہوں۔ انگلینڈ میں لڑکیاں برا نہیں مانتیں۔"

وہ خاموش رہی۔ اس نے پوچھا۔ "بائی دی وے۔ وہاں دو آدمی تمہارا پیچھا کر رہے تھے؟"

سائرہ نے جواب دیا۔ "مشرقی لڑکیاں برا مان جائیں تو مرد اسی طرح پیچھا کرتے ہیں۔"

"تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔"

"نہیں' تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ لفٹ نہ ملتی تو وہ پکڑ لیتے۔ اب اس احسان کے بدلے تم مجھے پکڑنا چاہتے ہو۔"

"میں دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کل رات کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔ کیا ہم تھوڑا وقت ساتھ نہیں گزار سکتے؟"

"یہاں شریف گھرانے کی لڑکیاں رات کو نہیں گھومتیں۔ میں کل صبح ملاقات کروں گی۔"

اس نے خوش ہو کر سائرہ کا پتہ پوچھا۔ مگر سائرہ نے گھر کا پتہ نہیں بتایا۔ اس سے گارڈن میں ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ گھر پہنچ کر وہ تمام رات آصف جمال کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ اسے اچھا لگا تھا لیکن اچھا لگنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ایک پرسکا پر بھروسہ کر لیتی۔

دوسرے دن گارڈن میں ملاقات ہوئی تو آصف جمال نے ایک اخبار اس کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر پڑھو۔ پولیس ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے، جو پرنسز کی ایک کوٹھی سے زیورات چرا کر بھاگی ہے اور وہ تم ہو۔ کل رات میں نے تمہارے ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے دیکھے تھے لیکن انہیں اہمیت نہیں دی تھی۔"

سائلہ وہ خبر پڑھ کر پریشان ہوگئی۔ آصف جمال نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کل مشرقی لڑکیوں کی پارسائی جتا رہی تھیں۔ کیا مشرقی لڑکیاں اس طرح چوری کرتی ہیں؟"

وہ ندامت سے بولی۔ "میں چور نہیں ہوں۔ پتہ نہیں زیورات کو دیکھ کر مجھے کیا ہوجاتا ہے۔ میرا دماغ بس ایک ہی ضد کرتا ہے کہ میں وہ زیورات پہن لوں۔ اس لئے میں چھیننے جھپٹنے پر مجبور ہوجاتی ہوں۔ کچھ روز انہیں پہننے کے بعد دل بھر جاتا ہے۔ پھر میری بھابی اور بھائی جان ان زیورات کو اصل مالک تک کسی نہ کسی طرح پہنچا دیتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بھابی اور بھائی جان تمہاری اس چوری کی عادت چھپا کر تمہیں شہ دیتے ہیں۔"

"نہیں، وہ بھی میری اس عادت سے پریشان ہیں۔ مجھے سمجھاتے ہیں کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے اور جب ایسا کرتی ہوں تو اپنی بدنامی کے ڈر سے چپ چاپ چوری کا مال واپس کردیتے ہیں۔"

"تم اپنے بھائی جان کے ساتھ رہتی ہو؟"

"نہیں۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا انتقال ہوگیا۔ اب اپنی کوٹھی میں تنہا رہتی ہوں۔"

"تو پھر چلو۔ ہم اس کوٹھی میں وقت گزاریں گے۔"

"نہیں آصف! آج تک کوئی غیر مرد میری کوٹھی میں نہیں گیا۔ میں اسے پسند نہیں کرتی۔"

"میں تو پسند کرتا ہوں۔ دیکھو میں تمہارا رازدار ہوں۔ تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ بس میرا دل خوش کردو۔"

"تم مجھے بے حیا لڑکی سمجھ کر میری توہین کر رہے ہو۔"

"یہ فضول باتیں ہیں۔ انگلینڈ میں کوئی شخص کسی لڑکی کے ساتھ اتنا وقت ضائع

نہیں کرتا۔ معاملات فوراً طے ہوجاتے ہیں۔ جلدی فیصلہ کرو، ورنہ میں تمہیں پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک پریشانی سے سوچتی رہی پھر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

آصف جمال نے پوچھا۔ "کیا تم ڈرائیو کروگی؟"

"ہاں۔ میں تمہیں اپنی کوٹھی میں لے جا رہی ہوں۔ مجھے ہی ڈرائیو کرنا چاہئے۔"

وہ دوسری طرف سے گھوم کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ راستے میں آصف جمال عشق و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ جب گاڑی ایسے راستے سے گزرنے لگی۔ جہاں ٹریفک برائے نام تھی تو اس نے اپنا ہاتھ سائلہ کے زانو پر رکھ دیا

سائلہ نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طرف کا دروازہ اچھی طرح بند نہیں ہوا ہے۔"

"نہیں، اچھی طرح بند ہے۔"

"میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔"

دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے سائلہ کی بات رکھنے کے لئے دروازے کو کھولا۔ اسی لمحے اسٹیئرنگ ایک جھٹکے سے گھوم کر پھر سیدھا ہوگیا۔ آصف جمال کی چیخ سنائی دی۔ وہ کار سے باہر جاچکا تھا۔ سائلہ نے بہت دور جاکر کار روکی۔ اس کا دروازہ بند کیا۔ پھر گاڑی آگے بڑھادی۔

یہ واقعہ وہ اپنی ڈائری میں لکھ چکی تھی لیکن وہ حیران تھی کہ جہاں جہاں اس نے آصف جمال لکھا تھا۔ وہاں اب ڈائری میں آصف حمزہ لکھا ہوا تھا۔ مزید حیرانی کی بات یہ کہ اس کی ڈائری سے آصف جمال کی تصویر برآمد ہوئی تھی۔

اب اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ تصویر تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پیار سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سائلہ! اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔ اگر آصف حمزہ تمہاری ڈائری میں آیا ہے تو کسی دن تمہاری آنکھوں کے سامنے بھی آجائے گا۔ تب تم اسی سے بہت کچھ معلوم کرسکوگی۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔"

دونوں کانسٹیبل عورتیں سائلہ کے اطراف آکر کھڑی ہوگئیں۔

☆------☆------☆

دکان کا شٹر گرا ہوا تھا۔ سائلہ نام کی عورت آصف حمزہ کے بازوؤں میں کسی اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحہ اسے لیڈی ڈاکٹر کی بات یاد آئی۔ نے کہا۔ "سائلہ! یہ بات یاد رکھنا۔ ایک سراغرساں ہمیشہ تمہاری نگرانی کرتا رہے گا.........."

یہ وہی سراغ رساں ہوسکتا تھا اور یہ لیڈی ڈاکٹر کی شرارت ہوسکتی تھی۔ ایک نفسیاتی طریقہ علاج ہوسکتا تھا کہ سائلہ پہلے آصف حمزہ کی تصویر دیکھ کر متاثر ہوجائے اور جب اس سے سامنا ہو تو ایک چور لڑکی کی بجائے محبوبہ بن کر اس کے بازوؤں میں جائے۔

وہ آصف حمزہ کے بازوؤں میں کسمسانے لگی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ آصف حمزہ سے کیسے متاثر ہو رہی ہے؟ اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیا تم اب تک میری نگرانی کر رہے تھے؟"

"نہیں۔ میں نے آج ہی تمہیں دیکھا ہے۔ تم اس دکان کے سامنے کار روک کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی محتاط نظروں سے آس پاس دیکھ رہی تھیں۔ میں سامنے والی عمارت کے پاس چھپا ہوا تھا۔ مجھے تم پر شبہ ہوا۔ اس لئے میں یہاں چلا آیا۔ بعض اوقات مجھے ایسا لگتا ہے' جیسے میں پیدائشی جاسوس ہوں۔ میرا دماغ جس کے خلاف شبہ ظاہر کرتا ہے۔ آخر میں وہ مجرم ثابت ہوتا ہے۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ تم اپنا فرض نبھاؤ گے یا میرا ساتھ دو گے؟"

"اگر میں تمہارا ساتھ نہ دیتا تو اب تک تم پولیس اسٹیشن میں نظر آتیں۔"

وہ خوش ہوکر اپنے پیار کی رشوت دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر شوکیس پر چڑھ گیا اور وینٹی لیٹر کے باہر جھانکنے لگا۔ اب وہ کشادہ سڑک ویران ہوچکی تھی۔ سائلہ کا ملازم کار کے قریب سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ آصف حمزہ نے شوکیس سے اترتے ہوئے کہا۔ "تمہارا ملازم بڑے صبر و استقلال سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"وہ ملازم نہیں میرے.........." وہ کہتے کہتے ٹھٹک گئی۔ پھر ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "وہ میرے بھائی جان ہیں۔"

"ایں اچھا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یعنی کہ وہ سچ مچ تمہارے بھائی جان ہیں؟"

"میرے چچا کے صاحبزادے ہیں۔ تین برس پہلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ میرے ڈیڈی نے انکار کر دیا۔ اس لئے انہوں نے دوسری لڑکی سے شادی کرلی۔"

"پھر تو یہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر جلیں گے؟"

"نہیں۔ میری بھابی صاحبہ بہت سخت مزاج ہیں۔ مجھ سے یا تم سے جلیں گے تو وہ انہیں جلتے توے پر بٹھا دیں گی۔"

"اچھا میں شٹر اٹھا رہا ہوں۔ تم فوراً باہر جاکر کار کی ڈگی کھولو۔"

یہ کہتے ہی اس نے شٹر کو ذرا سا اٹھایا۔ سائلہ باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد اس کا بھائی اندر آیا۔ پھر اس نے آصف حمزہ کے ساتھ وہ گٹھڑی اٹھائی اور کار کی ڈگی میں لے جاکر رکھ دی۔

ایک نائٹ چوکیدار دور فٹ پاتھ پر چلا آرہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ "کون ہے رک جاؤ.........."

اس وقت تک وہ تینوں کار میں بیٹھ چکے تھے۔ چوکیدار کے قریب آنے سے پہلے ہی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ سائلہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ آصف حمزہ بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر سائلہ کا چچا زاد بھائی سہیل صادق بیٹھا ہوا پوچھ رہا تھا۔ "یہ صاحب کون ہیں۔ تعارف کراؤ۔"

"یہ انٹیلی جنس کے چیف آفیسر آصف حمزہ ہیں۔"

سہیل ایک دم سے گھبرا کر کبھی سائلہ کو اور کبھی آصف حمزہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ناصح بن کر کہا۔ "سائلہ! میں ہمیشہ تمہیں سمجھاتا رہا کہ چوری نہیں کرنا چاہئے مگر تم اپنی عادت سے باز نہیں آتیں۔ اب کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں تمہیں سمجھاتے ہوئے یہاں تک آیا ہوں۔ آصف صاحب مجھے بھی تمہاری طرح چور سمجھیں گے۔"

"آپ چپ چاپ بیٹھیں۔ آصف میرا ساتھ دے رہے ہیں۔"

اس وقت آصف کا دماغ پھر بولنے لگا۔ "میں سائلہ کا ساتھ کیوں دے رہا ہوں؟ میرا فرض ہے کہ میں اسے گرفتار کروں اور اگر محبت سے مجبور ہوکر گرفتار نہیں کرسکتا تو نہ

سہی۔ کم از کم مجھے سمجھانا تو چاہئے کہ یہ بری عادت ہے۔"

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ "سائلہ! تمہارے بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں۔ اس عادت سے تمہیں باز آنا چاہئے۔ تمہاری اداؤں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ مجھے کس حد تک تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔"

وہ کھٹک گئی۔ "اچھا تو یہ وہی ڈاکٹروں والی نصیحتیں کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی بات نہیں مانوں گی تو یہ میرا ساتھ نہیں دے گا۔ پھر میں یہ سارے زیورات پہن کر اپنا شوق پورا نہیں کر سکوں گی۔"

شوق کی بات آئی تو اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ارمان ضدی بچے کی طرح مچلنے لگے۔ "میں پہنوں گی میں ایک ایک کر کے سارے زیورات پہنوں گی۔ کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔"

دماغ ضد کر رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ آصف حمزہ ڈیش بورڈ سے اس کی ڈائری کھول کر پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے کہا۔ "اس میں میرا نام لکھا ہے۔"

سائلہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ میری محبت کا یہ ایک ثبوت ہے کہ میں پہلے بھی تمہیں چاہتی تھی۔ اب بھی تمہیں چاہتی ہوں مگر تم مجھے زیور پہنے نہیں دیکھ سکتے۔"

"کیوں نہیں۔ زیورات پہن کر تمہارے حسن کو چار چاند لگ جائیں گے لیکن زیورات خرید کر پہنے جاسکتے ہیں۔"

"میں خرید سکتی ہوں مگر چھین کر پہننے میں جو ایڈونچر ہوتا ہے ایک طرح کی تھرل ہوتی ہے۔ اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ تم میری بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔"

"میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک جاسوس کو صرف جرائم کی روک تھام کرنی چاہئے۔"

وہ پھر کھٹک گئی۔ "کھٹ کھٹ کھٹ" جیسے دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور ہوا کا زور سے چوکھٹ سے لگ کر کھٹ کھٹ بج رہا ہو۔ وہ فوراً ہی بولی۔ "آصف! تم نے اپنی طرف کا دروازہ اچھی طرح بند نہیں کیا۔"

"نہیں۔ یہ اچھی طرح بند ہے۔"

"میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔"

آصف حمزہ نے اس کی تسلی کے لئے دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنا چاہا۔ اسی وقت اسے زبردست جھٹکا پہنچا۔ کار ایک جھٹکے سے گھوم گئی تھی۔ وہ چیخ مارتا ہوا باہر کی طرف لڑھک گیا۔ سہیل نے آگے کی طرف جھک کر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ اس سے پیچھا چھڑانے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟"

"آپ چپ رہیں۔ میں بہتر سمجھتی ہوں۔"

"جب عورت پر زیورات کا جنون سوار ہوتا ہے تو اسے ایسی ہی حماقتیں بہتر نظر آتی ہیں۔ کیا وہ تمہیں بعد میں نہیں پہچانے گا۔ مجھے بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔"

"آپ اتنی سی بات سے گھبرا رہے ہیں۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس دکان کا مالک سجاد میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔"

"ایں؟" وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ کار کی چھت سے سر ٹکراتے ہی پھر بیٹھ گیا۔ "قتل؟ تم نے قتل کیا ہے؟ نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں۔"

"ہاں میں ایسا نہیں کر سکتی تھی لیکن ایسا کرنا پڑا۔ جس ہارڈ بورڈ کی دیوار سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس دیوار کو دھکا لگا۔ وہ اس کی زد میں آ کر چاقو کی نوک پر آیا تو میں نے بھی پوری قوت سے چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اگرچہ قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن آخری لمحے ارادہ ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ دکان کے منیجر کو اپنی اداؤں سے رجھاؤں گی۔ اسے چوری کے مال میں حصہ دار بناؤں گی لیکن وہ آصف حمزہ اچانک آ پہنچا۔ مجھے اس کے ساتھ رومانی ڈرامہ کھیلنا پڑا۔"

ایسا کہتے وقت ونڈ اسکرین کے پار تصور کی اسکرین پر اس نے خود کو آصف حمزہ کی آغوش میں دیکھا۔ دو مضبوط بازوؤں کے حلقہ میں قید بامشقت یاد آنے لگی۔ عورت صرف زیور ہی نہیں، خوبرو مرد کی محبت بھی پہننا چاہتی ہے۔

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی عقب نما آئینہ میں دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سہیل صادق آئینہ میں نظر آ رہا تھا۔ اس میں خوبروئی نہیں تھی۔ آصف حمزہ کے مقابلہ میں مچھر نظر آتا تھا۔ اس حسینہ نے کان کے پاس ہاتھ جھٹک کر خیالی مچھر کو اڑا دیا۔ وہ صرف

آصف حمزہ کو یاد کرنا چاہتی تھی لیکن سہیل نے مداخلت کی۔ "تم کہاں گم ہو۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔"

"آں۔" وہ چونک کر بولی۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"تم نے مجھے اور خود کو مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ایک تو تم نے قتل کیا۔ دو یہ کہ دوست بننے والے جاسوس سے دشمنی مول لی۔ آخر تم کس دماغ سے سوچتی ہ اس طرح فرار ہو کر قانون کے ہاتھوں سے بچ جاؤ گی؟"

"میں نہیں جانتی کہ مجھ سے کیسے قتل ہو گیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ قانون ہاتھوں سے کب تک بچتی رہوں گی۔ وہاں زیورات سے بھری ہوئی الماری کھلی تھی۔ میرا دماغ یہی کہہ رہا تھا کہ یہ سارے زیورات میرے ہو سکتے ہیں۔ شاید اسی لئے میں بے اختیار اسے قتل کر دیا۔"

"تم اس جاسوس کی بات کرو۔ وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں سکے گا لیکن مجھے پہچان لے اگر تم دوستی نبھالیتیں تو کیا نقصان ہوتا؟"

"بہت بڑا نقصان ہوتا۔ کیا آپ بھول گئے کہ ڈائری میں اسی آصف حمزہ کی تص تھی۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ لیڈی ڈاکٹر کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔ ابھی یہ نصیحتیں رہا تھا۔ اگر میں نصیحت پر عمل نہ کرتی تو یہ مجھے پولیس اسٹیشن پہنچا دیتا۔ اسی لئے میں اس سے نجات حاصل کر لی۔"

سہیل صادق اپنا سر تھام کر سوچنے لگا۔ عورت بھی کیا چیز ہے؟ مرد اسے خوش ر کے لئے رشوت لیتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے۔ ہیرا پھیری بھی کرتا ہے۔ سائرہ دماغی مر ہے۔ ماہرین نفسیات کی رپورٹ کو قائم رکھنے کے لئے میں کسی نہ کسی طرح سائر چرائے ہوئے زیورات واپس کرتا رہا۔ تاکہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ اس کا چچا زاد سہیل کوئی گھپلا کر رہا ہے۔ پولیس والوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد میں نے پچھلی چرائے ہوئے زیور کی تصویر اتاری۔ پھر ہو بہو ویسا ہی ایک زیور بنوایا۔ اس زیو سونے میں کھوٹ شامل کیا۔ نقلی ہیرے اور موتیوں سے اسے مکمل کیا۔ اتنے عرص میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پولیس والے واپس ملنے والے زیورات کو کہاں پرکھنے جاتے ہیں، میں نے اس پارکھ سے دوستی گانٹھ لی۔ اسے اپنے کاروبار کا حصہ دار بنا

اس لئے پچھلی بار اس نقلی زیور کو دیکھ کر اس کی اصل مالکہ دھوکہ کھا گئی۔

اس بار لاکھوں روپے کے زیورات ہاتھ آئے ہیں لیکن اس لاکھوں روپے کے منافع پر انسانی لہو کے چھینٹے پڑ گئے ہیں ایک عورت کے لالچ اور اس کی حماقت سے منافع بخش کاروبار خطرے میں پڑ گیا ہے۔

کار ایک کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں آ کر رک گئی۔ دونوں نے ڈگی کھول کر گٹھڑی نکالی۔ پھر اسے کوٹھی کے اندر لے گئے۔ ایک کمرے کے فرش پر گٹھڑی کو رکھنے کے بعد وہ غصہ سے بولی۔ "آپ مرد ہیں؟ کیا یہ گٹھڑی تنہا اٹھا کر نہیں لا سکتے تھے۔"

یہ کہہ کر وہ ہانپنے لگی۔ سوچنے لگی کہ آصف حمزہ ہوتا تو گٹھڑی کے ساتھ اسے بھی اٹھا لاتا۔ وہ پھر خوابوں میں کھو گئی۔ وہ آ رہا تھا اسے بڑی محبت سے اپنی آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔ یک بیک وہ چونک کر سہیل کو پرے ہٹا کر بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہیں، جائیے پہلے بچاؤ کی تدبیر کیجئے۔"

وہ سنگار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔ "کل......... کل سے میں برقعہ پہنا کروں گی۔ آپ کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جائیں یا شہر سے باہر چلے جائیں۔"

ایسا کہتے وقت اس کے دماغ نے کہا۔ "ہاں یہ بہتر ہے کہ سہیل گھر میں قید رہیں یا شہر میں نہ رہیں۔ میں اسی دوران آصف کو تلاش کروں گی۔ اس سے معافی مانگوں گی۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دوبارہ اسے مل کر خطرہ مول لینا چاہتی ہوں۔ بہرحال سہیل کو یہاں سے ٹال دینا چاہئے۔"

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ "میں نے دکان کے منیجر کو ان زیورات میں سے حصہ دینے کے لئے کہا تھا۔ اس طرح وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ میں پتہ بتا رہی ہوں۔ آپ اس کی گھر والی کو حصہ دے آئیں۔"

اس نے پتہ بتاتے ہوئے گٹھڑی کھولی۔ پھر اس میں سے کچھ زیورات الگ کر دیئے۔ اس کے دل میں خواہش مچل رہی تھی کہ آئینہ کے سامنے باری باری تمام زیورات کو پہن کر اپنے حسن کا جائزہ لے لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ جب سہیل کچھ زیورات لے کر چلا گیا تو اس نے باقی تمام زیورات کو آہنی الماری میں چھپا دیا۔ وہ بڑی

الماری کو کھول کر ایک سیاہ برقعہ نکالا۔ اسے پہن کر کوٹھی سے باہر آئی۔ پھر کار میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہوگئی۔

☆------☆------☆

آصف حمزہ کار کے کھلے دروازے سے گرنے کے بعد سڑک کے کنارے ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں جاکر الجھ گیا تھا۔ ستارے گردش میں آگئے تھے۔ اس لئے ایک پتھر سے ٹکراتے ہی وقتی طور پر ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا تھا۔

وہ شعوری طور پر غائب تھا۔ ایسے وقت لاشعور سپنے دکھاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ذہین اور فرض شناس سراغ رساں تھا۔ ثمینہ سے اس کی ملاقات ایسے دور میں ہوئی جب وہ مجرموں کے لئے دہشت بن گیا تھا۔ ثمینہ کی محبت نے اسے فرائض کی ادائیگی میں ذرا سا غافل بنادیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ کہیں کسی مجرم کا سراغ ملتا یا اس کے تعاقب کی ضرورت پیش آتی تو اتفاق سے ثمینہ کی زلفوں کا سایہ مل جانے کے باعث وہ تھک کر بیٹھ جاتا۔

اسے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ثمینہ کی فرمائشوں کی نذر ہوجاتی تھی۔ پہلے تو قرض لے کر روٹی کپڑے کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ پھر وہ قرض کی ادائیگی کے لئے رشوت لینے پر آمادہ ہوگیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو سچے اصولوں کو توڑ سکتے ہیں لیکن جھوٹی عورت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اسے انٹیلی جنس کے دفتر سے وارننگ ملنے لگی کہ راہِ راست پر آجائے، ورنہ ملازمت سے جائے گا۔ عورت کے لئے جب جنت چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر ملازمت کس شمار میں آسکتی ہے۔ ایک بار یوں ہوا کہ ایک رئیس زادے نے کسی کو قتل کردیا۔ وہ سزا سے بچنے کے لئے قتل کا الزام کسی دوسرے پر تھوپنا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اس نے ثمینہ کو ایک نئے ماڈل کی کار خرید کر دی۔ پھر تو وہ عورت آصف حمزہ کے کمزور اصولوں کے سامنے چٹان بن کر کھڑی کرہوگئی کہ قتل کی تفتیش کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جائے۔

آصف حمزہ نے سمجھایا۔ "ثمینہ! مقتول کے ورثا بھی دولت مند ہیں۔ وہ اپنے ذرائع سے اسے قاتل ثابت کرکے ہی دم لیں گے۔ تم اپنی ضد سے باز آجاؤ میری جان!"

لیکن میری جان نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے بال کھول دیئے۔ اسے مجبوراً قدموں سے اٹھا کر گلے لگانا پڑا۔ پھر اس نے اپنے طور پر تفتیش کا رخ موڑ دیا لیکن انٹیلی جنس کے ایک افسر نے اپنے طور پر تفتیش کرنے کے بعد سچائی کو بے نقاب کردیا۔ قاتل بھی پکڑا گیا اور رشوت خوری بھی ثابت ہوگئی۔

وہ صبح اور مکمل رپورٹ ابھی عدالت تک نہیں پہنچی تھی۔ آصف حمزہ کو پتہ چل گیا کہ وہ بھی حراست میں لیا جائے گا۔ یہ خبر ملتے ہی وہ بھاگا ہوا ثمینہ کے پاس پہنچا۔ ثمینہ کو توقع نہیں تھی کہ آصف حمزہ اچانک اتنی جلدی واپس آجائے گا۔ اس لئے وہ رئیس زادے کی آغوش میں دل بہلا رہی تھی۔ رئیس زادہ اس سے وعدہ کررہا تھا کہ سزا سے بچتے ہی وہ اس کے لئے ایک کوٹھی خریدے گا۔

مارے غصہ کے آصف حمزہ کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کررہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس کے دیوانہ وار قہقہوں کی گونج میں ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"ٹھائیں، ٹھائیں، ہاہاہا میں دیوانہ ہوں، جو اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا اور اپنی عاقبت بگاڑ لیتا ہے۔

ہاہاہا۔ ہم جیسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آج سے میں زندگی کی آخری سانس تک مرتا رہوں گا..........."

یہ کہتے ہی وہ چکرا کر ثمینہ اور رئیس زادے کی لاشوں کے پاس گر پڑا۔ اس کے بعد وہ آخری سانس تک زندہ رہ کر مرتے رہنے کے لئے ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

ہوش آتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ اس کے آس پاس مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ سائلہ کے ساتھ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر بند کرنے سے پہلے ہی گر پڑا تھا لیکن سائلہ اس کا بھائی اور وہ کار کہاں ہے؟

وہ چاند کی روشنی میں سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ کے اندر بیٹھے ہوئے سراغرساں نے کہا۔ "میں گرا نہیں، گرایا گیا ہوں۔ ایک عورت نے پھر مجھ سے فریب کیا ہے۔"

وہ غصہ سے تلملانے لگا۔ "میں نے اس پر بھروسہ کیوں کیا؟ میں تو اس مقصد فرار ہوا تھا کہ جو بھی حسین عورت ملے گی، اسے قتل کروں گا۔ پھر میں نے اسے کیوں نہیں کیا؟"

اس کے دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ شاید اس لئے کہ میں خوگرفتہ ہوں عادتاً حسین عورتوں کی اداؤں سے بہل جاتا ہوں۔ میں عادتاً جاسوس ہوں۔ اسی لئے ا گرفتار بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں پاگل ہوں۔ احمق ہوں۔ مجھے ساری عادتیں بھول کر انتقام کو یاد رکھنا چاہئے۔ میں سائلہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ جھاڑیوں سے نجات پا کر اٹھنے لگا تو گیلی زمین پر پڑی ہوئی ڈائری ہاتھ آ گئی۔ ا یاد آیا کہ کار سے گرتے وقت اس کے ایک ہاتھ میں وہ ڈائری تھی۔ اس فریبی عورت پتہ بتانے کے لئے وہ ڈائری اس کے ساتھ کار سے باہر چلی آئی تھی۔

آدھ گھنٹہ بعد جب وہ سائلہ کی کوٹھی کے سامنے پہنچا تو وہ مین گیٹ کے پاس ا کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آصف حمزہ نے آگے بڑھتے ہوئے ک "مکار عورت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اگر میں مکار ہوتی تو تمہارے انتظار میں یہاں کھڑی نہ رہتی۔"

وہ اس کی گردن دبوچنا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ واقعی وہ اس کے انتظار م کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ابھی میں یہاں آؤں گا؟"

"میں نے دیکھا تھا کہ تم ڈائری کے ساتھ کار سے گر پڑے ہو۔"

"کیا تم گاڑی روک کر میرے پاس نہیں آسکتی تھیں؟"

"نہیں سہیل بھائی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں گاڑی نہ روکوں۔ یقین کرو دل تمہاری طرف لگا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے سہیل کو دھوکہ دے کر کوٹھی سے آئی ہوں۔ میرا دل کہتا تھا کہ میری محبت سچی ہے۔ تم یہاں ضرور آؤ گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی مرمریں بانہوں کا ہار اس کی گردن میں پہنا دیا۔ وہ ایک سے پگھل گیا پھر وہی حسین عورت کی اداؤں سے بہل جانے کی عادت غالب آ گئی بولی۔ "آصف! میرے آصف یہاں سے فوراً چلو ایسا نہ ہو کہ سہیل یہاں پہنچ جائے۔"

آصف نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "ہم کہاں جائیں گے؟"

وہ سوچنے لگی کہ فی الحال سہیل سے دور رہ کر آصف کے ساتھ کہاں وقت گزارنا چاہئے۔ سوچنے کے دوران وہ دونوں خاموشی سے کچھ دور چلتے رہے۔ اسی وقت کتنی ہی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ روشنیوں کی زد میں آنے سے بچ گئے۔

گاڑیاں تیزی سے چلتی ہوئی سائلہ کی کوٹھی کو گھیرے میں لے رہی تھیں۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پولیس والوں کو قتل اور ڈکیتی کی واردات کا علم ہو چکا ہے۔ اس حسینہ کے پاس صرف اداؤں کے ہتھیار تھے۔ اس لئے وہ فوراً ہی آصف حمزہ سے لپٹ گئی تاکہ اس سراغ رساں کو اپنا فرض یاد نہ آئے۔

پھر رات کے سناٹے میں ایک پولیس افسر کی آواز گونجنے لگی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کہہ رہا تھا۔ "سائلہ! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ تمہارا بھائی سہیل صادق گرفتار ہو چکا ہے۔ اگر کوٹھی کے اندر تمہارے ساتھ کوئی ہے تو اس کے ساتھ چپ چاپ باہر چلی آؤ.........."

پولیس افسر کی یہ آواز آصف حمزہ کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن اسے اپنا فرض یاد نہیں آیا۔ کیونکہ اس کے سینے پر سائلہ کی جوانی دھڑک رہی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تمہاری ہوں۔ میرے بدن کا ذرہ ذرہ تمہارا ہے۔ مجھے قانون کے حوالے نہ کرو۔ ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔ پھر میں تمہیں اتنی خوشیاں، اتنا پیار دوں گی کہ تمہارے سامنے جنت پھیکی پڑ جائے گی۔"

آدمی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ جنت کی تلاش میں جنت سے دور نکل جاتا ہے۔ وہ بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک پُرفریب جنت کا ہاتھ تھام کر بھاگتا چلا گیا۔ بھاگنے کے دوران وہ برقعہ سنبھالتی ہوئی سوچنے لگی۔ "ہائے ساری محنت اکارت گئی۔ جس الماری میں، میں نے زیورات چھپائے ہیں۔ وہاں تک میں نہیں جاسکتی۔ جب سہیل گرفتار ہو چکا ہے تو پولیس والے اس سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔ اس الماری تک بھی شاید پہنچ چکے ہوں گے۔"

وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر تقریباً روتے ہوئے بولی۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا تمہارے پاس پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے؟"

"نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں پولیس والے مجھے بھی تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"تو پھر چلو۔ ایک نرس میری سہیلی ہے۔ ہم فی الحال اس کے ہاں پناہ لے
ہیں۔"

اس کالونی سے باہر پہنچتے ہی انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ تمام راستے وہ خاموش رہے کیونکہ وہ ڈرائیور کی موجودگی میں موجودہ حالات پر گفتگو نہیں کرسکتے تھے۔ سہیلی کے پہنچ کر اسے حالات کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ دونوں بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ اس نے پناہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ وہ تنہا رہتی تھی۔ وہاں کوئی ان کی موجودگی پر اعتراض کرنے والا نہ تھا۔ اس نے دونوں کے لئے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔

آصف حمزہ نے حالات کا تجزیہ کرنے کے لئے پوچھا۔ "وہ تمہارا سہیل بھائی کیسے گرفتار ہوگیا؟ تم اسے کہاں چھوڑ کر آئی تھیں۔"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دکان کے منیجر کا حصہ اس کی بیوی تک پہنچادے۔ میرا خیال ہے کہ منیجر نے پولیس والوں کے سامنے حقیقت اگل دی ہے۔ پولیس والے فوراً منیجر کے گھر گئے ہوں گے۔ اس طرح سہیل کو وہاں گرفتار کرلیا ہوگا۔"

یہ کہتے ہی وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑی۔ "ہائے میں بہت تھک گئی۔ ذرا یہ برقعہ اتار دو۔"

آصف حمزہ نے خواب گاہ کا دروازہ بند کردیا۔ پھر واپس آکر برقعہ اتارنے لگا۔

☆------☆------☆

سائلہ کے معنی ہیں سوال کرنے والی۔ اس کی خوابیدہ خوابیدہ سی آنکھیں بڑی خاموشی سے سوال کرتی رہتی تھیں کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟

وہ چور اچکی کہلاتی تھی۔ دنیا والے اس کے سوال کے جواب میں اسے چور کہتے اور شاید بے حیا بھی کہہ دیتے لیکن وہ ایسی حیا والی تھی کہ غیر مردوں کے سائے سے کتراتی تھی۔ آصف جمال نے اسے بلیک میل کرنا چاہا اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے چلتی گاڑی سے اسے نیچے گرا دیا۔

اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور شخص اس کا چچازاد بھائی سہیل تھا۔ سہیل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی چوری کی عادت چھڑا دے گا۔ اگر ناکامی ہوئی تو پھر وہ کے سلسلہ میں اس کا ساتھ دے گا۔ اسے قانون کے پنجے سے بچالیا کرے گا۔ اس کی

تھی کہ سائلہ اس سے شادی کرلے۔

لیکن ان دنوں سائلہ کا باپ زندہ تھا۔ اس نے شادی کی مخالفت کی۔ وہ اپنے بھتیجے سہیل کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی عادتیں اور زیادہ بگاڑ دے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ سہیل نے مایوس ہوکر ریحانہ سے شادی کرلی۔ جب سائلہ کے ڈیڈی کا انتقال ہوگیا اور وہ کوٹھی میں تنہا رہنے لگی تو سہیل اور ریحانہ اکثر اس کے پاس آکر اس کی دل جوئی کرنے لگے۔

وہ محبت کی بھوکی تھی۔ اسے بھائی اور بھاوج کا پیار ملا تو انہیں اپنا سمجھ کر دل کی باتیں اگلنے لگی۔ جب بھی وہ کسی کا زیور چراتی اور جب اسے پہن کر اس کا دل بھر جاتا تو سہیل اسی زیور کو اس کی اصل مالکہ تک معذرت کے ساتھ پہنچا دیتا۔

جب وہ سیٹھ کریم کی کوٹھی سے زیورات لے کر فرار ہوئی تو اس چوری کی خبر اخبارات تک پہنچ گئی۔ اسی وقت آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی اور دوسرے دن اس پر نیت خراب کی تھی۔ یہ تمام باتیں وہ سہیل اور ریحانہ کو بتا چکی تھی لیکن اس بار وہ دونوں اسے عدالت تک جانے سے نہ بچاسکے۔ پھر بھی جیل جانے سے بچا لیا۔ اس کے وکیل نے ثابت کردیا کہ وہ دماغی مریضہ ہے۔

وہ کچھ عرصہ مینٹل ہسپتال میں زیرِ علاج رہی اور ہمیشہ نارمل ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔ لہٰذا اسے ہسپتال سے اس طرح چھٹی دی گئی کہ اس کی نگرانی کے لئے ایک شخص کو مقرر کردیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک تقریب میں ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس بار سہیل نے بھی اپنا کمال دکھایا۔ چوری کے زیور کی ہو بہو نقل تیار کی۔ پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ پولیس والے زیورات کو پرکھنے کے لئے جس پارکھ کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ پارکھ سہیل کا بزنس پارٹنر بن گیا تھا۔

سائلہ نے پھر کچھ دنوں کے بعد بیگم حشمت بیگ کے نیکلس پر ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ تقدیر اچھی تھی کہ بیگم کی قاتلہ بننے سے بال بال بچ گئی اور دوبارہ پاگل خانہ پہنچا دی گئی۔ وہاں اس کے دماغ کو برقی جھٹکے پہنچائے گئے۔ دماغ کو جھٹکے پہنچنے کے بعد اسے اپنا بچپن یاد آیا۔

اسے یاد آیا جب وہ نو برس کی تھی تو ایک شام اس کی ممی نے کسی پارٹی میں جانے

کے لئے زیورات پہن رکھے تھے۔ اس کے ڈیڈی نے سائلہ کو بچی سمجھ کر اس کے
اس کی ممی کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میری جان! عورت زیورات کے بغیر مکمل
ہوتی۔ اب تم مکمل ہو............"

سائلہ نے کہا۔ "ممی! میں بھی زیور پہنوں گی۔"

ممی نے ڈانٹ کر کہا۔ "بچے نہیں پہنتے۔ ہربات کی ضد نہ کیا کرو۔"

ڈیڈی نے کہا۔ "بھئی ایک نیکلس پہنا دو۔ میری بیٹی اچھی لگے گی۔"

"آپ اسے سر پر نہ چڑھائیں۔ بھلا اسے کون پسند کرنے آرہا ہے کہ یہ ابھی زیور پہنے گی؟"

یہ کہہ کر ممی اس کے ڈیڈی کو لے کر چلی گئی۔ سائلہ کے ننھے سے دماغ میں دو بھرنے لگا۔ ایک تو ممی نے اسی چیز پر قبضہ جما رکھا تھا' جسے پہننے سے ڈیڈی انہیں پیار کر تھے۔ دوسرے یہ کہ پیار کرنے والے ڈیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔

اس کا ذہن جیسے کسی آگ پر کھولتا رہا۔ ایک دن اس نے ممی کی غیر موجودگی سنگار میز کی دراز سے ایک نیکلس چرا لیا۔ اسے پہن کر ڈیڈی کو دکھایا تو انہوں نے کرتے ہوئے خوب تعریف کی۔ پھر سمجھایا۔ "بیٹے تمہاری ممی کو معلوم ہوگا تو نار ہوجائیں گی۔ اس نیکلس کو چپکے سے واپس رکھ دو۔"

پھر اس کے دماغ میں یہ بات نقش ہوگئی کہ زیور چرا کر پہننا اتنی بری بات نہیں کیونکہ اسے واپس رکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح شوق بھی پورا ہوتا ہے۔ پھر چوری کے مراحل سے گزرتے وقت عجیب سی سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ ممی کو بے وقوف بنانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

جب وہ جوان ہوئی اور اسے زیور پہننے کے لئے دیئے گئے تو اسے اچھا نہ لگا۔ کیونکہ ممی کا انتقال ہوچکا تھا۔ سیدھی طرح خریدے ہوئے یا تحفہ کے طور پر آئے ہوئے زیورات پہننے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ممی جیسی دوسری عورتوں کو بے وقوف بنا کر زیورات پہنے جائیں۔ بچپن کا ضدی دماغ اب جنون میں مبتلا ہوگیا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں جو دستور بن گیا تھا' جو طریقہ کار پسند آگیا تھا' اب اسی طریقہ پر چلنے کے لئے اس پر جنونی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

برقی جھٹکے کھانے کے بعد سائلہ نے یہ بیان دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ خود اپنی کوششوں سے اس بری عادت کو چھوڑ دے گی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے پھر رہائی مل گئی۔ سہیل اور ریحانہ پاگل خانہ آئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

سائلہ نے اپنے وعدہ کے مطابق اس بری عادت سے باز رہنے کی کوشش جاری رکھی لیکن سہیل اس کے لئے دردِ سر بن گیا تھا۔ وہ تنہائی میں موقعہ پا کر اس کے قریب آنا چاہتا تھا اور وہ کتراتی رہتی تھی۔ ایک بار اس نے ریحانہ بھابی سے شکایت کر دی۔ ریحانہ نے اپنے میاں کی اچھی طرح خبر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے ایک شریف آدمی بن گیا۔

لیکن سائلہ مطمئن نہیں تھی اور سہیل سے پیچھا چھڑانے کے لئے سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

☆------☆------☆

وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی زلفیں تکیہ پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت' یہ کھلے کھلے سے گیسو
تیری صبح کہہ رہی ہے' تیری رات کا فسانہ

دھوپ کھڑکی کے راستے بستر تک پہنچ رہی تھی' آصف حمزہ نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔ "اب اٹھ بھی جاؤ۔ ذرا اپنی سہیلی سے کہو کہ چائے پلا دے۔"

پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری سہیلی سمجھ دار ہے۔ اس نے دستک نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے اخبار پہنچا دیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ آخری صفحہ پر پچھلی رات کے ایک قتل اور ڈکیتی کی خبر تفصیل سے شائع ہوئی تھی۔ وہ توجہ سے پڑھنے لگا۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی بولی۔ "کیا وہ اخبار مجھ سے زیاد دلچسپ ہے۔"

آصف حمزہ نے غصہ سے اخبار کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "کیا بات ہے۔ تم مجھے غصہ سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

وہ دانت پیس کر بولا۔ "ذلیل، کمینی عورت تو اب تک مجھے محبت کا فریب دے
تھی۔ سہیل کو بھائی کہنے والی بدکار عورت تُو نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ وہ تیرا یار ہے
تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے بستر کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ پلنگ کے دوسری طرف چلی
پھر دور بھاگتی ہوئی بولی۔ "میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں
بھی مجھے چاہتے ہو۔ خواہ مخواہ دھمکی نہ دو۔"

اس نے غرا کر کہا۔ "یہ دھمکی نہیں ہے۔ تجھ سے پہلے بھی ایک اور حسین عو
نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ کسی دوسرے کو یار بنا لیا تھا۔ میں نے اسے قتل کر دیا
تجھے بھی تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

اس پر واقعی جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں انتقام پکار رہا تھا۔ وہ تیزی
آگے بڑھا لیکن سامنے والی نے ایک کرسی آگے کر دی۔ وہ الجھ کر گر پڑا۔ پھر تلملا کر
لگا۔ اتنی دیر میں وہ دروازہ کھولنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ "تم یقین کرو۔ میں
سے پیچھا چھڑا کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"اور میں تمہارے لہو سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں۔ میں قاتل ہوں۔ اب
تمہارے جیسی حسین عورتوں کو معاف نہیں کروں گا۔"

وہ بھاگتی ہوئی اپنی سہیلی کو پکارتی ہوئی مکان سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ سہیلی اس
مدد کے لئے موجود نہیں تھا۔ کہیں چلی گئی تھی۔ اب بھاگتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ
تھا۔ جو پچھلی شب کا ہمسفر تھا' وہ ایک جنونی قاتل کے روپ میں اس کا تعاقب کر رہا تھا

اس کو خیال آیا کہ اس کی زلفیں بکھری ہوئی ہیں اور وہ نائٹ گاؤن میں ہے۔ لو
حیرانی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی اس کے قریب آکر رک گئی۔ ڈرائیور
پوچھا۔ "آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟"

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "جلدی چلو۔ ایک قاتل میرا پیچھا کر
ہے۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بہت دور آصف حمزہ بھی ایک ٹیکسی
دروازہ کھول کر بیٹھ رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "تیزی سے چلاؤ۔ وہ بھی ایک ٹیکسی میں

ہے۔"

ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بی بی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آپ
کو پولیس اسٹیشن پہنچاؤں گا۔ وہاں آپ محفوظ رہیں گی۔"

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ تھانے کی طرف جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ خود کو
گرفتاری کے لئے پیش کرے۔ پولیس والے تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھے وہ پھر پیچھے
پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پیچھے کھڈا اور آگے کھائی تھی۔ نہ اِدھر جا سکتی تھی' نہ اُدھر' وہ ہچکچاتی
ہوئی بولی۔ "نہیں۔ میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ دوسری جگہ لے چلو۔"

"بی بی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ قاتل سے بچنا چاہتی ہیں اور پولیس کی مدد
بھی لینا نہیں چاہتیں' بات کیا ہے؟"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک سڑک سے دوسری سڑک پر بھاگی جا رہی تھیں۔ اس
سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ٹیکسی آہستہ آہستہ جھٹکے کھانے لگی۔ شاید کوئی خرابی پیدا
ہو گئی تھی۔ قسمت خراب ہو تو راستے میں ایسی ہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹیکسی رکی تو وہ
دروازہ کھول کر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگی۔ آس پاس بچوں کا شور سنائی دیا۔ "پگلی ہے۔ پگلی
ہے۔ مارو۔ اسے مارو.........."

اس کے ساتھ ہی دو چار پتھر اس کی طرف آئے وہ اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ کچھ
دیر بھاگتے رہنے کے بعد آصف حمزہ کی گرجدار آواز سنائی دی۔ "رک جا مکار عورت! تُو
مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گی۔"

مارے دہشت کے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ تب اس نے دیکھا سامنے پاگل خانہ کا
بڑا سا دروازہ تھا۔ بچے اسے پگلی سمجھ کر پتھر مار چکے تھے۔ اس کی حالت بھی پگلیوں جیسی
تھی۔ دماغ نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ پگلی بن کر ہی قانون اور قاتل دونوں سے بچ سکتی
ہے۔

زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقعہ نہیں تھا۔ وہ دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری کو دھکا
دیتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سنتری اس غیر متوقع دھکے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے گر پڑا۔
جب دوبارہ اٹھا تو دوبارہ دھکا لگا۔ وہ پھر زمین بوس ہو گیا۔ اس بار آصف حمزہ اس سے
ٹکراتا ہوا گزر گیا تھا۔

وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ جیل خانہ گیا ہے۔ یا پاگل خانہ کے اندر؟ اب بھی اس کی حیثیت جاسوس کی ہے یا مجرم کی کے دماغ کے اندھیرے میں صرف ایک حسین عورت نظر آ رہی تھی، جسے قتل کر بعد ہی وہ اچھے برے کی تمیز کر سکتا تھا۔

پاگل خانہ کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ وہاں کے سپاہی دو بھاگنے وال پکڑنے کی کوششیں کرتے ہوئے چلا رہے تھے۔ "پکڑو۔ پکڑو۔ بچ کر بھاگ پائے.........."

آصف حمزہ کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ لوگ اس حسینہ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ جب گرفتار ہو جائے گی تو اس کے سامنے پیش کی جائے گی کہ لیجئے حضور! اب آپ اسے سے قتل کر دیں.........

اگر دماغ ہمیشہ غلط سمت رہنمائی کرے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ نہیں ہے۔ بے شک وہ نارمل نہیں تھا۔ دماغ کے اندھیرے میں دوڑتے دوڑتے سلاخوں سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟

ایک طویل بے ہوشی کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو آہنی سلا کے پیچھے زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ ایک ڈاکٹر اور چار مسلح سپاہی اس کے سامنے کھڑ ہوئے تھے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بے وفا عورت سے بچ کر نہیں جا سکتی۔"

وہ چیخنے کے دوران اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر رہا تھا لیکن زنجیریں موم بنی ہوئی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "تم نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ تم اپنے سا ایک اور پاگل کو لے کر فرار ہو گئے تھے۔ بہرحال وہ تو پکڑا گیا مگر تم انٹیلی جنس کے ای آفیسر کو ہلاک کر کے اس کا شناختی کارڈ لے کر آزادی سے گھومتے رہے۔ تین دن کے بع مختلف ہوٹلوں سے یہ رپورٹ ملی کہ تم کھانے کے بعد بل ادا کرنے کے بجائے انٹیلی جن کے آفیسر کا کارڈ دکھا کر چلے جاتے ہو۔

ہمیں اندیشہ تھا کہ تم اس شہر کی حسین عورتوں کو قتل کرو گے۔ اپنے انتقام کی آ بجھاؤ گے۔ پولیس والے تمہیں تلاش کر رہے تھے لیکن تم نظر نہیں آ رہے تھے۔ آ

انٹیلی جنس والوں نے مشورہ دیا کہ اگر ایک چوہیا کو آزاد کر دیا جائے تو بلا فطرتاً اور ضرورتاً اس کا پیچھا کرے گا۔ تم عادتاً ایک سراغرساں ہو۔ سائلہ جیسی چور لڑکی کا پیچھا ضرور کرتے اور ہماری نظروں میں آجاتے۔ لہٰذا ہم نے پاگل خانہ سے سائلہ کی چھٹی کر دی۔ عادت بدل جاتی ہے لیکن عادت فطرت بن جائے تو تمہارے جیسا خوگرفتہ انسان خطرناک پاگل بن جاتا ہے ہم تمہاری سراغرسانی کی عادت سے تمہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن تم انتقام لینے والے عاشق بن کر ہمارے دام میں آئے ہو۔"

ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور آصف حمزہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "افسوس کہ تم انتقام کی آگ بجھانے کے لئے اسے قتل نہ کر سکے لیکن قانوناً اسے موت کی سزا ملے گی۔"

"نہیں۔ قانون اسے نہیں مار سکتا۔ اس مکار اور بے وفا عورت کو میں قتل کروں گا.........."

وہ حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا اور زنجیریں توڑنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔

☆------☆------☆

لیڈی ڈاکٹر نے کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے خوب صورت سی ساڑھی پہنی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی زیورات کی جگمگاہٹ میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے شوہر نے آگے بڑھ کر اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "زیورات پہننے کے بعد عورت کا حسن مکمل ہو جاتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ حسین چہرے پر جھک گیا لیکن قدموں کی آہٹ پاتے ہی فوراً الگ ہو گیا۔ دونوں نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازے پر سائلہ کھڑی ہوئی تھی۔

"سائلہ تم؟" لیڈی ڈاکٹر شرماتی ہوئی بولی۔ "تم اب تک نارمل نہیں ہو تمہیں یہ بھی سکھانا ہو گا کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے دستک دینا چاہئے۔"

سائلہ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "آج کا اخبار پڑھ کر میں الجھ گئی ہوں۔ جیولری کی دکان کا منیجر اپنے بیان میں میرا نام لیتا ہے اور ریحانہ بھابی کو شناخت کرتے ہوئے انہیں سائلہ کہتا ہے، آخر یہ کیا چکر ہے؟ کیا میری بھابی نے سجاد کو قتل کیا ہے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے شانہ پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں سائلہ! میں اسی

لئے تمہیں سمجھاتی آرہی ہوں کہ تمہیں چوری اور چھینا جھپٹی کی عادت سے باز آنا
تم اتنی معصوم ہو کہ ساری باتیں اپنے بھائی اور بھابی کو بتادیا کرتی تھیں' ان معلومات
فائدہ اٹھا کر انہوں نے یہ سنگین جرم کیا ہے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو تاکہ آئندہ
مجرم تمہاری اس عادت سے فائدہ نہ اٹھائے۔"

سائلہ کی آنکھیں احسان مندی سے بھیگ گئیں۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سے لپٹ کر رو
لگی اور کہنے لگی۔ "آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ آپ میرا ساتھ نہ دیتیں تو
دونوں مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دیتے........."

لیڈی ڈاکٹر اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلیاں دینے لگی۔ وہ دوپٹے سے اپنے
آنسو پونچھتے ہوئے الگ ہوگئی۔ "ڈاکٹر باجی! میں نادم ہوں۔ آئندہ دستک دے کر
کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے بھیگی آنکھوں سے اپنی ڈاکٹر
کو دیکھا۔ آنسو پونچھنے کے لئے اس کے دونوں ہاتھوں میں دوپٹہ ابھی تک سمٹا ہوا تھا۔
وہ چلی گئی۔

لیڈی ڈاکٹر کے شوہر نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "شکر ہے کہ جلدی چلی گئی۔
اب ہمارا رومانس ادھورا نہیں رہے گا۔"

وہ اپنی بیوی کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹک کر بولا۔ "ارے تمہارا
گلے کا ہار کیا ہوگیا؟"

لیڈی ڈاکٹر نے چونک کر آئینہ میں دیکھا تو ہار غائب تھا۔

"میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

وہ غصہ میں جانے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ "جانے
دیجئے۔ وہ بے چاری مجبور ہے۔ دوچار روز کے بعد واپس کردے گی۔ میں اس کی ہسٹری
شیٹ سے واقف ہوں۔"

"لیکن........." اس کے شوہر نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی بانہوں کا ہار پہناتی ہوئی
بولی۔ "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میرا سنگار تو آپ ہیں۔"

☆------☆------☆

بیچارے

ان جڑواں بھائی بہن کی عجیب کہانی جو دنیا میں اکٹھے آئے تھے اور مرتے دم تک اکٹھے ہی رہنا چاہتے تھے۔ دنیا والے انہیں اکٹھا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

المناک انجام کی ایک فکر انگیز کہانی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے جیسے دو دوست آپس میں بغ
ہوتے ہیں یا ایک مرد' عورت کو سینے سے لگاتا ہے۔ اسی طرح دونوں کے سینے ا
دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ صرف آپریشن کے ذریعے الگ کئے جاسکتے ہیں لیکن میں اس بات کی ضما
نہیں دے سکتا کہ یہ آپریشن کے بعد زندہ رہ سکیں گے یا نہیں۔"

سیٹھ غفار بھائی کی ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ بیگم غفار سیٹھ نے ر
شروع کر دیا۔ دونوں میاں بیوی دس برس تک اولاد کے لئے ترستے رہے تھے۔ ا
کروڑوں کے مالک تھے۔ ملک کے باہر بھی ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا وہ جہاں جاتے تھ
دنیا کی ہر خوشی خرید لیتے تھے لیکن دنیا کے کسی بازار سے اولاد کی خوشیاں نہ خرید
تھے۔ بہت منتوں اور مرادوں کے بعد شادی کے گیارھویں برس بیگم غفار سیٹھ کے پاؤ
بھاری ہوئے تھے۔ جیسے جیسے زچگی کے دن قریب آتے جارہے تھے سیٹھ غفار بھائی خو
سے دیوانے ہوتے جارہے تھے۔ ان کے در سے کوئی سوالی مایوس ہو کر نہیں جاتا تھا۔ ا
اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر انہوں نے کسی کا دل توڑا تو کہیں اس کی بد دعا نہ لگ
جائے۔ بیگم غفار سیٹھ نے اپنی عالیشان کوٹھی کے ایک بہت بڑے کمرے کو ٹوائے لینڈ
رکھا تھا۔ بچہ ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا مگر وسیع و عریض کمرہ دنیا جہاں کے کھلونوں سے آ
ہو گیا تھا۔

ایسی ہی امیدوں اور آرزوؤں کے بعد پچھلی رات شہر کے سب سے بڑے اسپتال
میں اس کے بطن سے جڑواں بچوں نے جنم لیا۔ وہ اس حالت میں پیدا ہوئے کہ سینے کی
طرف سے گوشت کا کچھ حصہ جڑا ہوا تھا اور وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان
میں سے ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی تھی۔ دونوں بچے بے حد خوبصورت تھے۔ اگر بچے

غفار سیٹھ کے اختیار میں ہوتا تو وہ انہیں اسی طرح پال پوس کر جوان کر دیتی لیکن یہ ناممکن تھا۔ وہ بچے اس طرح آپس میں چپکے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ آپریشن لازمی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ آپریشن کی ناکامی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ بہت مجبوری تھی اس لئے ماں باپ نے رو رو کر آپریشن کی اجازت دے دی جب بچوں کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تو سیٹھ غفار بھائی نے ایک سادے چیک پر دستخط کر کے اسے ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ اس چیک پر پچاس لاکھ روپے کی رقم لکھ کر بھی کیش کرا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر آپ میری محرومیوں کو سمجھتے ہیں۔ جب بچے نہ ہوں گے تو یہ دولت کس کام آئے گی۔ دولت تو اولاد کے لئے ہی کمائی جاتی ہے اور میں اولاد کے لئے ہی اسے خرچ کر رہا ہوں۔ آپ اسے قبول کریں اور کچھ اس طرح آپریشن کریں کہ ہمارے دونوں بچے زندہ سلامت ہمیں واپس مل جائیں۔"

ڈاکٹر نے وہ چیک واپس کرتے ہوئے کہا۔

"میں پوری دیانتداری سے اپنا فرض ادا کروں گا اور آپریشن کے وقت اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لوں گا۔ اگر کامیاب ہو گیا تو آپ جو انعام دیں گے اسے قبول کر لوں گا ناکامی کی صورت میں انعام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ سیٹھ غفار بھائی کی تمام ملوں کے منیجر' جنرل منیجر اور دوسرے ملازمین ہسپتال کے اندر اور باہر پھیلے ہوئے تھے۔ ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ سیٹھ غفار بھائی نے ان سے التجا کی کہ وہ مسجدوں میں جا کر دعا مانگیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ اس شہر کا کوئی بھی غریب آج کی رات بھوکا نہ سوئے۔ اس سلسلے میں جتنے روپوں کی ضرورت ہے وہ ابھی اور اسی وقت ان کے خزانے سے وصول کر لیں۔

جب تک آپریشن ہوتا رہا وہ اسپتال کے باہر ایسے کاموں میں مصروف رہے جن کے نتیجے میں انہیں اور ان کی اولاد کو دعائیں مل سکتی تھیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر سے باہر آکر ان سے کہا۔

"فی الحال آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ ابھی انہیں آکسیجن پر رکھا گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے

کے بعد میں ان کے متعلق کوئی بات یقین سے کہہ سکوں گا۔"

ماں باپ کے لئے وہ چوبیس گھنٹے قیامت بن کر گزرنے لگے۔ کبھی انہیں مایوسی تھی کبھی امید کے ہاتھ ان کے آنسو پونچھتے تھے۔ کسی لمحے وہ دونوں مرتے تھے کسی لمحے دونوں جیتے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ چوبیس گھنٹے گزر گئے۔ ڈاکٹر نے آ کر خوشخبری سنائی بچے زندہ رہیں گے لیکن انہیں دن رات مسلسل توجہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ابھی کچھ روز نرسوں کی نگرانی میں پرورش پائیں گے۔ سیٹھ غفار بھائی نے خوش ہو کر کہا۔ "اتنے دنوں کی بات ہے مگر آپ نے یہ کہہ کر ہمیں دوبارہ زندگی دی ہے کہ اب ہم صاحب اولاد ہیں اور اولاد کی خوشیاں دیکھتے رہیں گے۔ ڈاکٹر آپ انعام کے مستحق ہیں۔ اب آپ اس چیک کو قبول کرلیں۔"

ڈاکٹر نے چیک لے کر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اس بات پر فخر ہے کہ میں نے ایک کامیاب آپریشن کیا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، میں دن رات ان بچوں پر توجہ دوں گا اور ان کی طویل عمری کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

پھر وہ بچے اسی اسپتال میں نرسوں کی زیرِ نگرانی پرورش پانے لگے لیکن ان کی دیکھ بھال کرتے وقت نرسوں کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے اگر ایک بچہ روتا تھا تو دوسرا بھی رونے لگتا تھا۔ اگر ایک کو بھوک لگتی تو دوسرا بھی بھوک سے تلملانے لگتا۔ جب ایک کو شہد چٹایا جاتا تو دوسرا بھی مطمئن ہوجاتا اور بڑے اطمینان سے اپنی باری کا انتظار کرتا کہ اب اسے بھی شہد چٹایا جائے گا۔ نرسوں کے مشاہدے میں عجیب عجیب سی باتیں آتی تھیں۔ وہ دیکھتی تھیں کہ اگر ایک کی بھوک مٹ جاتی تو دوسرا بھی مطمئن ہوجاتا تھا۔ پھر وہ شہد چاٹنے یا دودھ پینے کے لئے نہیں روتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد بیگم غفار سیٹھ ان پھول سے بچوں سے لدی ہوئی اپنے گھر آگئیں۔ [illegible] کی پیدائش کی خوشی میں کئی روز تک جشن منایا گیا۔ غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کی گئیں اور تمام ملازمین کو ایک سال کا بونس دیا گیا۔ جب ان بچوں کے نام رکھے گئے تو ان کے نام سے مختلف شہروں میں کتنے ہی ہسپتال، یتیم خانے اور اسکول کھولے گئے۔ لڑکے کا نام عامر رکھا گیا اور لڑکی امبر کے نام سے پکاری جانے لگی۔

عامر اور امبر ایک قالب اور دو جان تھے۔ جب وہ بالکل ننھے سے تھے اور اس دنیا کے کسی رشتے اور کسی محبت کو نہیں سمجھتے تھے، اس وقت بھی وہ ایک دوسرے سے الگ رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں ایک ہی پالنے میں سلایا جاتا تھا اگر امبر کو نیند آتی تو عامر بھی سوجاتا تھا اور اگر عامر کی آنکھ کھلتی تو امبر بھی جاگ جاتی تھی۔ یوں بھی ماں باپ کے لئے ننھے بچے دلچسپ کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں اور وہ دونوں تو ضرورت سے زیادہ دلچسپ تھے۔ ہر روز ماں باپ کو نت نئے تماشے دکھاتے تھے۔ جب وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگے تو کسی حد تک ایک دوسرے کو پہچاننے بھی لگے۔ اگر انہیں کہیں الگ چھوڑ دیا جاتا تو وہ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے پھر ایک جگہ آکر مل جاتے تھے پھر وہ اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہونے لگے اور کوٹھی کے لان تک پہنچ کر کھیلنے لگے۔ محلے پڑوس اور رشتہ داروں کے کتنے ہی بچے وہاں کھیلنے آتے تھے لیکن عامر اور امبر کی دنیا ہی الگ تھی۔ وہ کسی بھی بچے کو وقتی طور پر دوست بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ان بچوں سے دور چلے جاتے تھے۔ جب وہ ذرا اور بڑے ہوئے تو ماں باپ نے انہیں سمجھایا کہ انہیں دوسرے بچوں سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہئے اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے دوسروں سے بھی دوستی اور محبت کرنا ضروری ہے۔ ماں باپ کے سمجھانے پر انہوں نے دوسرے بچوں سے دلچسپی لینے کی کوشش کی لیکن وہ اداس اداس سے رہے۔

شام کو اسکول سے واپس آکر امبر نے عامر سے شکایت کی۔

"تم اسکول کے پارک میں شازیہ کے ساتھ کھیلتے رہے۔ کیا وہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "شازیہ تو کیا تمہارے بنا ٹافیاں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر وہ کہنے لگی کہ میرے ساتھ نہیں کھیلو گے تو میں تمہارے ڈیڈی سے شکایت کردوں گی۔"

امبر نے کہا۔ "ہاں! جاوید بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔ وہ بھی ڈیڈی سے شکایت کرنا چاہتا تھا۔ عامر، ڈیڈی ہمارے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ وہ ہمیں ایک دوسرے سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ میں تم سے الگ نہیں رہ سکوں گی۔ اگر ڈیڈی نے مجبور کیا تو میں اسکول نہیں جاؤں گی۔"

عامر نے کہا۔ "میں بھی اسکول نہیں جاؤں گا۔"

دونوں بھائی بہن نے فیصلہ کرلیا کہ جو اسکول انہیں ایک دوسرے سے جدا کر
وہ وہاں نہیں جائیں گے۔ جب ماں باپ کو ان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ انہیں سمجھ
لگے۔

"اسکول نہیں جاؤ گے تو تعلیم کیسے حاصل کرو گے۔ اچھے بچے بڑے شوق سے
حاصل کرتے ہیں۔"

امبر نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ وہاں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے"

عامر نے کہا۔ "میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا تو صرف امبر کے ساتھ کھی
گا۔"

"میں بھی جاؤں گی تو عامر کے ساتھ بیٹھ کر پڑھوں گی۔"

وہ دونوں باری باری ضد کرنے لگے۔ وہ ماں باپ کے لاڈلے بچے تھے۔ ماں
کہا۔

"دونوں بھائی بہن ساتھ کھیلنا اور ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں آخر بھائی بہن ہیں۔
ایک دوسرے کو چاہیں گے' اتنی چاہت کسی دوسرے بچے سے نہیں ہوگی۔ ان کی ضد
ہے۔ آپ انہیں مجبور نہ کریں کہ یہ دوسروں کو بھی اپنے کھیل میں شریک کیا کریں۔"

باپ نے انہیں اجازت دے دی۔ وہ پھر ایک ساتھ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کو
لگے۔ بارہ برس تک یہ حالت تھی کہ ان کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایک دوسرے سے الگ
رہ کر نہیں گزرتا تھا۔ حتیٰ کہ رات کے وقت بھی جس طرح وہ پالنے میں ایک ساتھ
سوتے تھے اسی طرح اب بھی ایک بستر پر سوتے تھے۔ بھائی بہن کی یہ محبت سب سے
ماں کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہونے والے تھے۔ ان کے د
میں لاکھ پیار کی پاکیزگی سہی لیکن جوان ہو کر رات کو ایک بستر پر سونا معیوب سی بات
اور اسے تہذیب گوارا نہیں کرسکتی تھی۔

ماں باپ نے سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور کیا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔
درست تھا کہ عامر اور امبر کے دلوں میں محبت کی پاکیزگی تھی اور ان کے درمیان بھا
بہن کا مقدس رشتہ تھا۔ اس کے باوجود عمر کے اس دور میں داخل ہونے والے تھے جہ

بھائی اور بہن کو بھی ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ اسی ڈاکٹر کے پاس گئے جس نے انہیں آپریشن کے ذریعہ الگ کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں پھر ان سے کہا۔

"یہ بچے عجوبہ ہیں۔ ایسے بچے جو سینے کی طرف سے جڑے ہوں' بمشکل زندہ رہ پاتے ہیں۔ اکثر آپریشن ناکام رہتے ہیں۔ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو انہیں ایک دوسرے کے سینے سے لگا دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے ان دونوں بچوں کا ایک ہی دل ہے اور اس کی دھڑکنیں دونوں کے سینے میں ہیں۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ دونوں کے دل الگ الگ تھے مگر ان کی دھڑکنیں اب تک ایک ہیں۔ ان کا دماغ ایک طرح سے سوچتا ہے۔ اس دنیا کی مسرتوں کو اور دکھ مصیبتوں کو وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اور ایک ہی انداز میں ان کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ایک بخار میں مبتلا ہوتی ہے تو دوسرے کو بخار نہ آئے تب بھی وہ تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔

ان مشاہدات اور تجربات کے پیشِ نظر ایک جان دو قالب والی بات محض کہاوت نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ واقعی یہ دونوں ایک جان ہیں جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جائے گی آپ لوگوں کی پریشانیاں بھی بڑھتی جائیں گی۔ اگرچہ یہ دونوں معصوم ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں کہیں گناہ کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں ایک ساتھ رہنے اور ایک ساتھ سونے سے روکیں گے تو ان کے دماغ میں تجسس پیدا ہوگا کہ انہیں ایک ساتھ رہنے سے کیوں روکا جارہا ہے۔ ابھی تو وہ ایک دوسرے کو محض بہن بھائی سمجھ رہے ہیں' آپ لوگوں کی روک ٹوک انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرے گی کہ وہ جنسِ مخالف ہیں۔ ہمارے یہاں گناہ کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ والدین کی وقت بے وقت کی پابندیاں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں ایک ساتھ سونے کی اجازت دی جائے۔ یہ یقیناً خلافِ تہذیب ہے لیکن انہیں براہِ راست روکنے کی بجائے بالواسطہ ایسی پابندیاں عائد کی جائیں جنہیں یہ شدت سے محسوس نہ کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کریں وہ آپ کو بہترین اور قابلِ عمل مشورہ دے گا۔"

ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق انہوں نے ایک بہت ہی مشہور ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کیں۔ اس سے یہ طے پایا کہ وہ روز صبح ان کے یہاں آئے گا اور نفسیاتی تجزیہ کرے گا۔

پہلے دن ماہر نفسیات ان کے یہاں آیا۔ اس وقت عامر اور امبر ایک کمرے میں بستر پر ایک دوسرے سے لپٹے سو رہے تھے۔ ایک کا سینہ دوسرے کے سینے سے یوں لگا تھا جیسے پیدائش کے وقت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سینے سے سینہ ملائے روزِ اوّل کی طرح اپنے وجود اور اپنی زندگی کی حرارت کو دل کی دھڑکنوں سے سمجھ رہے ہیں اور ایک جسم ہو کر ایک دوسرے کو سمجھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نے قریب آ کر ان کے سروں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں بیدار کیا۔ وہ دونوں آنکھیں کھول کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ سیٹھ غفار بھائی نے ان بچوں سے کہا۔

"بیٹے یہ تمہارے نئے ماسٹر ہیں۔ یہ روز صبح یہاں آئیں گے اور تم لوگوں سے باتیں کر کے چلے جایا کریں گے۔ وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے اور نئے ماسٹر سے اجازت لے کر منہ ہاتھ دھونے کے لئے چلے گئے۔ ماہر نفسیات خاموشی سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بارہ برس کے تھے۔ بظاہر نوجوانی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن عمر کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ اب تب میں جوانی کی انگڑائی لینے ہی والے ہیں۔

جب وہ دونوں منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر آئے تو ماہر نفسیات نے بھی ناشتے میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے امبر سے پوچھا۔

"بیٹی یہ عامر تمہارے کون ہیں؟"

امبر نے جواب دیا۔ "یہ میرے پیارے پیارے بھائی جان ہیں۔"

"تو پھر تم عامر کیوں کہتی ہو بھائی جان کیوں نہیں کہتیں؟"

"واہ یہ مجھ سے ایک سیکنڈ کے چھوٹے ہیں نہ ایک سیکنڈ کے بڑے ہیں میں بھائی جان کیسے کہوں میں تو عامر کہوں گی۔"

ماہر نفسیات نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں تم دونوں ہم عمر ہو۔ بھائی جان نہ کہنے کے باوجود یہ تمہارے سگے بھائی ہیں۔ بھائی اور بہن کا رشتہ بہت ہی مقدس ہوتا ہے اور جو رشتے

مقدس ہوتے ہیں اور بہت زیادہ اہم ہوتے ہیں' انہیں دور سے پوجا جاتا ہے۔ ان کے لئے آنکھوں سے' زبان سے اور دل کی دھڑکنوں سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تم اس دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی گھر میں بھائی بہن کا بے انتہا پیار دیکھو گی۔ بہن اپنے بھائی پر اور بھائی اپنی بہن پر جان تک قربان کر دیتے ہیں' لیکن ایک دوسرے کے گلے نہیں لگتے۔ دنیا میں رہنے کے لئے دنیا کے اصولوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہو مگر اس چاہت کا اظہار اپنی زبان سے اور اپنی آنکھوں سے کرو' اور اپنی محبت کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے کام آتے رہو۔ کیا تم دونوں میری باتیں سمجھ رہے ہو؟"

عامر اور امبر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر عامر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں ماسٹر صاحب آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی جو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

امبر نے کہا۔ "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے الگ رہنے سے' اس دنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا یا ہم ایک ساتھ سوتے رہے تو کیا قیامت آ جائے گی۔ ڈیڈی اور ممی بھی تو ایک ساتھ سوتے ہیں۔"

ان کے والدین جھینپ کر نظریں چرانے لگے۔ ماہر نفسیات نے انہیں سمجھایا۔

"بیٹے تمہارے ممی اور ڈیڈی تمہاری طرح آپس میں بھائی بہن نہیں ہیں' میاں بیوی ہیں۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم دونوں کو بھی اپنی بیوی اور اپنے خاوند کے ساتھ سونے کی قانونی اجازت ملے گی۔"

امبر نے خوش ہو کر کہا۔ "تو بھائی جان سے میری شادی کر دیجئے۔ میں ان کی بیوی بن جاؤں گی یہ میرے میاں بن جائیں گے۔ پھر تو آپ اعتراض نہیں کریں گے نا؟"

ڈاکٹر خاموشی سے ان معصوم بچوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بارہ برس کے تھے لیکن اب تک ان میں اتنی معصومیت تھی کہ وہ محبت کی پاکیزگی کے سوا کسی اور محبت کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انہیں اپنی ممی اور اپنے ڈیڈی کی طرح ایک ساتھ کیوں نہیں سونا چاہئے۔ ماہر نفسیات انہیں بہت دیر تک بھائی بہن اور میاں بیوی کے رشتے کا فرق سمجھاتا رہا پھر وہ اسی طرح روز آتا تھا اور روز سمجھاتا تھا۔ ایک دن

اس نے عامر کو ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر پوچھا۔

"تمہیں امبر اتنی اچھی کیوں لگتی ہے؟"

"اس لئے کہ میری بہن ہے۔"

"ہاں بہن تو ہے لیکن اس میں ایسی کون سی بات ہے جو تمہیں اس کے قریب پر مجبور کرتی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس میں کیا بات ہے بس جی چاہتا کہ وہ میرے قریب رہے۔"

"قریب رہ کر کیا جی چاہتا ہے؟"

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ پکڑوں۔ اسے اپنے سینے سے لگاؤں۔ جب اپنے آپ کو بہن سے دور رکھتا ہوں تو میرا سارا بدن عجیب طرح سے دکھنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میرے اندر سے میری جان نکل کر باہر کھڑی ہو گئی ہے' اگر وہ میرے نہیں آئے گی اور اپنے دل کی دھڑکنیں میرے سینے تک نہیں پہنچائے گی تو میں مر گا۔"

اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے' اور کے دماغ میں کوئی ایسی غلاظت نہیں ہے جسے دنیا والے ایک جوان عورت اور جوان کی قربت سے منسوب کرتے ہیں۔

دوسری جانب ایک علیحدہ کمرے میں بیگم غفار سیٹھ نے اپنی بیٹی امبر سے پوچھا۔

"بیٹی تم اپنے بھائی کے قریب کیوں رہنا چاہتی ہو؟"

"اس لئے کہ وہ میرے بھائی جان ہیں یعنی میری جان کے بھائی ہیں۔"

"لیکن پھر بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ تم دونوں اتنی چاہت سے ایک دوسرے قریب رہو۔ آج سے تم دونوں الگ الگ کمرے میں سویا کرو گے۔"

"ممی میں مر جاؤں گی۔ آپ مجھے میرے بھائی جان سے کیوں چھڑانا چاہتی ہیں۔ نے تو کہا تھا کہ ہم ابھی جس طرح سوتے ہیں اسی طرح پیدا بھی ہوئے تھے۔ آپ ہمیں اس طرح کیوں پیدا کیا تھا؟"

ماں بوکھلا کر لاجواب ہو گئی۔ پھر وہ بولی۔

"بیٹی کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں نے جان بوجھ کر تو پیدا نہیں کیا۔ ایسا تو قدرت کو منظور تھا۔"

امبر نے کہا۔ "قدرت کو جو منظور تھا وہ آپ نے کیا۔ قدرت کو جو اب بھی منظور ہے اس سے آپ انکار کیوں کرتی ہیں؟ آپ کی قسم' ممی میں نے آپ کے سمجھانے پر حتی الامکان کوشش کی تھی کہ عامر سے دور رہوں مگر چند گھنٹوں سے زیادہ دور نہ رہ سکی۔ اس دوران مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری سانسیں رک گئی ہوں اور دل اپنی دھڑکنیں بھولتا جا رہا ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی ممی کہ میں عامر کے بغیر کیا ہوں ہم دونوں ایک ہی جسم کے دو حصے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔"

ماں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب رہنے کے باوجود دنیا کے انتہائی معصوم انسان تھے۔ اب ان کی معصومیت پر شبہ کرتے ہوئے بڑوں کو شرم آتی تھی۔

اس رات انہوں نے یہ کیا کہ عامر اور امبر کو دو ایسے مختلف کمروں میں سلایا جن کی درمیانی دیوار میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ایک طرف عامر کا بستر تھا اور دوسری طرف امبر کا۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے دور نہیں تھے اپنے اپنے بستر سے سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور نیند آنے تک باتیں کر سکتے تھے۔ کھڑکی میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔

دوسری صبح ماں باپ نے آ کر دیکھا وہ دونوں اپنے اپنے بستر پر کھڑکی سے لگے بیٹھے تھے۔ آہنی جالی کے پار انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بیٹھے ہی بیٹھے سو گئے تھے۔ ان کے خوابیدہ چہروں سے ایسی معصومیت ٹپک رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مگر ماں باپ بھی کیا کرتے دنیا کے دستور سے مجبور تھے' اپنے بچوں کی معصومیت کی قسمیں کھا سکتے تھے۔ اس کے باوجود دنیا والوں کو ان کے پیار کی پاکیزگی کا یقین نہیں دلا سکتے تھے۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے ہوئے اور ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے پیدا ہوئے تھے تو وہ اس ہم آغوشی کے ساتھ گناہ کا کوئی تصور لے کر اس دنیا میں نہیں آئے تھے اور اب تک ان کے اندر گناہ کے کسی خیال نے چٹکی نہیں لی تھی۔ آج

بھی وہ انسان سے زیادہ فرشتے نظر آتے تھے مگر دنیا کو کون سمجھائے؟

بچوں کو سمجھاتے سمجھاتے ماں باپ بوڑھے اور بچے جوان ہوگئے۔ عامر نے جوا
ابتدا ہی میں ایک قد آور گبرو جوان کی طرح قد نکالا تھا' امبر قیامت کا شباب لے
باپ کا دل دہلا رہی تھی۔ ایسے وقت انہوں نے دوسری تدبیر کی' اپنے قریبی رشتے دا
میں جتنے جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں انہیں اپنے یہاں بلایا۔ سیٹھ غفار بھائی اتنے دو
مند تھے کہ تمام رشتے دار ان کے آگے بچھے رہتے تھے۔ ہر ماں باپ کی یہ خواہش تھ
ان کے بیٹے سے امبر کی شادی ہوجائے اور ان کی بیٹی عامر کی دلہن بن جائے۔ ممی
اور ڈیڈی تھے سیٹھ غفار بھائی نے ان کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ خاندا
جو لڑکا امبر کا دل جیت لے گا اور جو لڑکی عامر کو اپنی طرف مائل کرلے گی ان کے ساتھ
اپنے دونوں بچوں کا رشتے کر دیں گے۔ اس انعامی مقابلے کی وجہ سے تمام رشتے دار
کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی۔ ایک طرف نوجوان لڑکے امبر کا دل جیتنے کے لئے
عشق و محبت کے نئے نئے تماشے دکھانے لگے۔ دوسری طرف حسین دوشیزائیں ا
ادائیں دکھا دکھا کر عامر کو لبھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ صرف اتنا ہی نہیں ان لڑکے ا
لڑکیوں کے بوڑھے والدین بھی تھے جو صبح سے شام تک تو تو میں میں کرتے رہتے تھے ا
اپنے اپنے بچوں کی خوبیاں بیان کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ عامر اور ا
کا رشتہ انہی کے بچوں سے ہوسکتا ہے۔ سیٹھ غفار بھائی کی عالیشان کوٹھی مچھلی بازار بن
تھی۔ ہر وقت کبھی قہقہوں کی اور کبھی لڑائی جھگڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ بہ
غفار بھائی تنگ آکر رشتہ داروں کو چھانٹنے لگے جو ناپسند اور ناقابل برداشت تھے انہ
ایک ایک کرکے کوٹھی سے رخصت کر دیا۔ جوان لڑکوں میں سے صرف ایک احمر ر
جس سے امبر کبھی کبھی دلچسپی لیتی تھی۔ دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ احمر زندہ دل تھا اور ہ
نئے نئے لطیفے سنا کر اسے ہنساتا رہتا تھا لیکن ایسے وقت بھی وہ عامر کے ساتھ بیٹھ کر ہن
تھی۔ ماں باپ کے لئے یہی غنیمت تھا کہ امبر عامر کے علاوہ احمر کو بھی کسی حد تک پس
کرنے لگی تھی۔

عامر بھی کسی حد تک شازیہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ پسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ شا
نفسیات کی طالبہ تھی اور عامر کے پاس بیٹھ کر زیادہ تر امبر کی باتیں کرتی تھی جو لڑکی اس

بہن کی باتیں کرے اور تعریفیں کرے بھلا وہ اسے کیوں نہ پسند کرتا۔ ماں باپ نے فیصلہ کرلیا کہ عامر اور شازیہ اور امبر اور احمر کی شادی جلد ہی کر دی جائے۔ ماہر نفسیات نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا کہ امبر نے اب تک اپنے بھائی کے سوا کسی دوسرے مرد کی محبت کو نہیں سمجھا ہے۔ یہی حال عامر کا ہے اسے بھی شازیہ کے روپ میں ایک چیلنج ملے گا۔ نئے جذبے اور نئی محبت سے آگاہی ہوگی۔ پھر عامر کو شازیہ سے اور امبر کو احمر سے اتنی محبت اور دلچسپی پیدا ہوجائے گی کہ اس کے بعد بھائی اور بہن کی محبت صرف رسمی طور پر قائم رہے گی۔ شادی کے بعد مرد اور عورت کی دنیا بدل جاتی ہے وہ دونوں بھی اپنی پرانی دنیا سے نکل کر ایک نئی دنیا میں جا بسیں گے۔

جب شادی کا اعلان ہوا تو امبر اور عامر بوکھلا گئے۔ امبر نے اپنی ماں کے پاس آکر پوچھا۔

"یہ شادی کیوں ضروری ہے؟ اس طرح تو میں احمر کے گھر چلی جاؤں گی۔ کیا عامر بھی میرے ساتھ جائیں گے؟"

"اے لڑکی پاگل ہوگئی ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ سسرال نہیں جایا کرتے۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"بیٹی جوان ہوجائے تو اسے گھر میں بٹھا کر نہیں رکھتے۔ دنیا کے دستور کے مطابق تمہیں شادی کرنی ہوگی اور اپنے سسرال جاکر رہنا ہوگا۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔ کروں گی تو عامر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

دوسری طرف عامر نے بھی ماہر نفسیات سے کہا۔

"میں امبر کی شادی نہیں ہونے دوں گا۔ اگر شادی ہو بھی گئی تو میں اسے اس گھر سے جانے نہیں دوں گا۔"

گھر کے سب لوگ پریشان ہوگئے۔ بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ ان نئے رشتوں کی وجہ سے امبر' احمر اور عامر' شازیہ سے نفرت نہ کرنے لگے۔ صبح سے شام تک سر جوڑ کر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شادی تو ضرور ہوگی لیکن امبر رخصت ہوکر اس گھر سے نہیں جائے گی بلکہ احمر گھر داماد بن کر وہاں رہے گا۔ اسی طرح

دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے قریب رہیں گے اور اپنے شوہر اور اپنی بیوی کے
ازدواجی زندگی گزاریں گے۔ ان دونوں بھائی بہنوں کو شازیہ اور احمر سے اتنی دلچسپی
ہوجائے گی کہ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سونے کی ضد چھوڑ دیں گے۔

عامر اور امبر کو بزرگوں کا فیصلہ پسند آیا کہ شادی کے بعد وہ اسی گھر میں رہیں
اور یہ شادی بھائی بہن کی محبت میں حائل نہیں ہوگی۔

ان کی رضامندی حاصل ہوتے ہی بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہو
لگیں۔ جو رشتے دار امبر کو بہو بنانے اور عامر کو داماد بنانے میں ناکام رہے تھے وہ اندر
اندر جل بھن رہے تھے اور اب بھی اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سیٹھ غفار بھائی کا ارا
بدل جائے۔ ناکام ہونے والے نوجوان امبر کے لئے آہیں بھر رہے تھے اور ناکام ہو
والی لڑکیاں شازیہ کی خوش قسمتی پر رشک کر رہی تھیں۔

شادی سے ہفتوں پہلے ہی عامر اور امبر کو سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ علیحدہ کمروں میں
سویا کریں گے ورنہ یہ رشتے دار ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیں گے لیکن وہ پھر انہی کمروں میں
اپنی کچھ راتیں گزارنے لگے جس کی درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی تھی اور وہ کھڑکی کے آر
پار ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیٹھے ہی بیٹھے سو جاتے تھے۔ دروازے اندر سے بند ہوتے
تھے کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوتے تھے اس لئے وہاں آنے والے رشتے داروں کو یہ
معلوم ہوسکا کہ وہ کس انداز میں سوتے ہیں۔

لیکن شادی سے ایک دن پہلے ایک رات زبردست ہنگامہ ہوگیا۔ پتہ نہیں امبر
سونے سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ یا وہ شخص کسی دوسری جانب
سے دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا۔ بہرحال اسے اندر آنے کا موقع مل گیا۔ وہ سیاہ پتلون
اور سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھی جس کا اگلا حصہ اس کے چہرے
جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں ریوالور تھامے دبے قدموں سے چلتا ہوا امبر کے بستر کے
قریب آیا امبر بستر پر سونے کی بجائے کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے دوسری
طرف عامر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور وہ دونوں ہی
آہنی جالی سے سر ٹیکے بے خبر سو رہے تھے۔

اس شخص نے اس کمرے کے دروازے کو دیکھا جو باہر لان کی طرف کھلتا تھا۔ اس

نے پہلے دروازے کو کھول دیا تاکہ فرار ہونے میں آسانی ہو۔ دروازہ کھولنے کے بعد امبر
کے پاس آیا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر بڑی آہستگی سے امبر کا ہاتھ عامر سے الگ کیا۔
امبر نیند میں کسمسائی دوسری طرف عامر بھی کسمسانے لگا۔ جب اس شخص نے امبر کے منہ
پر ہاتھ رکھ کر بستر سے اپنی طرف کھینچا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ کو اتنی سختی
سے دبایا گیا تھا کہ وہ چیخ نہیں سکتی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ دونوں بھائی بہن کا جسم ایک
ہی نظام کے تحت بنایا گیا ہے کیونکہ امبر کی آنکھ کھلتے ہی عامر کی آنکھ بھی کھل گئی پہلے تو
اس نے پریشان ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھا جس کی گرفت سے بہن کا ہاتھ نکل گیا تھا۔ پھر اس
نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا تو کھڑکی کے اس پار کوئی شخص اس کی بہن کی گردن
میں ہاتھ ڈالے اسے کھینچے لئے جا رہا تھا۔

اس نے للکار کر کہا۔ "خبردار رک جاؤ۔"

اس کی للکار سنتے ہی اس شخص نے فائر کر دیا۔ گولی عامر کے بازو کو چھیدتی ہوئی نکل
گئی۔ عامر کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی امبر بھی اپنا بازو پکڑ کر چیخنے لگی۔
وہ شخص ہوائی فائر کرتا ہوا اور امبر کو کھینچتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر تمام کوٹھی میں ہلچل مچ گئی۔ عورتیں سہم کر چیخنے لگیں۔ مرد
آواز کی سمت دوڑتے ہوئے آئے لیکن اس وقت تک پورچ سے ایک کار اسٹارٹ ہو کر
احاطے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ امبر کی چیخیں سبھی نے سنی تھیں۔ احمر تیزی سے دوسری کار
میں آکر بیٹھا' گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس کار کے پیچھے چلا
گیا۔

عامر اپنا خون آلود بازو تھامے لڑکھڑاتا ہوا اور امبر کو پکارتا ہوا کوٹھی سے باہر آیا۔ وہ
مجرم کا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن گولی کا زخم ایسا تھا کہ باہر آتے ہی گر کر بے ہوش ہوگیا۔
دوسری طرف کار کی پچھلی سیٹ پر امبر اپنا بازو تھامے تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ مجرم نے
جھلا کر کہا۔

"میں تمہیں پھول کی طرح اٹھا کر لایا ہوں' تمہیں ذرا تکلیف نہیں پہنچائی پھر یہ بازو
تھام کر کیوں کراہ رہی ہو؟"

وہ جواب دینے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگئی کیونکہ اس وقت عامر بھی کوٹھی سے

باہر آکر بے ہوش ہوگیا تھا امبر کو اٹھا کر لے جانے والا مشکل میں پڑ گیا تھا۔ جب اڈے پر آیا تو بے ہوش لڑکی کو بازوؤں میں اٹھا کر اپنے کمرے تک لے جانا پڑا۔ پ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر بے ہوشی کا بہانہ کر رہی ہے۔ آزمائش کے ل اس نے زور کی چٹکی لی لیکن امبر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ پانی لا کر اس کے چہرے پر چ رہا۔ پھر بھی اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تب اس کی سمجھ میں آگیا کہ جو گولی عامر ہے اس کے درد کی ٹیسیں امبر کے بازو سے بھی اٹھ رہی ہیں۔ عامر یقیناً بے ہوش ہے اس سے یہ بھی ہوش میں نہیں ہے۔

اسے لانے والا اس کا ایک کزن تھا۔ اپنی ناکامی سے جھلا کر اس نے یہ منصوبہ بنا کہ جو لڑکی محبت سے حاصل نہیں ہوتی اسے جبراً حاصل کیا جائے۔ اس نے سوچا اسے اٹھا کر لائے گا' اسے شادی کے لئے مجبور کرے گا اگر وہ نہیں مانے گی تو ہفتوں مہینوں اس کی عزت سے کھیلتا رہے گا۔ جب عورت اپنا سب کچھ ایک مرد کی آغوش لٹا دیتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ اس کے آگے جھکنے لگتی ہے اور اسی کو اپنا سب کچھ سمجھ شادی کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ جب اس سے شادی ہوجائے گی تو وہ سیٹھ غفار کا داماد بن جائے گا۔ بیٹی کے سہاگ کی خاطر وہ اس کا قصور معاف کر دیں گے اور پھر کے وارے نیارے ہوجائیں گے اور وہ کروڑوں کی جائیداد میں سے آدھی جائیداد کا بن جائے گا۔

اس نے اپنی دانست میں زبردست پلاننگ کی تھی لیکن امبر کی بے ہوشی اس پلاننگ کے مطابق اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اسے ہوش میں لا تمام تدبیریں ناکام ہوگئی تھیں۔ چونکہ وہ امبر کا کزن تھا اس لئے اس کی پیدائش سے کر اب تک اس کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بہن سوتی ہے بھائی بھی سوتا ہے۔ بھائی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہن بھی اس تکلیف سے تڑپتی ہے جب ایک گھنٹے کے بعد امبر کو ہوش آیا تو اس کے کزن نے سمجھ لیا کہ دوسری طرف عامر کی بھی مرہم پٹی ہوچکی ہے اور اسے ہوش آگیا ہے اور اب تھوڑی دیر میں امبر بات کرنے کے قابل ہوجائے گی لیکن وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی اپنے بازو پر ہاتھ بے چینی کا اظہار کرتی رہی۔ اس کے کزن نے کہا۔

"امبر میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ تم دلہن بن کر احمر کی آغوش میں جاؤ۔ میں تمہیں اس طرح اٹھا لایا ہوں تو اسے میری زیادتی نہ سمجھو۔ یہ بھی میری محبت کا ثبوت ہے۔"

امبر اپنے بازو کی تکلیف سے بے چین تھی' اس کی باتیں سن رہی تھی نہ اسے جواب دے رہی تھی۔ بار بار عامر کا نام لے رہی تھی اور کراہتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس کے کزن نے پریشان ہو کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھو امبر اس وقت نہ سونا۔ میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتا ہوں اسے پیتے ہی تمہاری نیند اڑ جائے گی۔"

وہ دوڑتا ہوا کچن کی طرف گیا اور جلدی جلدی کافی تیار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سب لوگ امبر کے لئے پریشان ہوں گے۔ تھانوں میں رپورٹ درج کرا دی گئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی کسی طرح سراغ لگا کر وہاں تک پہنچ جائے۔ اس سے پہلے ہی وہ امبر کا دل جیت لینا چاہتا تھا۔ اپنے جرم کو قابلِ معافی بنانے کے لئے امبر کی حمایت لازمی تھی۔

جب وہ کافی کی پیالی لے کر کمرے میں آیا تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ تب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اب اسے لاکھ جھنجھوڑ کر اٹھاؤ' وہ نہیں اٹھے گی۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اسے عامر پر گولی نہیں چلانی چاہئے تھی۔ وہ کوئی سنگین جرم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ صرف امبر کو دھمکی دینے کے لئے ریوالور اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن اس نے بوکھلاہٹ میں عامر پر گولی چلا دی بعد میں خیال آیا کہ اسے ہوائی فائر کرنا چاہئے تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ عامر کو گولی لگے گی تو امبر بھی تکلیف میں مبتلا ہو کر اس کے منصوبوں کو ناکام بنا دے گی۔ اب تو یہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ صبح تک اس کے پاس بیٹھا رہے اور اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہے۔

لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی پولیس نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا احمر' جو اس کے تعاقب میں آیا تھا اس نے وہ جگہ دیکھ لی تھی اور پولیس کی مدد لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ صرف رات بھر کا ہنگامہ تھا امبر چند گھنٹوں کے لئے اغوا کی گئی اور پھر اسے بازیاب کر لیا گیا۔ دوسرے دن احمر کے سامنے امبر کا نکاح پڑھایا جاسکتا تھا لیکن عامر زخمی تھا اس لئے جڑواں بہن کے رشتے سے وہ بھی زخمی تھی اس لئے عامر کا زخم اچھا ہونے تک شادی ملتوی کر دی گئی۔

عامر اسپتال میں تھا۔ امبر ضد کرنے لگی کہ وہ بھی ہسپتال جائے گی لیکن ماں باپ دونوں بھائی بہن کو اسپتال میں رہنے کی اجازت دے کر دنیا والوں کے سامنے تماشہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ انہیں تھوڑی دیر کے لئے یہ خوشیاں حاصل ہوئی تھیں کہ عامر اور امبر کی شادی ہوجائے گی تو بھائی بہن کے ساتھ رہنے والی عادت ختم ہوجائے گی لیکن ایک نامعلوم مدت تک کے لئے ان کی خوشیاں برباد ہوگئیں۔ وہ عامر کو اسپتال سے گھر لے آئے۔

دونوں بھائی بہن ایک ہی تکلیف میں مبتلا تھے اس لئے اب وہ الگ الگ کمرے میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ ان کی ضد دیکھ کر گھر میں آئے ہوئے رشتے دار طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ انہیں بدنام کرنے کا موقع مل گیا کہ جوان بہن بھائی ایک کمرے میں کیوں رہتے ہیں اور ایک بستر پر کیوں سوتے ہیں؟ ماں باپ نے بات بنانے کی کوشش کی کہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا چونکہ یہ دونوں ایک ہی تکلیف میں مبتلا ہیں اس لئے ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہتے ہیں لیکن ان کے جواب سے دوسروں کی تسلی نہ ہوئی۔ بہت سے رشتے دار لعن طعن کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

عامر اور امبر اب نادان بچے نہیں تھے۔ وہ نیکی اور بدی کا فرق سمجھتے تھے۔ امبر نے اداس ہو کر کہا۔

"عامر یہ ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے تمہارے ساتھ ایک بستر پر نہیں رہنا چاہئے مگر تم ہی بتاؤ میں تم سے دور کیسے جاسکتی ہوں؟"

"یہی تو مجبوری ہے۔ میں بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا ہم تو ہزار بار کوشش کرچکے ہیں۔ پتہ نہیں ہم اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں پاسکتے۔ ہمارے اندر سے کوئی چیز ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے ہم کیسے کہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

امبر نے کہا۔ "اس ڈاکٹر نے ہمیں آپریشن کے ذریعہ الگ کر کے ہم پر ظلم کیا۔

اس نے سوچا تھا کہ ہمارا جسم الگ ہوجائے گا تو ہماری روحیں بھی الگ ہوجائیں گی کیا دنیا کا کوئی ڈاکٹر ہماری روحوں کا آپریشن کر سکتا ہے؟"

"نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کی روحیں ہمیں روزِ اوّل کی طرف واپس بلا رہی ہیں۔ ہمارے خالق نے ہمیں ایک ہی مٹی سے جوڑ کر بنایا ہے' لیکن بنانے والا صرف مٹی سے بنا کر تو نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ جسموں کی طرح روحوں کو بھی جوڑتا ہے۔ جذبوں کو بھی جوڑتا ہے۔ اگر ہمارا اس طرح لپٹ کر رہنا کوئی جرم ہوتا' کوئی گناہ ہوتا تو وہ بنانے والا کبھی اس طرح بنا کر ہمیں پیدا نہ کرتا۔"

امبر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "اس دنیا میں محبت روح کی پاکیزگی سے نہیں سمجھی جاتی۔ مرد اور عورت کے جسمانی اتصال سے سمجھی اور پرکھی جاتی ہے۔ اس دنیا میں جتنے جوان مرد ہیں اور جتنی جوان عورتیں ہیں وہ سب جسم کی پیاس بجھانے کے لئے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا جسم تو پیاسا نہیں ہے البتہ ہماری روحیں پیاسی ہیں۔ کیا یہ دنیا والے ہمارے پاکیزہ خیالات کو سمجھ کر ہمیں معاف نہیں کرسکتے۔ ہمیں ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر یہ ہماری معصومیت پر یقین کرلیں گے تو ان کا کیا بگڑ جائے گا؟"

عامر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "چونکہ اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گناہ کی سیاہی پھیلی ہوئی ہے اور بھائی بہن کا مقدس رشتہ بھی اس لپیٹ میں آگیا ہے اس لئے اب کوئی ہماری معصومیت کا یقین نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے رہے' سوچتے رہے اور اس دنیا میں پیدا ہونے پر کڑھتے رہے۔ ایک ماہ بعد عامر کے بازو کا زخم اچھا ہوگیا' امبر بھی صحت یاب ہوگئی۔ بہت سے رشتے دار اب بھی گھر میں موجود تھے۔ اس لئے سیٹھ غفار بھائی اور ان کی بیگم نے تکلفات سے کام نہیں لیا' فوراً ہی ان کا نکاح پڑھا دیا۔ اس گھر سے نہ کسی دلہن کی رخصتی ہوئی اور نہ ہی کوئی دلہن بہو بن کر آئی۔ لڑکے لڑکیاں سبھی گھر میں تھیں' وہیں انہیں دولہا دلہن بنا دیا گیا۔ جب رات آئی اور امبر کو سہاگ کی سیج پر بٹھا دیا گیا تو وہ گھونگھٹ اٹھا کر اپنے دولہا کی بجائے عامر کو تلاش کرنے لگی۔ عامر دوسرے کمرے کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس دوسرے کمرے میں شازیہ دلہن بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نئی نو

دلہن کو اپنے عامر کا انتظار تھا لیکن عامر باہر ٹہلتا ہوا بڑی بے چینی سے اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں امبر کو پہنچا دیا گیا تھا۔

جب احمر' امبر کے کمرے میں جانے لگا تو عامر نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"احمر بھائی آپ کی بہن اس کمرے میں ہے آپ کو وہاں جانا چاہیے۔"

احمر نے بھنا کر کہا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو' ہوش میں تو ہو۔ مجھے میری بہن شازیہ کے کمرے میں بھیجنا چاہتے ہو؟"

سیٹھ غفار بھائی اور ان کی بیگم دونوں ہی سمجھتے تھے کہ سہاگ کی رات بھی دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی ضد کریں گے۔ جب انہوں نے عامر کو احمر کا راستہ روکتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے ان کے پاس آئے سیٹھ غفار بھائی نے عامر کو ایک طرف کھینچ کر لے جاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے ہم بدنام ہو جائیں۔"

عامر نے کہا۔ "ڈیڈی آپ نے ہمیں یہ تو نہیں بتایا تھا کہ شادی کے بعد امبر کو مجھ سے الگ کر دیا جائے گا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ وہ اسی گھر میں رہے گی۔ اب وہ اس گھر میں ہے تو مجھے اس سے دور کیوں رکھا جا رہا ہے؟"

سیٹھ غفار بھائی نے پریشان ہو کر کہا۔ "بیٹے میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں' اس دنیا میں عمر کے لحاظ سے محبت اور جذبے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک انسان بھائی بہن کی محبت سے بہلتا ہے۔ جوانی میں جذبات بدلتے ہیں وہاں سے میاں بیوی کی محبت شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد بڑھاپے تک انسان کو اولاد کی محبت زندہ رکھتی ہے۔ تم نادان نہیں ہو تمہیں ان بدلتے ہوئے جذبوں اور رشتوں کو سمجھنا چاہئے اور انہیں تسلیم کرنا چاہئے۔"

باتیں کرتے ہوئے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اسے اس کمرے تک لائے جہاں شازیہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پھر باپ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"بیٹے آج اپنے بوڑھے باپ کی بات مان لو' اپنی ضد کو بھول جاؤ اور خدا کے لئے اس کمرے میں چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے عامر کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر واپس آتا۔ انہوں نے دروازے کو بند کر کے باہر سے لاک کر دیا۔

اندر سے عامر نے دروازے کو دو چار جھٹکے دے کر کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ کھلا پھر وہ مایوس ہو کر اپنی دلہن کی طرف دیکھنے لگا۔ دلہن بھی گھونگھٹ اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ دونوں بھائی بہن باہر کیا تماشے کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی عامر کو جبراً اس کمرے میں بھیجا گیا ہے۔ یہ اس کے لئے بڑے دکھ کی بات تھی کہ دولہا اس کی آرزو لے کر اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ ویسے شازیہ شادی سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ عامر کو زبردستی اپنی طرف مائل کرنا ہوگا۔ سہاگ رات کو جو فرض دولہا ادا کرتے ہیں وہی فرض اسے دلہن بن کر نبھانا ہوگا۔ اس لئے اس نے ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنا گھونگھٹ خود ہی اٹھا لیا پھر پھولوں کی سیج سے اتر کر اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"عامر آؤ۔ یہاں بیٹھو میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیج کی طرف لے جانے لگی۔ عامر نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"شازیہ میں اس کمرے میں نہیں رہ سکتا۔ تم نہیں جانتیں تمہارا بھائی احمر میری بہن کے کمرے میں گیا ہے میں یہاں سکون سے نہیں رہ سکوں گا وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نہیں جاؤں گا تو رونے لگے گی۔"

شازیہ نے اسے سمجھایا۔ "عامر یہ رات کسی بھی دلہن کے رونے کے لئے نہیں ہے۔ آج کی رات وہ میکے کی تمام محبتوں کو بھول کر صرف ایک مرد کی آغوش میں مسرتیں تلاش کرتی ہے۔ امبر بھی آج نہیں روئے گی۔ احمر اسے اتنی خوشیاں دے گا کہ آج کی رات وہ تمہیں بھی بھول جائے گی۔"

"نہیں' ساری دنیا مجھے بھول سکتی ہے لیکن امبر کسی بھی لمحہ مجھے نہیں بھلا سکتی۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو پہلے تو تم امبر کی حمایت میں خوب بولتی تھیں۔"

"میں اب بھی اس کی حمایت کرتی ہوں۔ وہ تمہاری بہت اچھی بہن ہے تم میری بات مانو آزمائش کے طور پر صبح تک صبر کر لو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ امبر نے رات

بھر تمہیں یاد نہیں کیا ہے۔"

"اچھی بات ہے میں صبح تک صبر کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

"شازیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ "وہ کیا؟"

عامر نے جواب دیا۔ "شرط یہ ہے کہ صبح تک تم مجھ سے امبر کی باتیں کرتی رہو۔"

شازیہ کو یہ بات بہت بری لگی پھر بھی اس نے برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سہاگ رات اس لئے نہیں ہوتی کہ نئی نویلی دلہن اپنے جذبات اور اپنی خوشیوں کو بھول کر تمہاری بہن کی باتیں کرتی رہے۔ تم مجھے پتھر کی مورت سمجھو عامر! دیکھو تمہارے قریب میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ مقصد یہ تھا کہ عامر نئے بدن کی حرارت سے آشنا ہو جائے۔ عامر تھوڑی دیر تک اس کے زرخیز سینے پر ہاتھ رکھے اس کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ ہٹا کر کہا۔

"ہاں امبر کا دل بھی اسی طرح دھڑکتا ہے۔"

شازیہ اک دم سے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کمبخت اس کی جذباتی دھڑکنوں کو بھی بہن کی پاکیزہ محبت سے منسوب کر رہا تھا' لیکن شازیہ بھی ہار ماننے والی نہ تھی۔ اس نے اسے دھکا دے کر سیج پر بٹھایا' پھر خود اس کے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اچھی بات ہے میں صبح تک تمہاری بہن کے متعلق گفتگو کروں گی' لیکن میری یہ شرط ہے کہ میں جو کہتی جاؤں تم اس پر عمل کرتے رہو۔"

"مجھے اپنی بہن کی باتیں سنانے کے لئے اگر تم زہر بھی پینے کے لئے کہو گی تو انکار نہیں کروں گا تم جو کہو گی میں اس پر عمل کروں گا۔"

شازیہ نے کہا۔ "امبر اتنی خوبصورت ہے کہ اس کی خوبصورتی کی مثال نہیں ملتی میرا یہ گھونگھٹ اتار کر ایک طرف رکھ دو۔"

عامر نے بڑی خوشی سے اس کا گھونگھٹ اتارا اور سرہانے رکھ دیا۔ پھر شازیہ نے کہا۔

"تم دونوں بھائی بہن آپس میں اتنی شدید محبت کرتے ہو کہ اس محبت کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ یہ زیور بوجھ لگ رہے ہیں انہیں بھی اتار دو۔"

عامر ایک ایک کر کے اس کے زیور اتارنے لگا۔ پہلے اس کی نتھ اتار دی' پھر ماتھے کا جھومر اتارا۔ کانوں سے جھمکے الگ کئے پھر اس کی گوری اجلی گردن سے ہار اتارنے لگا۔ اس دوران اس کے ہاتھ اس کی ناک کو چھوتے رہے کبھی شفق رنگ رخساروں پر پھسلتے رہے۔ کبھی اس کی انگلیاں گردن کے صبیح خم پر سرسراتی رہیں۔ شازیہ کی آنکھوں میں نشہ چھانے لگا۔

عامر نے کہا۔ "تم دلہن بن کر بہت اچھی لگ رہی ہو لیکن امبر تو اس روپ میں گڑیا لگ رہی ہو گی۔"

یک بیک شازیہ کی آنکھوں سے نشہ اڑ گیا۔ اس نے دانت کچکچا کر عامر کی طرف دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لے لیکن عامر کی صورت دیکھ کر وہ پھر نرم پڑ گئی۔ وہ سچ مچ اسے دل و جان سے چاہتی تھی اور اسے اپنا لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی' اس نے اپنی بانہیں اپنے نادان دولہا کی گردن میں ڈال کر کہا۔

"تم زیورات اتارنے کے دوران مجھے کتنی دیر تک چھوتے رہے ہو۔ کیا تمہارے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ کیا میرا یہ حسن اور میرے بدن کی یہ ملائمیت تمہیں اچھی نہیں لگی؟"

عامر نے جواب دیا۔ "ہاں تم اچھی لگتی ہو تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں بار بار چھو کر دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتی ہوئی بولی۔

"تمہیں روکتا کون ہے۔ تم ایک بار نہیں ہزار بار مجھے چھو کر دیکھو۔ دیکھو میری آنکھوں میں دیکھو میرے عامر' مجھے پیار کرو۔"

عامر چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ شازیہ نے تڑپ کر کہا۔

"پیشانی کو نہیں عامر میرے ہونٹ پیاسے ہیں اپنے ہونٹوں سے ان کی پیاس بجھا دو۔"

عامر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "نن...... نہیں ہونٹوں کو چومنا تو گندی بات ہے میں تو ہمیشہ امبر کی پیشانی کو چومتا ہوں۔"

وہ ایک دم سے زخمی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ عامر کے سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر زور زور سے جھٹکا دیتی ہوئی بولی۔

"کیا تم مجھے اپنی بہن سمجھ کر یہاں آئے ہو۔ کیا تم بیوی اور بہن کا فرق بھی نہیں جانتے؟ تم آدمی نہیں پتھر ہو' اور ایک پتھر جیسی بہن سے چپک کر رہنا چاہتے ہو لیکن میں گوشت پوست کی عورت ہوں۔ میرے سینے میں دل ہے اور یہ دل اپنے شوہر کی محبت کے لئے تڑپتا ہے ترستا ہے۔ میں تمہاری پیاسی ہوں عامر تمہاری پیاسی ہوں تمہیں میری پیاس بجھانی ہوگی۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ کبھی اس کے بال نوچ رہی تھی' کبھی اس کے کپڑے پھاڑ رہی تھی۔ عامر بار بار اسے دھکے دے کر الگ کر رہا تھا۔ اِدھر شازیہ اپنے ناخنوں سے نوچ کھسوٹ کر رہی تھی۔ اُدھر دوسرے کمرے میں امبر چیختی ہوئی کہہ رہی تھی کہ کوئی اس کے چہرے کو نوچ کھسوٹ رہا ہے اس کوٹھی کے دو کمروں میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ دولہا دلہنوں کے والدین کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے اپنے کمروں سے نکلے۔ احمر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ سیٹھ غفار بھائی نے شازیہ کی چیخیں سن کر اس کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا۔ اور پھر سب ایک ساتھ اونچی آوازوں میں اپنی اپنی باتیں سنانے لگے۔ سب ایک ساتھ بول رہے تھے اس لئے کسی کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سیٹھ غفار بھائی نے کہا کہ وہ سب ڈرائنگ روم میں چلیں اور وہاں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی شکایتیں سنائیں۔

ان کی ہدایات کے مطابق وہ سب ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ سیٹھ غفار بھائی نے سب سے پہلے اپنی بہو شازیہ سے پوچھا۔

"بیٹی تم بتاؤ تم کیوں چیخ رہی تھیں۔ کیا عامر نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے؟"

وہ جواب میں سر جھکا کر نظریں چرانے لگی۔ سہاگ کے کمرے میں جو کچھ بھی ہوا تھا اسے وہ زبان سے دہراتے ہوئے شرما رہی تھی۔ سیٹھ غفار بھائی نے گھور کر عامر کو دیکھا تو اس نے کہا۔

"ڈیڈی محبت ایک پاکیزہ جذبے کا نام ہے۔ جب مجھے امبر پر بہت زیادہ پیار آتا ہے تو میں اس کی پیشانی کو چومتا ہوں۔ وہ پیشانی جو سجدہ کرتی ہے اسے چوما جائے تو محبت کی پاکیزگی برقرار رہتی ہے مگر آپ کی یہ بہو ہونٹوں کو چومنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ بتایئے یہ کتنی گندی بات ہے؟"

شازیہ تو جیسے مارے شرم کے زمین میں گڑ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ پھر بھی وہاں نہ بیٹھ سکی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

سیٹھ غفار بھائی غصے سے لرزتے ہوئے بولے۔

"عامر تم گدھے ہو۔ کیا ایسی باتیں دوسروں کے سامنے کہی جاتی ہیں؟"

"ڈیڈی جو باتیں نہیں کہی جاسکتیں پھر وہ کیوں کی جاتی ہیں؟ یہ کیسی دنیا ہے جس بات کو چار آدمیوں میں برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بات تنہائی میں اچھی کیسے بن جاتی ہے؟ میں اور امبر تنہائی میں اسی طرح رہتے ہیں جس طرح آپ ہمیں دنیا والوں کے سامنے دیکھتے رہتے ہیں لیکن ہمارے پیار کی دیانتداری کو کوئی نہیں سمجھتا...... ہم اپنی دیانتداری سے باز تو نہیں آسکتے؟ میں نے اسی دیانتداری سے شازیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ تعجب ہے کہ آپ دیانتداری اور پاکیزگی پر لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ ڈیڈی سچ پوچھئے تو یہ دنیا ہماری سمجھ میں نہیں آتی جی چاہتا ہے کہ اپنی معصوم بہن کا ہاتھ تھام کر چپ چاپ اس دنیا سے گزر جاؤں۔"

یہ کہنے کے بعد وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ امبر بھی اس کے پیچھے جانے لگی۔ احمر نے سیٹھ غفار بھائی سے کہا۔

"انکل میں امبر کے ساتھ ازدواجی رشتہ نبھا نہیں سکوں گا۔ عامر نے جو سلوک شازیہ کے ساتھ کیا ہے امبر نے وہی سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ وہ مجھے اپنا خاوند سمجھنے کی بجائے بھائی سمجھتی ہے۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں اس کے دل میں بھائی کی محبت کے علاوہ کسی دوسری محبت کی آگ بھڑکا سکوں۔"

سیٹھ غفار بھائی نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں ناقابلِ علاج ہیں۔ یہ دونوں بھائی بہن ساری عمر ایک

دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے اور اپنی محبت کے درمیان کسی کو حائل نہیں دیں گے، لیکن یہ دونوں نوجوان ہیں اگر یہ دنیاوی دستور کے مطابق اپنے شوہر اور بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزاریں گے تو دنیا ہمیں بدنام کرے گی۔ میرے احباب بہت وسیع ہے میں ہر ایک کو فرداً فرداً نہیں سمجھا سکتا اور یہ یقین نہیں دلا سکتا یہ دونوں بھائی بہن دنیا کے ہر غلیظ جذبے سے پاک ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ کر ہیں۔ دنیا والوں کی زبانیں بند رکھنے کے لئے میں نے تمہیں اپنا داماد اور شازیہ کو بنایا ہے۔ اس طرح بھائی بہن کی ناقابل فہم محبت پر پردہ پڑ جائے گا۔"

"معاف کیجئے گا انکل میں ساری عمر ایک بے جان پردہ بن کر امبر کی حماقتوں کو ڈھانپ سکتا۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا میرا دل ایک بیوی کی محبت کے لئے نہیں رہے گا؟"

"بیٹے میں تمہاری دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا ہوں۔ تم ذہین ہو اور زندہ پہلی ہی کوشش میں مردہ دل کیوں بن گئے؟ تمہیں حوصلہ رکھنا چاہئے اور یہ کوشش چاہئے کہ وہ رفتہ رفتہ تمہاری طرف مائل ہوجائے۔ بیٹے اگر تم اپنی کوشش میں کا ہوگئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں انعام کے طور پر پانچ لاکھ کی ایک کوٹھی اور پچیس لاکھ روپے دوں گا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ خواہ انعام کے لئے خواہ ام محبت کے لئے کسی طرح بھی اس معصوم لڑکی کو اپنالو۔"

احمر اور شازیہ کے والدین وہاں بیٹھے یہ باتیں سن رہے تھے۔ اتنے بڑے انع بات آئی تو وہ خوش ہو کر بولے۔

"غفار بھائی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میرا احمر اور میری شازیہ بہت ذہین ہیں دونوں اپنا اپنا ازدواجی رشتہ ضرور نبھائیں گے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے بیٹے احمر کو سمجھانے کے لئے اسے لے کر دوسرے کمرے میں گئے۔ سیٹھ غفار بھائی نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنی سے کہا۔

"بیگم تم ہی کچھ کم عجیب نہیں تھیں۔ یہ عجوبے پیدا کر کے تم نے راتوں کی نیند حرام کر دی ہیں۔"

ایک کمرے میں عامر اور امبر ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بستر کے اطراف کھڑے ہوئے تھے۔ امبر نے کہا۔

"میں تم سے نہیں بولوں گی۔ تم شازیہ کے پاس کیوں گئے تھے؟"

"میں اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا ڈیڈی نے مجھے اس کے کمرے میں دھکیل دیا تھا۔"

"پھر بھی تم احتجاج تو کر سکتے تھے۔ چیخ چیخ کر انہیں دروازہ کھولنے پر مجبور کر سکتے تھے۔"

"تم مجھے ہی الزام دے رہی ہو، اپنی بات نہیں کہتیں کہ یہاں دلہن بنی خاموش کیوں بیٹھی تھیں؟"

"میں مجبور تھی۔ ممی نے مجھے تمہاری قسم دے رکھی تھی کہ میں دلہن کی طرح خاموش بیٹھی رہوں جب تک احمر بات کرنے پر مجبور نہ کرے۔ میں کچھ نہ بولوں اسی لئے میں چپ تھی۔ جب احمر نے آکر میرا گھونگھٹ اٹھایا اور مجھے پیار کرنے کے لئے میرے ہونٹوں پر جھکنے لگا تو میں نے اسے دھکا دے کر ہٹا دیا اور اسے سمجھایا کہ یہ گندی بات ہے۔ اگر پیار کرنا چاہتے ہو تو میرے عامر بھائی کی طرح میری پیشانی کو چوم لو۔"

"تم نے احمر کو اجازت کیوں دی کہ وہ تمہاری پیشانی کو چومے تمہارا بھائی میں ہوں یا وہ ہے؟"

"تم نے شازیہ کی پیشانی کو کیوں چوما تھا۔ تمہاری بہن میں ہوں یا وہ ہے؟ میں اچھی طرح سمجھ گئی اس چڑیل نے تم پر جادو کر دیا ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو میں وہاں تمہیں یاد کرتا رہا۔"

"تم جھوٹ کہتے ہو تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے۔ یہاں آئے اتنی دیر ہوگئی اور تم نے ابھی تک مجھے سینے سے نہیں لگایا۔"

عامر نے پلنگ کے دوسری طرف سے گھوم کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے منہ پھیر کر کھڑی ہوئی ہو، اور سینے سے نہ لگانے کی شکایت بھی کر رہی ہو تم سمجھتی ہو کہ ہمارے سینے میں ایک ہی دل دھڑکتا ہے پھر میں تم سے کیسے الگ رہ سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے امبر کو اپنے سینے سے لگالیا۔ دو دلوں کی دھڑکنیں دو نیز
سنگم پر ہم آہنگ ہوگئیں۔ ایسے وقت میں ان دونوں کو ایسا سکون ملتا تھا جیسے پیدائ
وقت ایک دوسرے سے چپک کر انہیں سکون حاصل ہوا تھا۔ چند لمحوں تک ا
دوسرے سے لگے خاموش کھڑے رہے پھر عامر نے پوچھا۔

"امبر تمہارے زیورات کیا ہوئے؟"

امبر نے جواب دیا۔ "احمر نے ایک ایک کرکے اتار دیئے۔"

"اوہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کمبخت تمہیں ہاتھ لگاتا رہا تھا۔"

"ہاں! شازیہ کے زیورات بھی تو اترے ہوئے تھے کیا تم نے اسے اتارتے
ہاتھ نہیں لایا تھا؟"

"ہاں لگایا تھا۔"

"سچ سچ بتاؤ عامر وہ چھُونے سے تمہیں کیسی لگی؟"

"پہلے تم بتاؤ' احمر نے تمہیں ہاتھ لگایا تو تم نے کیا محسوس کیا؟"

"پہلے میں نے پوچھا ہے۔ اس لئے پہلے تم بتاؤ۔"

"اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو کچھ نہ بتا سکیں گے۔ ایسا کرتے ہیں کہ جس ط
میں نے شازیہ کو ہاتھ لگایا تھا اسی طرح تمہیں بھی ہاتھ لگاتا ہوں تم اپنے احساسات
جاؤ میں اپنے بتاتا جاؤں گا۔"

امبر راضی ہوگئی۔ اس نے اپنا چہرہ اس کی طرف اٹھایا۔ اس کے زیورات پہلے
اترے ہوئے تھے لیکن عامر نے اس کی خیالی نتھ اتارنے کے لئے اس کی ناک کو چھو
ہاتھ کی دوسری انگلیاں شفق رنگ رخساروں پر بکھر رہی تھیں۔ امبر نے کہا۔

"ہائے عامر اب مجھے یاد آیا۔ احمر کی انگلیاں ہی کچھ اور تھیں وہ انگلیاں کچھ عجب
جذبہ میرے اندر پیدا کر رہی تھیں لیکن اس وقت میں نے تمہاری محبت میں اس جذ
توجہ سے محسوس نہیں کیا۔"

"اب میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں شازیہ کی نتھ اتارتے وقت میری انگلیاں گلاب
پنکھڑی پر پھسل رہی تھیں اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا اس وقت تم ذہن پر چھائی
تھیں۔"

"عامر کیا میرا چہرہ گلاب کی پنکھڑی نہیں ہے؟"

"ہاں! بالکل گلاب کی تازہ پنکھڑی ہے کیا میری انگلیوں میں احمر کی انگلیوں جیسی تاثیر
نہیں ہے۔"

امبر کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بمشکل تھوک نگلتی ہوئی بولی۔

"آں.......... ہاں یہ.......... تمہاری انگلیاں پہلی بار مجھے کسی اجنبی مرد کی انگلیاں
لگ رہی ہیں۔"

یکبارگی بجلی کے کڑکنے کی زور دار آواز سنائی دی جیسے ان دونوں کے درمیان بجلی
گری ہو۔ وہ ہڑبڑا کر ایک دسرے سے الگ ہوگئے۔ باہر زور زور سے بادل گرج رہے
تھے۔ تیز ہوائیں کھڑکیوں کے پردے اڑا رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی زد میں امبر کی بکھری
ہوئی زلفیں اِدھر سے اُدھر لہرا رہی تھیں۔ عامر کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ ایک
طوفان آرہا تھا۔ وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے کو سہمی ہوئی اجنبی نظروں سے دیکھ رہے
تھے۔

"یہ کیا ہوگیا؟" یہ سوال دونوں کو پریشان کر رہا تھا۔ ابھی تو ہم تھوڑی دیر پہلے
صرف ایک بھائی بہن تھے اور ابھی ہم صرف ایک مرد اور عورت کیسے بن گئے؟ یہ دنیا
والوں نے ہمارے ساتھ کیسی سازش کی ہے؟ ہمارے پتھر جیسے سینوں پر کیسے بوند بوند زہر
ٹپکایا ہے جو ہمیں معلوم نہیں تھا' وہ زہریلی معلومات ہم تک پہنچائی ہیں۔

کیا بچے جانتے ہیں کہ مرد اور عورت کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟ نہیں وہ تو معصوم ہوتے
ہیں۔ وہ ماں باپ کے پیٹ سے جنسی بھوک لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ یہ دنیا اپنی الٹی
سیدھی تعلیم اور تہذیب کے ذریعہ اپنی نفسیات اور جنسیات کی معلوماتی کتابوں کے ذریعہ'
اپنے ماں باپ کی ازدواجی زندگی کے ذریعے اور اپنے رنگا رنگ ماحول کے ذریعہ ان
معصوم بچوں کو رفتہ رفتہ بالغ بنا دیتی ہے۔"

"میری بہن جب میں تمہیں سینے سے لگا کر اس دنیا میں آیا تھا تو میں نہیں جانتا تھا کہ
دلہن کی نتھ اتارنے سے کون سا جذبہ انگڑائی لیتا ہے۔"

"میرے بھائی اپنی جوانی کے چند لمحے پہلے تک میں نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا تھا اور
سمجھا تھا کہ جب ایک مرد کے ہاتھ آہستہ آہستہ ایک دلہن کے زیور اتارتے ہیں تو آہستہ

آہستہ کون سا چور جذبہ سر ابھارتا ہے۔"

"ہائے میری بہن! یہ ہمارے ساتھ کیا ہوگیا۔ اب ہم پوری دیانتداری کے ایک دوسرے کے قریب کیسے آئیں؟" دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

وہ رات قیامت کی طرح گزری۔ وہ دونوں الگ ہو گئے تھے۔ مگر الگ نہیں تھے اور ایک دوسرے کے قریب آنے سے بھی جھجک رہے تھے۔ احمر نے امبر کو بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی پہلے امبر نے بھی یہی سوچا کہ احمر کی قربت سے بہل جائے یہ درست ہے کہ اسی دولہا کی انگلیوں نے اس کے اندر ایک آگ بھڑکائی تھی اور اسے مرد اور عورت کے فرق کو سمجھایا تھا اور وہ ایک مرد تھا۔ اس کا دولہا تھا لیکن ایسی صورت مین بھی اپنی اپنی پسند کا سوال آتا ہے۔ اور جہاں تک پسند کا تعلق تھا' اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک عامر ہی تھا جس پر وہ کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔

دوسری طرف عامر نے بھی شازیہ سے بہلنے کی کوشش کی لیکن خود کو دھوکہ نہ دے سکا۔ زندگی کی سب سے عزیز ہستی تو وہی تھی جو سینے سے لگ کر پیدا ہوئی تھی اور اپنے سینے سے دل کی دھڑکنوں کو الگ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بیچارے دونوں ہی مجبور تھے۔ کسی غلط راستے پر جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے باوجود امبر کسی کو بھائی کی جگہ اور عامر کسی کو بہن کی جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

ایک رات تو انہوں نے کسی طرح گزار لی۔ وہ ان کی زندگی کی پہلی رات تھی جو وہ الگ رہ کر صبح تک تڑپتے رہے تھے اور ایک انجانے سے خوف کے تحت ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے۔ شب بیداری کے باعث ان دونوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شازیہ اور احمر تھک ہار کر سو گئے تھے۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی رات کے جاگے ہوئے تھے اس لئے نیند پوری کر رہے تھے۔ پھر وہی دو کمرے تھے جن کے درمیان ایک کھڑکی تھی اور وہ کھڑکی کے آر پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خاموش بستر پر بیٹھے تھے عامر نے کہا۔ "میری بہن تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو' اب سو جاؤ۔"

"تم بھی تو جاگے ہوئے ہو پہلے تم سو جاؤ۔"

"ہم میں سے جو بھی پہلے سوئے گا اس کے ساتھ دوسرے کو خود بخود نیند آجائے

گی۔"

"مگر ہم میں سے کوئی سو نہیں سکے گا کیا تم سو سکو گے؟"

"نہیں جس کی آنکھیں نہ ہوں اس کے لئے نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم میری آنکھیں ہو تمہیں آنکھوں سے لگائے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"اور تم میرے دل کا سکون ہو۔ مجھے میرا سکون نصیب نہیں ہوگا تو میں کیسے سو سکوں گی؟"

"ہاں امبر ایک دوسرے کے بغیر ہمارا سینہ خالی ہے مگر اب ہم سینے سے نہیں لگ سکتے۔ پہلے ہم نہیں ڈرتے تھے اب ڈرتے ہیں کہ دنیا کیا کہے گی۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس دنیا سے بہت دور چلے جائیں' ایسی جگہ جہاں ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہو۔"

"ایسی جگہ مل بھی گئی تو کیا ہوگا اب تو ہمیں اپنے آپ کو روکنا ٹوکنا چاہئے ہمیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو تب بھی میں تمہارے قریب نہیں آسکتا۔ پہلے تم بہن تھیں۔ اب شازیہ کی قربت نے میرے ذہن میں زہر ٹپکا دیا ہے کہ تم ایک عورت ہو۔"

"ہاں احمر کے ہاتھوں کے لمس نے بھی مجھے یہی سمجھایا ہے کہ اب تم خالی خولی بھائی نہیں ہو ایک مرد ہو۔ مگر ہم کیسے دور رہ سکیں گے۔ ہمیں کسی طرح نیند نہیں آئے گی کیا ہم اسی طرح جاگتے ہوئے زندگی گزاریں گے؟"

"مگر ہم کب تک جاگتے رہیں گے؟ آؤ ہم پہلے کی طرح اس کھڑکی کے آر پار ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سو جائیں۔ نیند ایک عارضی موت ہے۔ زندہ رہنے کے لئے ہمیں یہ موت مرنا ہوگا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ عامر نے اس کے ہاتھ کی ملائمیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ہتھیلی کیسی نرم نرم گلابی گلابی ہے پہلے یہ نزاکت محسوس نہیں ہوتی تھی۔"

"تمہارے ہاتھ کتنے مضبوط کھردرے ظالم اور مہربان ہیں۔ پہلے مجھے بھی یہ ڈھیر ساری باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ جی چاہتا ہے تم پہلے کی طرح اس ہاتھ کو تھام کر چپ نہ رہو۔"

"میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ چپ نہ رہوں۔ اسے آہستہ آہستہ دابتا رہوں
پھول کی پنکھڑیوں کی طرح مسلتا رہوں۔"

امبر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑی سراسیمگی سے اسے دیکھنے لگی۔
عامر کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی امبر کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے ایک
جیسا ہاتھ لئے ایک اجنبی عورت بیٹھی ہو۔

"اوہ! عامر ہم بہک رہے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا امبر ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ دنیا والوں نے ہم سے کیسی دشمنی کی
ہے؟"

عامر نے اپنا سر تھام لیا۔ امبر اپنے بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی میں مر جاؤں گی۔"

"میں بھی مر جانا چاہتا ہوں میری ایک بات مانو گی؟"

"ہاں بولو ضرور مانوں گی۔"

"جب ہمیں مرنا ہی ہے تو ہم یہاں سے دور جا کر کیوں نہ مریں کیونکہ جس طرح
ہمیں ایک دوسرے کے بغیر نیند نہیں آتی اسی طرح ایک دوسرے کے بغیر موت بھی نہیں
آئے گی۔ یہاں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں مرنا چاہیں گے تو کوئی نہ کوئی روکنے
آجائے گا۔"

امبر نے کہا۔ "بڑی مشکل ہے ہم ایک دوسرے کے بغیر مر بھی نہیں سکتے۔ تم جہاں
لے جانا چاہو گے میں انکار نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ نہ میں تمہیں چھوڑ کر یہاں رہ
سکتی ہوں اور نہ ہی تم میرے بغیر کہیں جا سکتے ہو۔"

"تو پھر چلو سب لوگ سو رہے ہیں ہم چپ چاپ یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"ہم اپنے ساتھ کچھ سامان لے چلیں؟"

"مرنے کے لئے کسی بھی سامان کی ضرورت نہیں ہے ہم تو شرم سے مرنے جا رہے
ہیں کہ بھائی بہن ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں آکر ایک دوسرے کے گلے نہیں لگ
سکتے۔"

وہ دونوں اپنے اپنے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے باہر آئے وہاں انہیں کوئی روکنے

ٹوکنے والا نہ تھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے ذرا الگ الگ تھے۔ باہر سڑک پر آکر امبر
نے پوچھا۔

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"ہمارے لئے جنگل مناسب ہے وہاں صرف جانور رہتے ہیں اور جانور کسی دوغلی
تہذیب کے ذریعہ بھائی بہن کے درمیان کسی غلاظت کا چھینٹا نہیں اڑاتے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ ایک ٹرین کہیں جانے کے لئے
تیار تھی۔ وہ دونوں ایک کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس کمپارٹمنٹ میں کچھ اور لوگ
بھی تھے۔ جب ٹرین چلنے لگی تو امبر نے کہا۔

"عامر مجھے نیند آرہی ہے۔ اس کمپارٹمنٹ میں بھی تنہائی نہیں ہے میں تمہارے
سینے سے لگے بغیر کیسے سو سکتی ہوں؟"

"مجبوری ہے یہاں میں تمہیں سینے سے لگا کر نہیں سلا سکتا۔ اب ہم ایک ہی بار
ایک دوسرے کے سینے سے لگیں گے اور ایک بار سوئیں گے' اس کے بعد کبھی نہیں
اٹھیں گے' لیکن اب ابدی نیند کے لئے بھی انسانوں کی اس دنیا میں جگہ نہیں ہے۔ ہم
اس کھڑکی کے باہر دیکھتے رہتے ہیں' جہاں گھنا جنگل نظر آئے گا ہم وہیں اتر جائیں گے۔"

وہ دونوں خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ کمپارٹمنٹ کے لوگ ان دونوں کو
عجیب شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کے ساتھ سامانِ سفر نہیں تھا اور وہ
دونوں جوان تھے' ان کی موجودہ حالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دونوں عاشق اور معشوق ہیں
اور گھر سے بھاگ کر کہیں جا رہے تھے۔

کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد ٹرین ایک گھنے جنگل کے درمیان سے گزرنے
لگی۔ انہیں وہی جگہ مناسب نظر آئی۔ جب ٹرین ایک چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر پہنچ
کر رکی تو وہ وہاں اتر گئے۔ کمپارٹمنٹ کے لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر انہیں دیکھ رہے
تھے۔ وہ سب مجبور تھے اپنا سفر ملتوی کر کے ان کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ جب ٹرین آگے
بڑھ گئی تو وہ پلیٹ فارم سے باہر جانے لگے۔ اس ویران اسٹیشن پر اترنے والے وہی دو
مسافر تھے اور وہاں کا اسٹیشن ماسٹر ٹکٹ کلکٹر اور پورٹر بھی ایک ہی آدمی تھا۔ وہ بیک وقت
تمام فرائض انجام دیتا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس نے ٹکٹ طلب کیا لیکن ٹکٹ نہیں

تھا۔ جیب میں پیسے بھی نہیں تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

عامر نے جواب دیا۔ "یہ میری بہن ہے۔ اس ٹرین میں چند دشمن ہمارا پیچھا کر رہے تھے ہم اپنی جان بچانے کے لئے اپنا سامان چھوڑ کر یہیں اتر گئے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "ہوں! تم دونوں اپنے لباس سے اور حلیے سے کسی بڑے گھرانے کے معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ میرے گھر چلو' جب دوسری ٹرین آئے تو گھر واپس چلے جانا اور مجھے یہ بتاؤ کہ کون سے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے میں ابھی فون پر بات کرتا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر تمہارا سامان اتار لیا جائے گا۔"

عامر نے کہا۔ "ہمیں سامان کی پرواہ نہیں ہے۔ جان بچ گئی یہی بہت ہے۔ اب ہم یہاں سے جنگل ہی جنگل واپس جائیں گے کیونکہ دشمن دوسری ٹرین سے واپس بھی آئے ہیں۔"

"میاں صاحبزادے اب تم دونوں میری پناہ میں ہو' میں اگلے اسٹیشن سے چند سپاہیوں کو بھی طلب کرلوں گا وہ تم دونوں کو بخیریت گھر پہنچا کر آجائیں گے۔"

وہ دونوں مجبور ہو کر اس کے ساتھ جانے لگے اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"تم کہتے ہو کہ تمہیں سامان کی پرواہ نہیں ہے کیا لکھ پتی باپ کی اولاد ہو؟"

امبر نے فخر سے کہا۔ "لکھ پتی نہیں کروڑ پتی کہئے ہم سیٹھ غفار بھائی کے........"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عامر نے کہنی سے ٹھوکا مار کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ امبر کو فوراً عقل آگئی کہ اسے اپنا صحیح نام و پتہ نہیں بتانا چاہئے۔ بوڑھا تجربہ کار اسٹیشن ماسٹر انہیں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا۔ اسٹیشن کے پیچھے ایک چھوٹی سی بستی تھی وہیں اس کا کوارٹر تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں انہیں چھوڑ کر واپس اسٹیشن آیا اور فون کے ذریعے دوسرے اسٹیشن سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ جب رابطہ قائم ہوگیا تو وہ دوسری طرف کسی کو بتانے لگا کہ وہاں ایک نوجوان جوڑا آیا ہے" دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے ہیں' اور اپنی اصلیت چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ لڑکی کی بات سے پتہ چلا ہے کہ کروڑپتی سیٹھ غفار بھائی سے ان کا کوئی تعلق ہے؟

آپ یہاں چند سپاہی بھیج دیں اور سیٹھ غفار بھائی سے رابطہ قائم کرکے مزید معلومات حاصل کریں۔

فون پر باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہوگیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی بستی سے شور سنائی دیا۔ وہ جلدی سے پلیٹ فارم کے باہر آکر دیکھنے لگا۔ دور بہت دور امبر اور عامر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنگل کی طرف بھاگ رہے تھے اور بستی کے مرد' عورت' بچے اور بوڑھے ان پر پتھر برسا رہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر چیختے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو' انہیں نہ مارو۔ انہیں بھاگنے کا موقع نہ دو' انہیں پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

اسٹیشن ماسٹر کی بیوی نے آگے بڑھ کر راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"اے جی' تم کن لوگوں کو پکڑ کر لے آئے تھے؟ تم تو کہتے تھے کہ وہ بھائی بہن ہیں مگر وہ تو عاشق معشوق نکلے۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "ہاں دیکھنے میں تو بڑے سیدھے سادے نظر آتے تھے۔ وہ دونوں نیند کے جھونکوں سے بار بار گرتے اور سنبھلتے جارہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کئی راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔ آپ کی گھر والی نے انہیں سونے کے لئے الگ الگ چارپائیاں دیں' مگر وہ کمبخت ایک ہی چارپائی پر سونے لگے۔ ہم نے روکا تو کہنے لگے ہم سچ مچ بھائی بہن ہیں ہمارے دل میں کوئی گناہ نہیں ہم بچپن سے اسی طرح سوتے آئے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ماننے کی بات ہے۔ میں نے انہیں بڑا برا بھلا کہا۔ ہماری باتیں سن کر بستی کے دوسرے لوگ بھی آگئے۔ لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر اس نوجوان نے کہا۔ چلو امبر یہ دنیا والے ہمیں یہاں بھی نہیں سونے دیں گے۔ یہ کہتے ہی وہ نوجوان لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگا۔ ایسے لوگ جو دنیا والوں کے سامنے خود کو بہن بھائی کہتے ہیں اور تنہائی میں ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے ہیں انہیں سنگسار کرنا چاہئے۔ انہیں اتنے پتھر مارنے چاہئیں کہ پتھروں کے ڈھیر میں ان کا گنہگار وجود چھپ جائے۔ اسی لئے سب لوگ انہیں پتھروں سے مارنے لگے۔ وہ دونوں بھاگتے بھاگتے بھی لہولہان ہوچکے ہیں آگے جاکر کہیں گر پڑیں گے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "تم لوگ ان کا پیچھا کرو میں دوسری ٹرین سے آنے والے سپاہیوں کا انتظار کر رہا ہوں ہم انہیں سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے۔"

اس کی ہدایت کے مطابق بستی کے کتنے ہی نوجوان اور بوڑھے ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے جنگل کی طرف چلے گئے۔

پھر جنگل انسانی قدموں کی دھمک سے گونجنے لگا۔ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور چاروں طرف پھیل کر انہیں تلاش کرنے لگے۔ شام تک وہ سب جنگلوں میں بھٹکتے رہے پھر اندھیرا ہونے لگا تو وہ سب واپس آ گئے۔ بستی میں سپاہی آ گئے تھے۔ ایک بڑی کار میں سیٹھ غفار بھائی، شازیہ اور احمر، نفسیاتی تجزیہ کرنے والا ڈاکٹر سب ہی وہاں آ پہنچے تھے ان کا پیچھا کر کے ناکام واپس آنے والے انہیں بتانے لگے کہ وہ بری طرح لہولہان ہو گئے ہیں۔ جنگل میں دور تک کہیں کہیں خون کے دھبے نظر آئے تھے لیکن پھر اندھیرا ہو گیا اس لئے ہم مجبوراً واپس چلے آئے۔

یہ سن کر کہ عامر اور امبر بری طرح زخمی ہو گئے ہیں اور جنگل میں دور تک اپنے خون کی دھار بہاتے گئے ہیں، سیٹھ غفار بھائی اپنی اولاد کی اس حالت پر رونے لگا۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔

"ہم ابھی کار میں چلیں گے آپ لالٹین اور ٹارچ لائٹ وغیرہ کا انتظام کریں۔ جہاں تک یہ گاڑی جا سکے گی ہم جائیں گے، اس کے بعد پیدل چلیں گے اور انہیں تلاش کریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایک انسپکٹر، چار سپاہیوں اور شازیہ اور احمر کے ساتھ اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو ٹارچ لائٹ اور آدھی درجن لالٹینیں تھیں باقی سپاہیوں اور بستی والوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ان کے پیچھے چلے آئیں۔ راستے میں پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب آپ کو بچپن ہی سے ان کی عادت پر کنٹرول کرنا چاہئے تھا۔ بچپن کی عادت سے مجبور ہو کر وہ آج بھی ایک ساتھ سوتے ہیں، اور آپ بدنام ہوتے ہیں۔"

سیٹھ غفار بھائی نے کہا۔ "میں نے حتی الامکان کوشش کی۔ تجربہ کار ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کیں لیکن وہ پیدائشی طور پر ایسے ہیں۔ انہیں جبراً آپریشن کے

ذریعے جدا کیا گیا تھا۔"

ماہر نفسیات نے کہا۔ "انسان قدرت کے آگے بے بس ہے۔ قدرت نے انہیں جس طرح بنا کر بھیجا تھا۔ دنیا والوں نے انہیں اس طرح رہنے نہ دیا پہلے ہی دن آپریشن کے ہتھیاروں سے انہیں کاٹ کر ان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اب یہ دو ٹکڑے آخری دم تک ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

کار ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ آگے راستہ خراب تھا۔ گھنی جھاڑیاں اونچے نیچے ٹیلے اور دلدلیں تھیں۔ انہوں نے کار سے اتر کر لالٹینوں کو روشن کیا پھر خون کے دھبوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کہیں وہ دھبے گم ہو جاتے تھے اور کہیں نظر آنے لگتے تھے۔ سیٹھ غفار بھائی کا خون ان سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ آدھی رات تک بھٹکتے رہے۔ پہلے خونخوار بھیڑیوں کی آوازیں جنگل کے سناٹے میں گونج رہی تھیں اور اب آدم خور شیروں کی دہاڑیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انسپکٹر نے کہا۔

"میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لئے اوّل تو رائفلوں کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان جانوروں کو مارنے سے پہلے فارسٹ آفیسر کی اجازت لینی ہو گی۔ اس جنگل میں سرکار کی طرف سے خطرناک چیتے پالے جاتے ہیں۔"

وہ مجبور تھے تھک ہار کر واپس چلے آئے۔ سیٹھ غفار بھائی کی دنیا لٹ رہی تھی۔ وہ آرام سے سو نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنی گاڑی لے کر وہاں سے پچاس میل دور فارسٹ آفیسر کے پاس پہنچے اور اس سے التجا کی کہ اس کے لئے رائفلیں مہیا کی جائیں اور انہیں اس جنگل میں جانے کی اجازت دی جائے۔

فارسٹ آفیسر نے کہا۔ "اس سلسلے میں مجھے اعلیٰ حکام سے اجازت لینی ہو گی۔ دوسرے ملکوں کے سربراہ یہاں آ کر شکار کھیلتے ہیں ان کے لئے خاص طور سے یہ درندے پالے جاتے ہیں۔"

سیٹھ غفار بھائی نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کی ایک بھاری گڈی نکال کر اس کے آگے رکھ دی اور اس سے کہا۔

"دو انسانی زندگیوں کا سوال ہے انہیں بچانے کے لئے آپ چاہیں تو خصوصی

اجازت دے سکتے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اس جنگل کے کسی بھی جا
اس وقت تک نقصان نہیں پہنچائیں گے جب تک کہ وہ ہمارے لئے خطرہ نہ بن جائ
فارسٹ آفیسر نے کہا۔ "نوٹوں کی یہ گڈی زیادہ سے زیادہ ایک برس تک میر
کام آئے گی لیکن اس کے لئے مجھے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ہاں یہ ہو
ہے کہ آپ اپنی گاڑی میں مجھے شہر لے چلیں میں وہاں اجازت حاصل کرنے کے لئے
طور پر کوشش کروں گا۔"

سیٹھ غفار بھائی اسے اپنی کار میں بٹھا کر شہر لے گئے۔ اس بدحواسی میں وہ دونوں بھول گئے تھے کہ چھٹی کا دن ہے اور تمام دفاتر بند ہیں۔ وہ دوپہر کو شہر پہنچے تو انہیں حماقت کا پتہ چلا۔ سیٹھ غفار بھائی کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیں۔ ان کی بے پناہ دولت کسی کام نہیں آرہی تھی۔ پتہ نہیں وہ دونوں کہاں تھے اور کس حا میں تھے۔ اپنے بچوں تک پہنچنے کے لئے دل تڑپ رہا تھا اور جان نکلی جارہی تھی۔ اعلیٰ حکام سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس لئے وہ دوسرے دن کے انتظار میں وہاں رک گئے۔

وہ ایک رات نہیں سوئے تھے اور اب دوسری آگئی تھی۔ نیند ان پر غالب آرہی تھی اور وہ اونگھتے ہوئے بھی سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں ان کے بچوں کو سونے کی جگہ نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ سونے کی جگہ تلاش کرنے کے لئے ہی گھر سے بھاگے تھے۔ جنگل میں تو کوئی انہیں روکنے والا نہ ہوگا۔ وہ تو آرام سے سو رہے ہوں گے۔

دوسرے دن وہ اعلیٰ حکام سے خصوصی اجازت لے کر رائفل بردار سپاہیوں کے ساتھ اپنے بچوں کی تلاش میں پھر اسی بستی میں واپس آگئے۔ اب ان کے ساتھ جیپ کاریں بھی تھیں۔ سبھی ایک قافلے کی صورت میں جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ سیٹھ غفار بھائی دل ہی دل میں حساب کر رہے تھے کہ وہ دونوں کتنے دن سے غائب ہیں۔ دو دن اور دو راتیں گزر چکی تھیں اور اب تیسرا دن تھا نہ جانے وہ بھوکے پیاسے جنگل میں کیسے جی رہے ہوں گے۔ مگر انہیں ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی جہاں کوئی تہذیب ان کے درمیان حائل نہ ہو۔

وہ بہت دور تلاش کرتے ہوئے جنگل کے قلب آگئے۔ وہاں پھر انہیں خون کے

سوکھے ہوئے دھبے نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تو انہیں انسانی کھال کی کچھ دھجیاں نظر آئیں۔ سیٹھ غفار بھائی کے حلق میں سانسیں رکنے لگیں۔ وہ سب ایک غار کی طرف بڑھتے جارہے تھے اور جیسے جیسے بڑھتے جارہے تھے انہیں کھال کی دھجیاں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ بوڑھے باپ کے قدم لڑکھڑاتے جارہے تھے۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ایک سپاہی کے بازو کا سہارا لے کر ایک غار میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھے تو کتنے ہی گدھ اُڑتے ہوئے غار کے دھانے سے باہر نکل گئے۔ سب سے آگے انسپکٹر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لائٹ تھی۔ غار میں اندھیرا تھا۔ وہ ٹارچ لائٹ کی روشنی اِدھر اُدھر پھینک کر دیکھنے لگا۔ سرنگ کے ایک موڑ پر انسانی لہو ٹیڑھے میڑھے راستے سے بہتا ہوا اس کے قدموں تک آرہا تھا' اور وہ لہو سوکھ چکا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا سرنگ کے موڑ پر آیا اس کے پیچھے سیٹھ غفار بھائی اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی سب کے قدم رک گئے۔

وہاں عامر اور امبر نہیں تھے۔ سیٹھ غفار بھائی اپنے جن بچوں کو ڈھونڈنے آئے تھے۔ وہ بچے وہاں نظر نہیں آئے۔ کیا کوئی باپ ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ان ڈھانچوں کو اپنی گود میں کھلاتا رہا ہے اور اس دنیا کی شرمیلی تہذیب کا درس دیتا رہا ہے؟"

وہ محض ڈھانچے تھے' ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک کا سینہ دوسرے کے سینے سے ملا ہوا تھا۔ قدرت نے جس روز جس صورت میں انہیں بنایا تھا وہ اسی صورت میں اسی روزِ اوّل کی طرف لوٹ گئے تھے۔

☆=====ختم شد=====☆

انجانے دشمن

ٹرین کے ان دو مسافروں کی خوفناک داستان جو اپنی زندگی کے آخری اسٹیشن تک آپہنچے تھے۔ وہ موت سے بھاگ رہے تھے مگر پراسرار موت ان کی ہمرکاب تھی۔

پہاڑی کے دامن میں وہ چھوٹا سا ریلوے پلیٹ فارم کہر کے دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ آدھے چاند کی آدھی چاندنی کہر سے لپٹ کر دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ دور رات کے سناٹے میں کسی تیز رفتار ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انجن کی لائٹ دھندلکے کو چیرتی ہوئی نظر آنے لگی ویران پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اسٹیشن ماسٹر نے ہاتھ میں لٹکی ہوئی سگنل لائٹ اونچی کر دی اور آنے والی ٹرین کو سبز روشنی دکھانے لگا۔ وہ اس چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر بھی تھا' سگنل مین بھی تھا اور ٹکٹ کلکٹر بھی۔ جب ٹرین دندناتی ہوئی پلیٹ فارم تک آگئی تو ہیڈ لائٹ کی روشنی میں اس اسٹیشن کا سائن بورڈ نظر آیا۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "آخری اسٹیشن۔"

وہ بڑی لائن کا آخری اسٹیشن تھا۔ دوسری طرف کے پلیٹ فارم سے چھوٹی لائن یا نیرو گیج پہاڑ کی بلندیوں تک جاتی تھی۔ اس وقت براڈ گیج پر آنے والی ٹرین آہستہ آہستہ رک رہی تھی۔ ریل کے کمپارٹمنٹ زرد روشنی میں تقریباً خالی نظر آرہے تھے۔ گنتی کے چند مسافر پلیٹ فارم پر اترے اور اسٹیشن ماسٹر یا ٹکٹ کلکٹر کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنے ٹکٹ رکھتے ہوئے گزر گئے۔ اسٹیم انجن کا ڈرائیور اور فائرمین آپس میں باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے پاس آئے اور اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلے گئے۔

پلیٹ فارم انسانوں سے خالی ہوگیا۔ بظاہر ٹرین بھی مسافروں سے خالی تھی لیکن اگلے کمپارٹمنٹ میں ایک مسافر بند کھڑکی سے ٹیک لگائے سہا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اوور کوٹ کے کالر آدھے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے اور آدھے چہرے پر فلیٹ ہیٹ جھکا ہوا تھا۔ وہ کمپارٹمنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے سوچ رہا تھا کہ اس کے لئے کھلا پلیٹ فارم مناسب ہوگا یا وہ بند کمپارٹمنٹ میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس ٹرین کے سب سے آخری کمپارٹمنٹ میں ایک اور مسافر تنہا سا' سہا ہوا سا بیٹھا

تھا۔ اس کے سر پر اونی ٹوپی تھی۔ وہ گیروئے رنگ کے کمبل میں اس طرح لپٹا ہوا
اس کے دونوں ہاتھ کمبل کے اندر چھپ گئے تھے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا' موت
کی زندگی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے میں یہاں چھپا بیٹھا رہوں گا تب بھی موت میری
کے قریب رہے گی۔ مجھے ڈرنے کی بجائے ہمت سے کام لینا چاہئے۔ بستی یہاں سے
میل کے فاصلے پر ہے' میں اپنے دشمن کو سینکڑوں میل پیچھے چھوڑ آیا ہوں' وہ کوئی
بھوت نہیں ہے کہ اس ویرانے میں بھی آجائے۔ میں فضول ڈر رہا ہوں۔ مجھے یہاں
نکل کر فوراً ہی بستی کی طرف جانا چاہئے۔ ابھی میری موسی جاگ رہی ہوگی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اگلے کمپارٹمنٹ کا مسافر بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے پلیٹ فارم پر اترنے
پہلے دوسری طرف کی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ وہ اس علاقے میں پہلی بار آیا تھا۔ اس
آس پاس کے ماحول کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ ٹرین کے دوسری طرف کھلی
کھڑکی سے دور تک کچھ دکھائی نہ دیا کیونکہ کہر کی چادر نے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ ہاں
ہی چند گز کے فاصلے پر نئی پرانی قبریں نظر آرہی تھیں۔

قبروں کو دیکھ کر موت یاد آئی اور موت کی یاد نے اس کے جسم میں جھرجھری
دی۔ وہ کہاں پہنچ گیا تھا؟ ٹرین کے ایک طرف ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا اور
طرف انسانی مسافرت کا آخری اسٹیشن نظر آرہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کا شٹر گرا دیا۔

وہ جلدی سے پلٹ کر کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ کھلی
آکر اسے یوں لگا کہ وہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا کھڑا ہوا ہے۔ دور دور تک سناٹا
آدھے چاند کی چاندنی' رات کی سیاہی میں دم توڑ رہی تھی۔ چاروں طرف شبنمی کہر
ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ پلیٹ فارم پر پتھریلے کوئلے کی بجریاں بچھی
تھیں۔ جو اس کے قدموں تلے چرمرا رہی تھیں' سسک رہی تھیں اور گہری خاموشی
گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ اسے پلیٹ فارم کے آخری حصے سے بجریوں کا ماتم
تھا۔

چند لمحوں تک سناٹا طاری رہا۔ پھر دونوں نے سوچا کہ وہاں کوئی دوسرا نہیں
اپنے ہی قدموں کی آوازیں ہیں جو سناٹے میں دور تک جاتی ہیں اور بازگشت

ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف جانے لگے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا
تھا۔ لالٹین کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ اس روشنی کے قریب پہنچ کر دونوں نے ایک
دوسرے کو دیکھا اور سہم کر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوگئے۔

شبنمی دھند میں وہ ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے' قریب ہو کر ایک
دوسرے کو پہچاننے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ دلوں میں ایسی دہشت تھی کہ ایک
دوسرے کے متعلق ذرا زبان ہلا کر پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے
قہقہے کی آوازیں سن کر ان میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا کہ قریب ہی کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہاں
پناہ مل سکتی ہے۔

وہ دونوں تیزی سے کمرے کی طرف بڑھے' اوور کوٹ والا مسافر پہلے کمرے میں
پہنچا۔ اس کے بعد کمبل والا آیا۔ اسٹیشن ماسٹر' انجن ڈرائیور اور فائرمین کے ہاتھوں میں
چائے کی پیالیاں تھیں اور اجنبیوں کو دیکھ کر ان کے قہقہے رک گئے۔ وہ سوالیہ نظروں
سے انہیں دیکھنے لگے۔

وہ دونوں مسافر بھی ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ایک
دوسرے کو پہچانتے تھے۔ موت کا چہرہ کس نے دیکھا ہے؟ انہوں نے تو ابھی تک نہیں
دیکھا تھا' لیکن اتنا یقینی طور پر جانتے تھے کہ موت ان کے آس پاس ہے۔ بالکل قریب ہے
اور ٹھیک اسٹیشن کے سامنے ٹرین کے دوسری طرف انسانی زندگی کا آخری اسٹیشن ہے۔

وہ ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے' کمبل والے مسافر نے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھ
کر کہا۔

"میرا نام رب نواز ہے۔ جلیاں کی بستی میں میری موسی رہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں
کہ وہ بستی یہاں سے تین میل پر ہے۔ میں رات کو تنہا وہاں نہیں جاسکتا۔ کیا آپ مجھے
یہاں پناہ دیں گے۔"

"تم تنہا کیوں نہیں جاسکتے؟" اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "لوگ راتوں رات پچاسوں میل
پیدل چلے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں کبھی چوری ڈکیتی یا قتل کی واردات نہیں ہوئی۔ تم
ہٹے کٹے نوجوان ہو۔ تمہیں تو ہنستے گاتے جانا چاہئے۔ جہاں تک پناہ دینے کا تعلق ہے' میں
اس کمرے میں مسافر کو رات گزارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہاں تمہارے لئے
ویٹنگ روم کھول سکتا ہوں۔"

رب نواز سر جھکا کر سوچنے لگا وہ کن انکھیوں سے دوسرے مسافر کو دیکھ رہا تھا
دوسرے مسافر نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔

"میرا نام ہاشم علی ہے۔ میں نے ریلوے ٹائم ٹیبل میں دیکھا ہے کہ باگیسری جانے کے لئے یہاں سے دس بجے رات کو ٹرین جاتی ہے۔ اب دس بجنے والے ہیں کیا ٹرین کی آمد تک میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔ "باگیسری جانے والی ٹرین چوبیس گھنٹے لیٹ ہے۔ اوپر کے علاقوں میں برفباری ہو رہی ہے۔ صبح ریلوے لائن سے برف ہٹائی جائے گی' تب ٹرین چلے گی۔"

"اوہ..........!" ہاشم نے پریشان ہو کر کہا۔ "میرے لئے تو مصیبت ہو گئی۔ میں رات کہاں گزاروں گا۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔"

وہ تینوں رب نواز اور ہاشم علی کو دیکھ کر سوچنے لگے۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں مسافر گھبرائے اور سہمے ہوئے ہیں۔ انجن ڈرائیور نے ذرا سوچنے کے بعد کہا۔

"آپ ہاشم صاحب! اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں۔ یہاں آپ کا کوئی نہیں ہے۔ آپ ویٹنگ روم میں رات گزار سکتے ہیں بشرطیکہ آپ وہاں تنہا سو سکیں اور رب نواز صاحب' آپ کی موسی جلیاں کی بستی میں رہتی ہے لیکن آپ تنہا تین میل کا سفر نہیں کر سکتے۔ آپ ایسا کریں کہ ہاشم صاحب کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ انہیں آپ کی موسی کے ہاں ویٹنگ روم سے زیادہ آرام ملے گا اور آپ کو بھی ایک ہم سفر مل جائے گا۔"

رب نواز نے خوفزدہ نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں ایک اجنبی کے ساتھ اتنی رات کو کہیں نہیں جا سکتا۔ آپ لوگ نہیں جانتے ایک شخص میری جان کا دشمن ہے۔ اس نے ایک کرائے کے قاتل کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں قاتل کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ پتہ نہیں وہ کون ہے میں اس اجنبی پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں۔"

"میں کرائے کا قاتل نہیں ہوں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں بھی ایک قاتل سے پیچھا چھڑانے کے لئے بھاگ کر یہاں آیا ہوں اور یہاں سے باگیسری جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے اس دشمن کو دیکھا ہے' اس کے باوجود میں اسے پہچان نہیں سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے

روپ بدلتا ہے آپ لوگ شاید یقین نہ کریں وہ کسی ڈائن کی اولاد ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر انجن ڈرائیور اور فائرمین نے اسے دیدے پھاڑ کر دیکھا۔ پھر قہقہے لگانے لگے۔ فائرمین نے کہا۔

"آپ نے پتلون اور اوور کوٹ پہن رکھا ہے۔ سر پر فیلٹ ہیٹ ہے۔ اس لباس سے آپ پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی نظر آتے ہیں اور باتیں بھوت چڑیل کی کرتے ہیں۔ بھئی میں نے تو آج تک کسی ڈائن یا چڑیل کو نہیں دیکھا مگر آپ نے تو چڑیل کی اولاد بھی پیدا کر دی۔"

وہ پھر قہقہے لگانے لگے۔ رب نواز نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"سنیئے جناب! یہ ہاشم صاحب کی باتیں سن کر میں بھی اب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرا قاتل بھی کسی چڑیل کی اولاد ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ میں اسے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ دراصل میرے کہنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ وہ اپنا روپ بدلتا ہو گا۔ اس لئے وہ ہر بار میرے لئے اجنبی ہوتا ہے۔"

"یک نہ شد دو شد۔" اسٹیشن ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں آسیب زدہ ہیں اور اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں۔ آپ انہیں روپ بدلنے والا شخص سمجھتے ہیں اور یہ آپ کو چڑیل کی اولاد سمجھ کر سہمے جا رہے ہیں۔ بھئی یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ ہم آپ دونوں کو انسان کی اولاد سمجھتے ہیں' آپ بھی ایک دوسرے کو انسان سمجھئے۔"

انجن ڈرائیور نے کہا۔ "ہاں آپ دونوں دور دور رہ کر اور خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے رہیں گے۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کیجئے اور دوست بن جائیے۔"

"بالکل ٹھیک۔" فائرمین نے کہا۔ "آپ دونوں دوست بن کر اور متحد ہو کر اپنے اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں' اور اس بات کا یقین ہم دلاتے ہیں کہ اتنی رات کو اس ویرانے میں آپ کا کوئی دشمن نہیں آئے گا۔"

ہاشم علی اور رب نواز نے ایک دوسرے کو ذرا سہمی ہوئی نظروں سے اور ذرا دوستانہ نظروں سے دیکھا۔ اپنے جیسے تین انسانوں کے سامنے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے انسانوں کی طرح مصافحہ کر کے آپس میں دوست بن سکتے تھے یا دشمن کو پہچان سکتے تھے۔ ہاشم علی نے اوور کوٹ کی جیب سے دایاں ہاتھ باہر نکالا اور جھجکتے ہوئے

آگے بڑھا۔ رب نواز نے بھی کمبل کے اندر سے اپنا دایاں ہاتھ نکالا وہ بھی ڈرے کانپ رہا تھا لیکن دونوں نے مصافحہ کر ہی لیا۔

وہ تینوں چائے کی پیالیاں رکھ کر ہنستے ہوئے تالیاں بجانے لگے۔ ہاشم اور رب نواز بھی کسی قدر مطمئن ہو کر مسکرا رہے تھے۔ اب بظاہر وہ خوفزدہ نہیں تھے لیکن ان کے زرد چہرے بتا رہے تھے کہ کسی نادیدہ دشمن سے وہ اب بھی سہمے ہوئے ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ "اب آپ دونوں اچھے دوستوں کی طرح رات گزاریں گے تو کسی تیسرے کی مجال نہ ہوگی کہ وہ دو دوستوں پر حملہ کر سکے۔ پھر یہ کہ ہم تین بندے یہاں موجود ہیں۔ میں ریلوے کے قانون اور حفظ ماتقدم کے پیش نظر آپ لوگوں کو اس کمرے میں سونے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ یہاں ریلوے کے ٹکٹ اور کیش وغیرہ کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ آپ دونوں اتنی رات گئے جلیاں کی بستی تک بھی نہیں جا سکتے۔ آپ لوگوں کے دل و دماغ میں کسی چڑیل کی اولاد کا خوف سمایا ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ویٹنگ روم میں چلے جائیں اگر زیادہ ڈر لگے تو دروازے کو اندر سے بند کر لیں۔ اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو ہمیں آواز دے لیں۔ ویٹنگ روم یہاں سے صرف دس قدم کے فاصلے پر ہے۔"

ہاشم اور رب نواز نے ایک دوسرے کو اعتماد سے دیکھا۔ اعتماد اس لئے بھی ضروری تھا کہ رات گزارنے کی کوئی دوسری پناہ نہیں تھی اور وہ دوست بن کر ہی اس رات کی صبح کر سکتے تھے۔

رب نواز نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہاشم صاحب میرے دوست ہیں۔ ہم ویٹنگ روم میں رات گزاریں گے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے میز کی دراز کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور فائر مین کو دیتے ہوئے بولا۔

"تم ان کے ساتھ جاؤ اور ویٹنگ روم کا دروازہ کھول دو۔"

ہاشم علی نے میز پر رکھے ہوئے اسٹوو کو دیکھا جس پر چائے گرم کی گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"میرے پاس گوشت کا سالن اور روٹیاں ہیں۔ میں سالن کو اسٹوو پر گرم کرنا چاہتا ہوں۔"

اسٹیشن ماسٹر نے اسٹوو اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور یہ چائے تیار ہے۔ اسے بھی لے جائیے۔ روٹیاں کھانے کے بعد چائے گرم کر کے پی لینا۔ رات اچھی گزر جائے گی۔"

رب نواز نے آگے بڑھ کر اسٹوو کو اٹھایا۔ ہاشم نے چائے کی کیتلی اور دو پیالے پکڑ لئے۔ پھر وہ دونوں فائر مین کے ساتھ باہر آ گئے۔

باہر وہی کہر کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ فائر مین لالٹین پکڑے ان کے آگے چل رہا تھا۔ وہ دونوں محتاط نظروں سے آگے پیچھے دیکھتے جا رہے تھے۔ صرف دس قدم کا فاصلہ تھا۔ فائر مین دروازے کا تالا کھولنے لگا۔ خاموش کھڑی ہوئی ٹرین کی دو بوگیوں کے درمیان سے دوسری طرف قبرستان نظر آ رہا تھا۔ دھند میں تو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن ان دونوں کو چشم تصور میں نظر آ رہا تھا اور وہ دیکھنے سے کترا رہے تھے۔

ویٹنگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے اندر جا کر چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا کہ کہیں وہ نادیدہ دشمن تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ ٹائلٹ کا دروازہ بھی کھول کر دیکھا گیا۔ کوئی نہیں تھا۔ اس چار دیواری میں خطرہ نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی گول میز تھی۔ اس کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ لانبے بنچ تھے۔ جن پر سویا جا سکتا تھا لیکن ان کی آنکھوں سے نیند اڑی ہوئی تھی۔ فائر مین کے جانے کے بعد ہاشم نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پھر سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔

چھت کھپریل کی تھی۔ ایک آدھ کھپرا اپنی جگہ سے ذرا سرک گئی تھی۔ مگر گہری دھند نہ ہوتی تو ان کھپروں کے درمیان سے آسمان نظر آ جاتا۔ چھت کمزور نہیں تھی۔ صرف ایک آدھ جگہ رخنے پڑ گئے تھے۔

"ان سوراخوں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔" ہاشم نے کہا۔

رب نواز بھی ذرا سہمی ہوئی نظروں سے چھت کے اس حصے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں۔ مگر صرف ٹھنڈی ہوا آ سکتی ہے۔ اتنے چھوٹے شگافوں سے کوئی دشمن نہیں آ سکتا۔"

"نہیں آ سکتا۔" ہاشم نے بڑی مشکل سے تھوک نگل کر کہا۔ "بالکل نہیں آ سکتا۔ وہ

ہماری طرح انسان ہے۔ صرف روپ بدلتا ہے جسم نہیں بدل سکتا۔ ہوا بن کر ناکے سے نہیں گزر سکتا.........“

وہ ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر میز کے اطراف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں کے درمیان دو گز کا فاصلہ تھا۔ ہاشم نے اوور کوٹ کی تھیلا نما جیب سے اخبار میں لپٹی روٹیاں نکالیں، پھر ایک چوکور ڈبہ نکالا جس میں بھنے ہوئے گوشت کا سالن تھا۔

سالن گرم کرنے کے بعد ہاشم نے رب نواز کو کھانے میں شریک ہونے کو کہا۔ دوستی ہو چکی تھی۔ ایک ساتھ کھانے سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رب نواز اس کے پاس والی کرسی پر آ گیا۔ پھر دونوں لقمے توڑ کر کھانے لگے۔

ہاشم نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

”جاڑے کی رات لمبی ہوتی ہے۔ ہمارے پاس سونے کے لئے بستر اور لحاف نہیں ہے۔ کیوں نہ ہم باتیں کرتے ہوئے رات گزار دیں؟“

”ہاں.........!“ رب نواز نے گوشت چبا کر ہڈی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ”باتیں ضرور کرنا چاہئے۔ باتوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔“

”اچھا تو پھر آپ پہلے بتائیے کہ آپ کس سے خوفزدہ ہیں؟“ ہاشم نے بھی ایک ہڈی سے گوشت اچھی طرح نوچ کر کھانے کے بعد اسے رب نواز کی پھینکی ہوئی ہڈی کے پاس رکھ دیا۔

وہ محض ہڈیاں تھیں اور وہ نہیں جانتے تھے کہ میز پر ہڈیوں کے جمع ہو جانے سے کیسی قیامت آ سکتی ہے۔ پیش آنے والے خطرات کی وجوہات سے کوئی باخبر نہیں رہتا۔ وہ بے چارے بھنا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ رب نواز نے ہڈیوں پر ایک اور ہڈی رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جس سے خوفزدہ ہوں، اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہ کوئی کرائے کا قاتل ہے لیکن ریشمی کی باتیں یاد آتی ہیں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہ اسی چڑیل کی اولاد ہے۔“

”ریشمی کون ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”وہ ایک چمارن تھی۔ ہماری بستی میں رمضو چمار اسے بیاہ کر لایا تھا۔ چماروں میں جانے کہاں سے اتنا حسن آ جاتا ہے۔ ان کی عورتیں یا تو بالکل کالی کلوٹی ہوتی ہیں یا پھر ایسی

گوری چٹی اور چکنی ہوتی ہیں جیسے خالص دودھ کی بالائی کو گوندھ کر بنائی گئی ہوں۔ ریشمی بھی ایسی ہی تھی کہ اسے آنکھیں دیکھتی تھیں اور دل پھسلتا تھا۔ جب وہ بستی کی گلیوں سے لچکتی، بل کھاتی گزرتی تو اس کے بھرے بھرے بدن کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ ایسی مستانہ چال تھی کہ نہ دیکھنے والے بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ میں بھی دیکھتے دیکھتے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

پہلے پہل میں اسے راستے اور گلیوں میں اپنی نگاہوں سے گرفتار کرتا رہا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ میری حوصلہ افزائی کرنے لگی۔ کبھی وہ مسکراتی اور کبھی قاتلانہ انداز میں دیدے مٹکا کر سامنے سے گزر جاتی تھی۔ رمضو چمار ڈیڑھ پسلی کا آدمی تھا۔ ریشمی کی طرار جوانی کو لگام نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لئے وہ لاسے پر چڑھ گئی تھی۔

اس کی خاطر میں رمضو چمار سے دوستی بڑھانے لگا۔ پہلے میں ایک گاہک کی حیثیت سے اپنے لئے نئے جوتے بنوانے گیا۔ اس نے ایک ہفتے کا وقت مانگا کیونکہ اس کے پاس کام زیادہ تھا۔ میری طرح کتنے ہی منچلوں نے نئے جوتوں کے آرڈر دے رکھے تھے۔ اس کی آمدنی بڑھ گئی تھی اور دل والوں کو دیدار کا بہانہ مل گیا تھا۔

ایک انار اور سو بیمار والی بات تھی لیکن ریشمی کی لاٹری میرے ہی نام نکلی۔ وہ مجھ پر مہربان تھی۔ رمضو چمار بھی میری بڑی آؤ بھگت کرتا تھا۔ میں اس کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اس کی جھونپڑی میں کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا۔ وہ جوتے گانٹھنے میں مصروف رہتا۔ ریشمی ہزار بہانوں سے وہاں آتی جاتی رہتی اور میں آنکھیں سینکتا رہتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ رمضو چمڑا خریدنے یا جوتے بیچنے کے لئے بازار چلا جاتا۔ ایسے وقت میں جھونپڑی میں پہنچ جاتا تھا۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ چمار کی ہانڈی میں کھاؤ تو ہم شریف لوگ کبھی اس ہانڈی کو منہ نہیں لگاتے لیکن ریشمی منہ لگ گئی تھی۔ تنہائی سے فائدہ اٹھا کر میں نے کئی بار اسے آغوش میں لے کر چوم لیا۔ یہ وہ آگ تھی کہ بوسے ہوا دیتے تھے اور آتشِ شوق بھڑکتی جاتی تھی۔ ایک دن اس نے رات کو ملنے کا وعدہ کیا۔

”آج رات بارہ بجے......... قبرستان کے پیچھے.........“ گلے لگتے وقت اس کی سرگوشیاں میرے کانوں میں سرسرائیں۔ ایک حسینہ سے جہنم میں بھی ملاقات کی جا سکتی ہے اس لئے کہ وہاں تک جذبات لے جاتے ہیں۔ میں نے جذبات کی رو میں یہ نہیں سوچا کہ بعض عورتیں بڑے پیار سے ہمیں ہماری قبر تک لے جاتی ہیں۔ یوں بھی ہمارے

ملنے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ نہیں تھی۔ جھونپڑی میں رمضو چمار سوتا تھا۔ میرا گھر وہاں سے بہت دور تھا اور اس کی بہ نسبت قبرستان جھونپڑی کے قریب تھا۔

وہ نوچندی جمعرات تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور......... اور آج بھی تو جمعرات ہے؟"

رب نواز کے سوال نے ہاشم کو ذرا پریشان کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر زبان کو تر سے گیلی کرنے کے بعد بولا۔

"ہاں آج نئے چاند کی پہلی جمعرات ہے۔ میری زندگی میں اس رات کی بڑی اہمیت ہے۔ کیا آپ کی داستان میں بھی اس کی اہمیت ہے؟"

"ہاں.........!" رب نواز نے جواب دیا۔ "جب میں قبرستان کے پیچھے پہنچا تو رات آدھی تھی اور آسمان پر چاند آدھا تھا۔ میرے اندر آدھی دلیری تھی اور آدمی بزدلی تھی۔ اتنی رات کو میں اپنے باپ کی قبر پر بھی کبھی فاتحہ پڑھنے نہیں جاتا لیکن ایک حسینہ فاتح بننے کی ہوس میں چلا آیا تھا۔

وہ مقررہ وقت پر آئی۔ وہ عام طور پر گھاگھرا اور چولی پہنتی تھی لیکن اس وقت میکسی کی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ دونوں بازو اور شانے اور سینے کی بلندیوں کا اوپری نصف حصہ عریاں تھا۔ بدن کی اُجلی اُجلی چکناہٹ چاندنی کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ بے سے ٹخنوں تک ریشم کی باریک میکسی تھی جس کے پیچھے سے بدن کی رنگت پھوٹ رہی تھی۔ کلائیوں میں کنگن۔ دونوں بازوؤں پر سونے کے بازو بند اور گلے میں ننھی ننھی ہڈیوں کی ایک مالا تھی۔"

ہاشم علی نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہڈی کو ہڈیوں کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ وہ جانتا تھا اب رب نواز آگے کیا کہے گا۔ وہ کہے گا کہ اس حسینہ کی دائیں ہتھیلی پر ایک مردہ انسان کی استخوانی کھوپڑی تھی۔ بہت سی کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا انجام پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے اور ہاشم علی اس کہانی کے کچھ حصوں سے بنفس نفیس گزر چکا تھا۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا ریشمی خالی ہاتھ تھی؟"

"نہیں۔" رب نواز ہڈی سے گوشت نوچنے لگا۔ اس کے دانت مصروف تھے۔ صرف نہیں کہہ کر رہ گیا۔

"پھر تو اس کی ہتھیلی پر کچھ ہوگا؟"

"ہاں!" اس نے ہڈی چھینکتے ہوئے کہا۔ "اس کے دائیں ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ

ہاشم ایک گہری سانس لے کر پھر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ رب نواز نے اپنی داستان جاری رکھی۔

"اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس کا سنگھار بدلا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور پرکشش ہوگئی تھی۔ میں نے بازو پھیلا دیئے تا کہ وہ میری آغوش میں آجائے لیکن وہ دور ہی دور سے مسکرانے لگی، ذرا لہرانے لگی۔ ریشم کی میکسی بھی ہوا کی زد پر لہرا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اب وہ آہستہ آہستہ تھرک رہی تھی۔ رقص کے انداز میں اس کے پاؤں اٹھ رہے تھے۔ کھلی ہوئی ہتھیلی پر پھولوں کا گلدستہ یوں رکھا ہوا تھا جیسے وہ پوجا کے لئے ہتھیلی پر دیپک کا تھال سجائے میری آرتی اتار رہی ہو۔

میں گم صم کھڑا رہ گیا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ وہ والہانہ انداز میں جھوم جھوم کر ناچ رہی تھی۔ کتنے ہی زاویوں سے انگ انگ کی نمائش کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رقص کے پس منظر میں کہیں ساز بج رہے ہیں۔ درختوں کی پتیاں گنگنا رہی ہیں۔ شاخوں سے شاخیں ٹکرا کر تال دے رہی ہیں اور ٹوٹی ہوئی قبروں سے گزرنے والی ہوائیں سیٹیاں بجا کر ہذیانی انداز میں چیخ رہی ہیں۔

پھر وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ میری جانب پشت کر کے تھرکتی ہوئی دو زانو ہوگئی۔ اس نے پیچھے کی جانب خم کھا کر بایاں ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ دایاں ہاتھ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلی پر بدستور گلدستہ موجود تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا پشت کی جانب خم کھانے کے باعث سینہ تن گیا تھا۔ بلندیاں غضب ناک ہوگئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب تب میں انگیا کا بند ٹوٹ جائے گا......... ویسے میرے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ میں نے جھک کر اس حسین مکھڑے کو ہاتھوں میں لیا اور اپنے ہونٹ اس کے دہکتے ہوئے لبوں پر رکھ دیئے۔

اسی وقت دھپ سے کوئی چیز گری۔ میں نے بوسے کے دوران کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کی ہتھیلی خالی تھی اور نیچے زمین پر ایک انسانی کھوپڑی اس طرح لڑھک کر نشیب میں جا رہی تھی جیسے ابھی ہتھیلی سے گری ہو، لیکن ہتھیلی پر تو گلدستہ تھا۔ شاید

گلدستہ بکھر گیا تھا۔ پھول ہوا سے بکھر گئے تھے۔ مجھے زیادہ سوچنے کی فرصت نہ
حسن و شباب کا ایک گلدستہ میرے بازوؤں میں تھا' جو پھولوں کی طرح ملائم تھا' ا
کی طرح دہک رہا تھا۔ میں ان انگاروں سے کھیلتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن شام کے وقت میں رمضو چمار کی جھونپڑی میں آیا تو وہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے ریشمی کو کسی دکاندار سے جوتوں کے پیسے وصول کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔

"نواز بابو..........! میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری بات کو مذاق نہ سمجھیں تو کہوں؟"

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی بات کو سنجیدگی سے سنوں گا۔ وہ چند لمحوں تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

"یہ جو میری گھر والی ہے ناں.......... یہ ریشمی.......... یہ رات کو مر جاتی ہے۔"

میں حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر اسے یوں دیکھا جیسے میرے سامنے کوئی پاگل بیٹھا ہو۔ اس نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن آپ ذرا صبر سے میری پوری بات سن لیجئے۔ جب میں اسے بیاہ کر لایا تو وہ ایسی نہیں تھی۔ میں نے کئی راتیں اس کے ساتھ گزاریں۔ آج میں آپ سے یہ بات کھل کر کہتا ہوں کہ وہ میرے بس کی نہیں ہے۔ مجھے بری طرح تھکا دیتی ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ میں ہارے ہوئے سپاہی کی طرح منہ چھپا کر سو جاتا ہوں۔

ایک رات وہ مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی اور میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ عورت اپنی مرضی سے طلاق لے کر جائے' تو جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ میں اپنی کمزوری دنیا والوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ مجھے چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ اس گھر میں رہے گی تو میری عزت بنی رہے گی لیکن عورت صرف شہ زور کے بس میں عورت بن کر رہتی ہے' کمزور کے آگے شیرنی بن جاتی ہے۔ اس نے صاف طور سے کہہ

دیا کہ اگر میں نے اسے یہاں رہنے پر مجبور کیا تو وہ کسی کو اپنا یار بنالے گی۔

یہ اور زیادہ بدنامی کی بات تھی۔ نہ تو میں اسے چھوڑ سکتا تھا نہ اس کے برداشت کر سکتا تھا۔ میری مردانگی کا بھرم اسی طرح قائم رہتا کہ وہ مر کر ہی اس نکلتی۔ پہلے تو غصہ کی حالت میں سوچا کہ اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں لیکن وہ تگڑی ہے۔ مجھے ہی پچھاڑ دیتی۔ آخر میں نے سب سے آسان راستہ اختیار کیا۔ وہ بخار میں مبتلا تھی۔ میں نے دوا کے بہانے اسے زہر پلا دیا۔ زہر پیتے ہی وہ ہمیشہ ٹھنڈی ہو گئی۔

مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ میں زہر دینے کے الزام میں پکڑا جاؤں گا کیونکہ دوا ڈاکٹر نے دی تھی۔ میں نے اس میں زہر کے چند قطرے ٹپکائے تھے۔ پولیس والے تو میں صاف مکر جاتا۔ بھلا مجھ جیسا محبت کرنے والا شوہر اپنی حسین بیوی کو زہر دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا غلط تھی لہٰذا ڈاکٹر پر الزام آتا۔

میں بہت دیر تک ریشمی کی لاش کے قریب بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر تھانے پر رپورٹ دینے کے خیال سے اٹھ گیا۔ دیکھئے نواز بابو' ریشمی کی لاش اس کمرے میں تھی۔ میں وہاں سے چلتا ہوا اس کمرے میں آیا۔ پھر باہر جانے کے لئے میں نے یہ دروازہ کھولا تو خوف سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ باہر برآمدے میں ریشمی کھڑی ہوئی تھی گھور کر دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کر دیا۔ میرا سارا بدن خوف سے کانپ رہا تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد میں نے خود کو سنبھالا چونکہ دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس لئے دماغ نے کہا وہ محض وہم تھا' ریشمی تو مری پڑی ہے۔ وہ بھلا برآمدے میں کیسے پہنچ جائے گی؟

میں اپنے اطمینان کے لئے اس کمرے میں گیا تو اس کی لاش جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا' دروازہ بند تھا لیکن اسے کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا آنگن میں گیا۔ مجھے کسی طرح تھانے تک پہنچنا تھا۔ اس لئے میں نے نکلنے کے لئے پچھلا دروازہ کھولا تو مارے دہشت کے میری گھگی بندھ گئی...... وہ دروازے کے باہر میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔

میں اس کی گھورتی ہوئی نظروں سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہاں سے پلٹ کر بھاگتا ہوا پھر اس کے کمرے میں آیا۔ ریشمی کی لاش اسی طرح کھاٹ پر پڑی ہوئی تھی وہ مردہ تھی اور زندہ بھی تھی۔ میں حیات اور موت کے درمیان گھبرایا گھبرایا سا اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ نہ باہر نکل سکتا تھا نہ گھر میں سکون سے بیٹھ سکتا تھا۔ چیخنے چلانے کا خیال آیا کہ محلے والوں کو مدد کے لئے پکاروں لیکن دل میں یہ خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ چیختے ہی وہ میرا گلا دبوچ لے گی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں یہاں اس کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے یہ دروازہ بھی نظر آرہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی لاش بھی نظر آرہی تھی۔ صرف آنگن کا پچھلا دروازہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں وہاں جاکر اسے بند کر دیتا۔

میں ساری رات اسی طرح بیٹھا رہا۔ جب صبح کی ہلکی ہلکی سی روشنی جھلکنے لگی تو وہ آنگن کے کھلے ہوئے دروازے سے اس کمرے میں آگئی۔ اس نے کھاٹ کے پاس آکر اپنی لاش کو دیکھا۔ پھر وہ کھاٹ پر اس طرح لیٹ گئی کہ ایک روح کی مانند اس لاش کے اندر سما گئی۔ دوسرے ہی لمحے مردہ ریشمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دوبارہ زندہ ہوتے ہی وہ مجھے گھورنے لگی اور کھاٹ سے اتر کر آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی۔ میں خوف سے لرزتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ فرار کے تمام راستے روک کر کھڑی ہو جاتی ہے' اس لئے وہاں سے بھاگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ میرے قریب آئی اور میری گردن دبوچ کر دانت پیستی ہوئی بولی۔

"تم نے مجھے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ میں مر چکی ہوں مگر زہریلی ڈائن بن کر ہمیشہ تمہاری گردن پر سوار رہوں گی۔ اگر تم نے کسی سے یہ کہا کہ میں عورت نہیں ڈائن ہوں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔"

"نن.......... نہیں..........!" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ تم جو کہو گی' میں وہی کروں گا۔"

"میں جو کروں گی' اسے تم خاموشی سے دیکھو گے اور گونگے تماشائی بن کر رہو گے۔"

"ہاں۔ مجھے منظور ہے۔ میری گردن چھوڑ دو۔"

اس نے میری گردن چھوڑ دی اور آنگن کا دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ اس دن سے

یہ ڈائن میرے پاس ہے۔ دن کے وقت دوسروں کے سامنے یہ بڑی فرمانبردار بیوی بن کر رہتی ہے۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرتی ہے۔ ابھی میں نے آپ کے سامنے اسے بازار کے دکاندار سے پیسے وصول کرکے لانے کے لئے کہا تو وہ چپ چاپ چلی گئی لیکن تنہائی میں مجھ سے نفرت کرتی ہے' مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ پھر رات ہوتے ہی وہ بستر پر جاکر لیٹ جاتی ہے اور لیٹتے ہی صبح تک کے لئے مرجاتی ہے۔"

یہ کہہ کر رمضو چمار ذرا دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس نے اب تک جو کچھ کہا میں اسے بکواس سمجھ رہا تھا۔ اس کی رام کہانی کے مطابق ریشمی زندہ نہیں تھی' مرنے کے بعد چڑیل بن گئی تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی بات کا یقین کرلیتا لیکن میں پچھلی رات اس حسینہ کے ساتھ گزار چکا تھا۔ اس کے ریشمی بدن کے ایک ایک حصے کو چھونے اور چومنے کے بعد یہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ چڑیل اتنی حسین اور دل نشین ہوسکتی ہے۔ وہ بکواس کر رہا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ شاید اسے میرے اور ریشمی کے ناجائز تعلقات کا علم ہوگیا ہے۔ چونکہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھا' غریب تھا۔ مجھے للکار نہیں سکتا تھا اس لئے ایسی بیگانہ من گھڑت کہانی سنا رہا تھا کہ میں اس حسینہ کو چڑیل سمجھ کر خوفزدہ ہوجاؤں اور اس کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے اس کی حماقت پر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا چڑیل بن کر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتی ہے؟"

"نہیں......... ابھی تو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی ہے لیکن مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ اکثر آدھی رات کو قبرستان کے پچھواڑے جاتی ہے اور وہاں ایک کاٹھ کے پتلے سے منہ کالا کرتی ہے۔"

"کاٹھ کا پتلا.........؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا کاٹھ کے پتلے میں جان ہوتی ہے؟ پھر تم کچھ بھول رہے ہو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ راتوں کو مرجاتی ہے۔ پھر وہ رات کے وقت قبرستان کی طرف کیسے جاتی ہے؟"

"میں نے غلط نہیں کہا ہے۔ وہ راتوں کو مرجاتی ہے۔ تمام رات اس کی لاش اس کمرے میں پڑی رہتی ہے چند راتیں اس لاش کے ساتھ گزارنے کے بعد میرے دل کی دہشت کچھ کم ہوگئی تھی لیکن میں سکون سے سو نہیں سکتا تھا۔ ایک رات میں پریشان

ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ سوچا کہ دینو چمار کے ہاں جاکر سوجاؤں گا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے جب میں قبرستان کے پیچھے سے گزرنے لگا تو وہاں ریشمی کو دیکھ کر پھر مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میں نے سمجھا کہ وہ پھر میرا راستہ روکنے آگئی ہے لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی انجان بن گئی تھی۔ اس وقت وہ انگریزی عورتوں جیسا لباس گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کی دائیں ہتھیلی پر کسی مردہ انسان کی کھوپڑی تھی اور وہ کاٹھ کے ایک پتلے کے سامنے رقص کے انداز میں لہرا رہی تھی۔"

رمضو چمار کی یہ بات سن کر میرا یقین ڈگمگانے لگا۔ مجھے وہ انسانی کھوپڑی یاد آگئی جو نشیب میں لڑھکتی جارہی تھی لیکن میں نے تو اس کی دائیں ہتھیلی پر پھولوں کا گلدستہ دیکھا تھا۔ پھولوں بھرے گلدستے اور مردہ انسان کی کھوپڑی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں رمضو چمار کا یہ بیان سن کر الجھ گیا کیونکہ وہ ریشمی کے رقص کرنے کا جو انداز پیش کر رہا تھا وہ میری چشم تصور میں واضح ہوتا جارہا تھا۔ میں کاٹھ کے پتلے کی طرح بے حس وحرکت کھڑا تھا اور ریشمی رقص کے ذریعے مجھے لبھانے کے انداز اختیار کررہی تھی۔

پھر رمضو کے بیان کے مطابق وہ پتلا اس پر جھک گیا تھا (جیسا کہ میں اس پر جھک کر اسے چوم رہا تھا) اس کے بعد وہ قبرستان کی ویرانی میں ریشمی کے ساتھ گناہ کی تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔

وہ جو کچھ بیان کررہا تھا میں اس رنگین اور سنگین واقعہ سے گزر چکا تھا اور اب میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک میں ایک کاٹھ کے پتلے کی طرح بے حس وحرکت کھڑا ہوا تھا۔

میرے جسم میں اندر ہی اندر جھرجھری سی پیدا ہوئی میں اس وقت فیصلہ نہ کرسکا کہ واقعی میں بے جان پتلا بن کر رہ گیا تھا یا نہیں اور میں نے واقعی اس کھوپڑی کو لڑھکتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں؟ میں تذبذب میں رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا اس کاٹھ کے پتلے کی کوئی شکل و صورت تھی؟"

"ہاں اس کی شکل و صورت تھی۔" رمضو نے جواب دیا۔ "پچھلی کئی راتوں تک میں اس پتلے میں ایک اجنبی نوجوان کی صورت دیکھتا رہا۔ جب اس کا شیطانی ناچ مکمل ہوجاتا ہے اور جب وہ اس کے قریب آجاتی ہے تو اس پتلے میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ پتلا اس اجنبی نوجوان کے روپ میں مکمل ہو کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور مردہ

کھوپڑی اس کی ہتھیلی سے لڑھک کر زمین پر آجاتی ہے۔"

سب کچھ وہی تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میرے تجربے کے عین مطابق کہہ رہا تھا
اس نے مجھے کچھ اور زیادہ چونکا دیا۔

"نواز بابو! اب جو بات میں کہنے جا رہا ہوں شاید اس پر آپ یقین نہ کریں لیکن
رات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کل رات کاٹھ کے پتلے میں اس اجنبی نوجوان
صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ صورت بدل گئی تھی اور وہاں آپ کی شکل نظر آ
تھی۔"

میں چونک کر رمضو چمار کو دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ کاٹھ کا پتلا آپ کی صورت اور
کی جسامت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ آپ یقین کریں کہ کل رات سے پہلے وہ جس
نوجوان کے ساتھ گناہ کا شیطانی کھیل کھیلتی تھی' اس سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس
کل رات اس نے اپنے شیطانی عمل سے آپ کو وہاں بلایا تھا۔ پتہ نہیں آپ کو اس بات
کا علم ہے یا نہیں لیکن میں نے کل رات ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ آپ کو ساری باتیں بتادوں
گا۔ آپ شریف آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اس کے فریب میں آکر
ہوجائیں۔"

اس کی باتیں سن کر میں عجیب الجھن میں گرفتار ہوگیا۔ اس کی بہت سی باتیں
صداقت پر مبنی تھیں اور میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن اس سے پہلے
میں ان پر سنجیدگی سے غور کرتا ریشمی وہاں آگئی۔ وہ دروازے پر کھڑی رمضو چمار کو گھور
کر دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کا خاوند اس کے متعلق الٹی سیدھی
باتیں کر رہا ہے۔ اس وقت میں اس کی گھورتی آنکھوں پر توجہ نہ دے سکا کیونکہ گھاگھرے
اور چولی میں کسا ہوا بدن میری نگاہوں کو پکار رہا تھا اور پچھلی رات کے جذباتی لمحات
زندہ کر رہا تھا۔

وہ خاموشی سے رمضو کے پاس آئی۔ دس دس کے چند نوٹ اس کے سامنے رکھے
اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ روپے وہ دکاندار سے وصول کرکے لائی تھی۔
کے جانے کے بعد رمضو نے دبی زبان سے کہا۔

"نواز بابو.........! جو کچھ مجھے کہنا تھا' وہ میں کہہ چکا۔ اگر آپ خود قبرستان

پچھواڑے جاتے ہیں تو آئندہ اس سے پرہیز کریں۔ اگر وہ شیطانی عمل سے آپ کو بلاتی
ہے تو آپ فوراً کسی عامل سے رجوع کریں۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی باتوں پر غور کروں گا۔ وہاں آدھ گھنٹے تک
بیٹھے رہنے کے دوران ریشمی دو چار بار میرے سامنے آئی۔ اس نے رمضو کی نظریں بچا کر
دیدے مٹکاتے ہوئے اشارے سے کہا کہ آج رات ہم پھر اس جگہ پر ملیں گے۔ اگرچہ
رمضو کی باتوں نے مجھے متاثر کیا لیکن ایک جوان اور حسین عورت کے اشارے رمضو کی
باتوں سے زیادہ رنگین تھے اور میرے دماغ میں ایک مچلتے ہوئے شباب کی دیکھی اور چکھی
ہوئی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس بار قبرستان جاؤں گا تو محتاط ہوکر ریشمی کی شیطانی اور انسانی
اداؤں کا مطالعہ کروں گا۔ ذاتی تجربات سے گزرے بغیر میں رمضو کی باتوں پر یقین نہیں کرنا
چاہتا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے اطلاع ملی کہ رمضو چمار خون کی
قے کرنے کے بعد مرگیا ہے۔ اس کی اچانک موت سے میرے ذہن کو زبردست جھٹکا
پہنچا۔ ریشمی دوبارہ زندہ ہونے کے بعد اسے وارننگ دے چکی تھی کہ اگر تم نے کسی سے
کہا کہ میں عورت نہیں ڈائن ہوں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ ریشمی نے گلا گھونٹا ہو
یا کوئی دوسرا عمل کیا ہو' بہرحال اس کے چیلنج کے مطابق رمضو اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے
رخصت ہوگیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے ریشمی کے پیچھے نہیں جانا چاہئے تھا۔ مگر اب میں کیا کہوں؟
ایک شرابی کو شراب کس طرح پکارتی ہے؟ ایک حسینہ اپنے دیوانے کو اپنی طرف کس
طرح کھینچتی ہے؟ میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پچھلی رات
اس نے اپنے جسم کے جو ڈھکے چھپے خزانے مجھے پیش کئے تھے میں ان خزانوں کی جستجو میں
ہر رات اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہا۔

وہ ایک بیوہ کی حیثیت سے رمضو کی جھونپڑی میں زندگی گزار رہی تھی اور رات کو
قبرستان کے پچھواڑے مجھ سے رنگ رلیاں مناتی تھی۔ ایک رات اس نے مجھے بتایا کہ وہ
میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

میں نے کہا۔ "بچہ ضائع کردو۔"

اس نے کہا۔ "کیسے ضائع کردوں؟ کیوں ضائع کردوں؟ رمضو اس قابل نہیں میں اس کے بچے کی ماں بن سکتی۔ اس لئے میں نے تم جیسے خوبرو مرد کا انتخاب کیا میں اس ہونے والے بچے کی ماں ہوں اور تم باپ ہو اور ہم دونوں اس سچائی نہیں کرسکتے۔"

یہ سچ ہے کہ سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بعض حقیقتوں سے چشم پوشی جاتی ہے۔ اگر بیاہتا بیوی سے اولاد ہو تو ہم اسے اپنا خون اور اپنا وارث کہتے ہیں داشتہ کے بطن سے وہی اولاد ہو تو ہم اس کے حقوق سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ بھی ہمارے خون کی ایک بوند سے ہوتا ہے لیکن عزت داری کے لئے ہم ذرا دل کر اس حقیت سے انکار کردیتے ہیں۔

میں نے انکار کیا تو وہ جھلا گئی۔ عورت شریف ہو' بدکار ہو یا چڑیل ہو' برداشت نہیں کرتی کہ باپ اپنی اولاد سے متنفر ہو۔ پہلے تو میں نے اسے سمجھایا کہ باپ بننے کا الزام نہ دے لیکن وہ بضد تھی کہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ میں ہوں تب میں نے بھی اسے جھنجلا کر گالیاں دیں کہ نہ جانے وہ اب تک کتنوں سے کرچکی ہے اور بچے کا باپ مجھے بنا رہی ہے۔ مجھ جیسا شریف آدمی ایک چمار عورت بطن سے جنم لینے والے بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔

جب محبت ہوس اور گناہ کا انجام ایک بچے کی صورت میں سامنے آئے تو پھر کے حسن و شباب کی تمام جاذبیت ختم ہوجاتی ہے اور وہاں سے نفرت و عداوت شروع ہوجاتی ہے۔ ریشمی نے کہا' اگر میں نے اس بچے کا باپ بننے سے انکار کیا تو وہ مجھے بستی میں بدنام کردے گی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے رمضو چمار کی اولاد بتائے اس کے اخراجات پورے کروں گا لیکن وہ صرف اخراجات ہی نہیں بچے کا جائز مانگ رہی تھی اور مجھے دھمکی دے رہی تھی کہ میری شرافت کے اجلے دامن پر اس کا داغ ضرور لگائے گی۔

ایک تجربہ میرے سامنے تھا کہ اس نے رمضو چمار کو دھمکی دی تھی اور اس کے مطابق رمضو کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا تھا۔ اس طرح وہ میری عزت پر کیچڑ اچھال تھی مجھے خطرے کا علم ہوگیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے بالوں کو بائیں ہاتھ کی مٹھی جکڑ لیا۔ میں نے سنا تھا کہ چڑیل کے بال مٹھی میں آجائیں تو وہ اطاعت اور فرمانبردار

مجبور ہوجاتی ہے۔ اگر وہ چڑیل نہیں عورت تھی تو ایسی صورت میں بھی عورت کی چوٹی مرد کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے۔ وہ چوٹی پکڑ کر جدھر چاہے اُدھر عورت کو گھما سکتا ہے۔

میری اس جرأت پر وہ بپھر گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھائے۔ انداز یہی تھا کہ وہ میرا گلا گھونٹنا چاہتی تھی جیسا کہ اس نے کبھی رمضو کو دھمکی دی تھی لیکن میں رمضو کی طرح کمزور اور بزدل نہیں تھا۔ ایسا صحت مند نوجوان تھا کہ اس جیسی دو عورتوں کو دونوں بازوؤں میں لے کر ان کا کچومر بنا دیتا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پرے جھٹک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کی خون اگلتی ہوئی سرخ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ اگر میں مرگئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا۔ تم چوہے کے بل میں بھی گھس کر پناہ لوگے تو وہ وہاں بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا.........."

اتنا کہہ کر رب نواز یک لخت خاموش ہوگیا۔

اس کی خاموشی بے معنی نہیں تھی۔ ہاشم علی کو بھی ایسی آہٹیں سنائی دیں جیسے کوئی انتقام لینے آرہا ہے۔ ویٹنگ روم میں وہ دونوں تنہا تھے۔ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ پھر یہ تیسری آہٹ کیسی؟

وہ دونوں محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ویٹنگ روم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ٹائلٹ کا دروازہ بھی انہوں نے بند کر رکھا تھا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی بتا رہی تھی کہ کسی تیسرے کا وجود نہیں ہے۔ باتیں کرنے اور کھانے کے دوران انہوں نے گوشت کا سالن ختم کردیا۔ اب میز پر ہڈیوں کی مٹھی بھر پہاڑی نظر آرہی تھی۔ انسانی زندگی کا اختتام یہی ہے کہ صرف ہڈیاں رہ جاتی ہیں۔

ان دونوں نے بیک وقت سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ کھپریل کی چھت ہولے ہولے یوں بج رہی تھی جیسے کوئی دبے پاؤں کھپروں سے گزر رہا ہو لیکن وہ وہم بھی ہوسکتا تھا کیونکہ آہٹیں ختم ہوگئی تھیں۔ جب سناٹا چھا جائے تو ہر بات وہم و گمان کے زمرے میں آجاتی ہے۔

رب نواز کا بایاں ہاتھ اب تک کمبل کے اندر تھا یعنی شدید سردی کے باعث وہ کمبل کو لپیٹ کر اندر سے تھامے ہوئے تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کو میز پر ٹیک کر اٹھ گیا اور اس کرسی پر آگیا جہاں وہ پہلے بیٹھا تھا۔ اب وہ دونوں پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے

تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک گول میز تھی جس کا قطر دو گز کے قریب تھا۔
ہاشم علی نے اسٹوو پر چائے کی کیتلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"
"پھر وہ مرگئی.......... میں اسے ٹوٹی ہوئی ایک قبر کے پاس چھوڑ کر آ
عزت رہ گئی۔ اب وہ مجھے بدنام کرنے کے لئے زندہ نہیں تھی۔
"سات ماہ کے بعد ایک صبح بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ قبرستان کے پچھواڑ
ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس ایک نوزائیدہ بچہ پایا گیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی میرے دماغ
ریشمی چیخنے لگی' اگر میں مرگئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا.......... میرا بچہ تم
لے گا۔

وہ دن میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ رات آئی تو کروٹیں بدل بدل کر
دی۔ دوسری صبح معلوم ہوا کہ دینو چمار نے اس بچے کو گود لیا ہے اور اب
پرورش کر رہا ہے۔ جانے کیوں مجھے اس بچے سے عداوت ہوگئی؟ مجھے اس وقت
کا احساس ہوا۔ اس رات گھبراہٹ میں' میں اس کی موت کی تصدیق نہیں کر سکا
ماہ کی حاملہ تھی اور اس کے سات ماہ بعد ٹھیک اسی ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس وہ نوزائیدہ
گیا تھا۔

میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ وقت گزرتا رہا اور بچہ پروان چڑھتا رہا۔ وہ
چمار کی گود سے نکل کر آنگن میں کھیلنے لگا۔ پھر آنگن سے نکل کر محلے کے بچوں کے
کھیل میں شریک ہوگیا۔ مجھے خاص طور سے ایک بات کا علم ہوا کہ جب بھی میں ا
سے گزرتا تھا وہ بچہ اپنے کھیل کو بھول جاتا تھا اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگتا تھا۔
بستی میں اور بھی لوگ موجود تھے مگر وہ انہیں دشمن کی نظروں سے نہیں د
ایک میں ہی تھا کہ جب وہ مجھے دیکھتا تو ریشمی کی گھورتی ہوئی آنکھیں مجھے یاد آجاتی
میں خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ محض میرا وہم ہے ورنہ ایک بچے کو مجھ سے کیا دشمنی
ہے؟ پھر یہ بات دل میں جگہ بناتی کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرے لہو کی ایک بوند ہے
کا دشمن نہیں بن سکتا تھا۔ ایسے وقت ریشمی پھر میرے دماغ میں چیخنے لگتی۔ "اگر
گئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا.........."
اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس بچے کے ذہن میں ریشمی کے انتقام کا
ہوا ہے اور وہ ہاتھ میں خنجر لئے میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"خنجر..........؟" ہاشم نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا وہ خنجر سے آپ پر حملہ کرتا ہے؟"
"ہاں.......... پتہ نہیں اس نے خنجر زنی کہاں سے سیکھ لی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بڑی پھرتی ہے وہ دو خنجروں کو ان کی نوک سے پکڑ کر دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں سے سچا نشانہ لگاتا ہے۔"
رب نواز کی باتیں سن کر ہاشم کے دونوں ہاتھ بے اختیار اس کے اوور کوٹ کی دونوں جیبوں میں گئے۔ ان دونوں جیبوں کی تہہ میں دو چاقو رکھے ہوئے تھے۔
ہاشم علی کی جیبوں میں وہی دو چاقو تھے جن کا ذکر رب نواز کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے رب نواز کی کہانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس وقفے میں ہاشم علی سوچنے لگا۔
میں خنجر زنی کا ماہر ہوں۔ دور دور تک میرا کوئی ثانی نہیں۔ دونوں ہاتھوں سے بیک وقت ایک ہی ٹارگٹ پر خنجروں کو پیوست کر دینے کا کمال صرف مجھے حاصل ہے۔ یہ رب نواز کس دشمن کا ذکر کر رہا ہے؟ اس کی زندگی کے کچھ واقعات میری زندگی کے کچھ واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے خنجر زنی میں جو کمال حاصل ہے' وہی اس کے دشمن کو بھی حاصل ہے۔
مجھے اب ذرا محتاط رہنا چاہئے۔ رب نواز کے علم میں یہ بات نہیں لانی چاہئے کہ میری جیب میں دو عدد چاقو ہیں اور اس کے دشمن کی طرح مجھے بھی خنجر پھینکنے میں کمال حاصل ہے۔ یہ بات اگر اسے معلوم ہوگئی تو یہ مجھے اپنا دشمن سمجھے گا کیونکہ میری طرح یہ بھی اپنے دشمن کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتا..........
ہاشم علی کی سوچ تھم گئی۔ اس نے اسٹوو کو بجھایا اور کیتلی اٹھا کر دو پیالیوں میں چائے انڈیلنے کے بعد ایک پیالی رب نواز کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے پوچھا۔
"کیا وہ بچہ آپ پر حملہ کرتا ہے؟"
"اب وہ بچہ کہاں رہا۔ وہ تو نوجوان ہو چکا ہے لیکن اس نے کبھی مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ وہ کوئی اور ہے جو مجھ پر حملے کرتا ہے چونکہ ہمیشہ رات کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس کا چہرہ واضح نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ میرے لئے ایک اجنبی رہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ڈائن کا بچہ روپ بدل کر آتا ہے۔"
وہ چائے کی چسکی لینے لگا۔ ہاشم نے پوچھا۔
"آپ اس کے حملوں سے کیسے بچتے رہے؟"

"مجھ میں اتنی صلاحیتیں نہیں ہیں کہ میں اس کے حملوں سے بچ سکوں۔ وہ مجھ پر حملہ کرتا ہے اور خود ہی میری جان لینے سے گریز کرتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا جب بھی میرا اور اس کا سامنا ہوتا ہے تو میں مارے دہشت کے ایک بت کی طرح ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے مقابل اپنے دونوں ہاتھوں میں خنجر تولتا ہے اور خنجر پھینکنے سے کہتا ہے.......... "خاموش کھڑے رہو۔ ابھی ایک خنجر تمہارے دائیں کان کے قریب گزرے گا اور دوسرا خنجر تمہارے بائیں کان کے قریب سے گزرے گا۔ اگر تم نے بھی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ پہلا خنجر پھینکتا ہے۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس کا نشانہ کتنا پکا میرے کان کے قریب ہوا کا ہلکا سا جھونکا محسوس ہوتا ہے اور خنجر شائیں سے گزر ہے۔ بائیں ہاتھ سے پھینکا ہوا خنجر بھی اسی طرح میرے دائیں کان کے قریب سے گز ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے۔ "میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا اتنی جلدی نہیں ماروں گا۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ نوچندی جمعرات تمہاری زندگی آخری رات ہے۔ اس وقت تک تم موت کے انتظار میں لمحہ لمحہ جیتے رہو اور مرتے رہو۔"

یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے۔ میرے دائیں بائیں کان کے قریب اپنے نشانے بازی کی دھاک جماتا ہے اور موت کی معین رات کی یاد دلا جاتا ہے۔ میں اکثر کیلنڈر کو گھور گھور کر دیکھتا رہا' مہینے گزرتے گئے' دن گزرتے گئے۔ جمعرات قریب آتی گئی اور ہر دن اور ہر لمحہ میرے دل کی دہشت بڑھتی گئی اور میں اندر سے کھوکھلا ہوتا گیا۔ جب دشمن کے سامنے ہاتھ پاؤں شل ہوجاتے ہوں' وہاں میں کیا کرسکتا ہوں۔ کیسے اپنی حفاظت کرسکتا ہوں؟ حفاظت کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تو میں گھبرا کر سینکڑوں میل دور یہاں چلا آیا ہوں.......... آج نوچندی جمرات ہے ناں..........؟"

"ہاں..........!" ہاشم نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ جمعرات کی رات ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہے۔ میرے دشمن نے بھی میری موت کے لئے یہی رات مقرر کی ہے۔"

"اچھا.......... کیا واقعی..........؟" رب نواز نے حیرانی اور پریشانی سے اسے دیکھا

"لیکن ہم.......... ہم محفوظ ہیں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔" وہ چاروں طرف دیکھنے لگا

ہاشم نے کہا۔ "ہاں دروازہ اندر سے بند ہے۔ ٹائلٹ کا دروازہ بھی بند ہے۔ یہاں اس کمرے میں وہ نہیں آسکے گا۔"

وہ چپ ہوگیا۔ پھر دونوں سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک آدھ جگہ کھپریں بج رہی تھیں۔ آواز ایسی تھی جیسے سردی سے کسی کے دانت کٹکٹا رہے ہوں یا جیسے موت دانت کچکچا رہی ہو۔ وقت اور ماحول کے مطابق آواز کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

پھر وہ آوز مرگئی۔ ہاشم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"شاید کوئی بلی تھی۔ اب نہیں ہے۔ بھاگ گئی ہے۔"

"ہاں۔ بلی ہی تھی۔ ویسے بھی چھت مضبوط ہے۔ شگاف چھوٹا ہے۔ شاید بلی بھی اس شگاف سے نہیں گزر سکے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم بہت زیادہ سہمے ہوئے ہیں اس لئے ہلکی سی آہٹ بھی ہمیں زلزلے کی طرح سنائی دیتی ہے۔ ہمیں ذرا ہمت سے کام لینا چاہئے۔ ہم اسی طرح باتیں کرتے رہیں گے تو یہ رات جلد ہی گزر جائے گی۔ آپ بتائیں آپ کا دشمن کون ہے اور آپ کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟"

ہاشم علی جواب دینے سے پہلے چائے کے چند آخری گھونٹ لینے لگا۔ اس کے بعد اس نے پیالی کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"میری اور آپ کی زندگی کے چند واقعات ایک جیسے ہیں اس لئے میں مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔ میں نے آپ کی طرح کسی چڑیل سے تعلقات نہیں رکھے۔ وہ خود ہی میرے گلے پڑگئی تھی۔ ہوا یوں کہ میری بیوی سائرہ بے حد خوبصورت تھی مگر بانجھ تھی۔ شادی کے چھ سال بعد بھی ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ میرے کتنے ہی رشتے داروں نے مجھے مشورے دیئے کہ میں دوسری شادی کرلوں۔ اگرچہ مجھے اولاد کی بے حد تمنا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری دولت اور جائیداد رشتے داروں میں تقسیم ہو اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی حسین بیوی کے لئے سوکن لاؤں۔ میں سائرہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے یتیم خانے سے ایک بچے کو گود لے لیا۔ یتیم خانے کے رجسٹر میں اس بچے کا نام واجد علی تھا۔ ہم نے اسی نام کے ساتھ اسے قبول کرلیا۔

اس کے ایک ہفتے بعد ہم نے واجد کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازمہ رکھی۔ ملازمہ کا نام رانی تھا اور اس کا رنگ و روپ بھی رانیوں کا سا تھا۔ وہ ہماری حویلی میں آتے ہی

مجھ پر ڈورے ڈالنے لگی۔ کبھی وہ مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی کبھی یونہی مسکرا کر ادائیں دکھاتی تھی لیکن میں اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ وہ لاکھ حسین ہو میری سائرہ کے حسن کے آگے خاک تھی۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ مجھے کھوٹے اور کھرے کی تمیز تھی۔

ایک روز جب کہ سائرہ حویلی میں موجود نہیں تھی' وہ میرے کمرے میں آگئی مجھ سے بے تکلف ہونے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس سے صاف صاف کہہ دیا میں صرف سائرہ کا دیوانہ ہوں۔ اگر مجھے اس سے شدید محبت نہ ہوتی تو میں اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا لیکن میں نے دوسری شادی نہیں کی بلکہ دوسرے کا بچہ گود لے لیا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "پرائی اولاد پھر پرائی ہوتی ہے۔ آپ مجھ سے شادی کرلیں۔ میں آپ کی جائیداد کا وارث پیدا کروں گی یہ بچہ جو یتیم خانے سے لایا گیا ہے' پتہ نہیں کس کا ہے' جائز ہے یا ناجائز ہے۔ یہ آپ کا وارث تو بن سکتا ہے مگر آپ فخر سے اسے اپنا نہیں کہہ سکتے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اپنا خون جو اپنی عورت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اسے سینے سے لگا کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ پرائی اولاد سے نہیں ملتی۔ اپنی اولاد کی کمی مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنی سائرہ کا مقام کسی دوسری عورت کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"انسان کو اس کے نصیب سے زیادہ نہیں ملتا۔ میرے نصیب میں واجد ہے اس لئے واجد مجھے قبول ہے' خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز............"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جان بوجھ کر ایک ناجائز بچے کو سینے سے لگا کر رکھیں گے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو اور یہاں سے چلی جاؤ۔" میں نے اس طرح ڈانٹ کر کہا کہ وہ غصے سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ طنطناتی ہوئی کمرے سے جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔

"جب ایک مرجائے گی تب تو آپ دوسری شادی کریں گے۔ کوئی تمام عمر مرنے والی کا سوگ نہیں مناتا............"

یہ کہتے ہی وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر چلی گئی۔ میں سائرہ کو اتنی شدت سے چاہتا تھا کہ اس کی موت کا تصور بھی میرے لئے روح فرسا تھا اور وہ رانی یاد دلا گئی تھی کہ سائرہ مر بھی سکتی ہے اور اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بہت جلد مرنے والی ہو اور بہت جلد دوسری عورت اس کی جگہ لینے والی ہو۔

اس کے دوسرے دن میں حویلی کے باغیچے میں گیا۔ سائرہ وہاں ایک ایزی چیئر پر بیٹھی اپنے چہرے کے سامنے پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ ایک چینی پنکھا تھا۔ اس سے پہلے میں نے سائرہ کے پاس ایسا پنکھا نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے قریب ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ سائرہ نے پنکھے سے اپنے نصف چہرے کو چھپاتے ہوئے ایک ادائے ناز سے کہا۔

"دیکھئے اس پنکھے پر کتنی خوبصورت تصویر ہے۔"

میں نے دیکھا' پنکھے پر عمر خیام کی تصویر تھی۔ عمر خیام دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک حسینہ رقص کے انداز میں پشت کی جانب خم کھائے ہوئے تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زمین پر تھا۔ دوسرا ہاتھ عمر خیام کی طرف اٹھا ہوا تھا اور اس ہاتھ کی ہتھیلی پر شراب کا جام رکھا ہوا تھا۔

"بہت عمدہ تصویر ہے۔" میں نے تعریف کی۔

سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھئے۔ اس تصویر میں کچھ تبدیلیاں آجائیں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے پنکھے کو ذرا ہلایا۔ پنکھا دائیں سے بائیں گیا تو واقعی تصویر میں دو خاص تبدیلیاں ہوئیں۔ عمر خیام کی جگہ کاٹھ کا پتلا نظر آنے لگا اور حسینہ کی ہتھیلی پر جام شراب کی جگہ ایک مردہ انسان کی کھوپڑی دکھائی دینے لگی............"

"آہ............" رب نواز نے چونک کر ہاشم علی کو دیکھا۔ "ہاشم صاحب! آپ تو بالکل ریشمی کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔"

ہاشم علی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں۔ ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کی زندگی کے چند واقعات کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس وقت اس پنکھے پر ایک انسانی کھوپڑی دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میری سائرہ موت کے بالکل قریب ہے۔ میرے دماغ میں رانی کی یہ بات گونجنے لگی کہ اگر ایک مرجائے تو میں دوسری شادی ضرور کروں گا۔

میں چند لمحات تک اس پنکھے کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ تصویر کا بدل جانا کوئی عجیب بات نہیں تھی' دو مختلف تصویروں کو ایک خاص پیمائش سے کاٹ کر شیشے کے ٹکڑوں پنکھے کی فولڈ نگز پر اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ دیکھنے والے ذرا دائیں بائیں ہو کر دیکھتے ہیں تو تصویر بدل جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا جب ہندوستان تقسیم ہونے والا تھا ان دنوں قائداعظم محمد علی جناحؒ اور لیاقت علی خان کی مشترکہ تصویریں اور گاندھی اور نہرو کی مشترکہ تصویریں اسی انداز میں تراش کر بازاروں میں فروخت کی جاتی تھیں۔"

رب نواز نے اثبات میں سرہلایا۔ "ہاں اس طرح تصویریں بدل جاتی ہیں۔ ہا دشمن بھی کچھ اسی انداز میں اپنا روپ بدلتا ہے۔"

ہاشم علی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں نے وہ چینی پنکھا سائرہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسی کوئی تصویر سائرہ کے قریب رہے جو موت کی یاد دلاتی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ پنکھا تم نے کہاں سے خریدا ہے؟"

"میں نے نہیں خریدا ہے۔" سائرہ نے جواب دیا۔ "رانی کہیں سے لائی ہے۔ کہنے لگی بیگم صاحبہ' پسند ہے تو اسے رکھ لیجئے۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ اس کے پیسے دینے چاہے تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔"

"سائرہ! میں حیران ہوں کہ تمہیں یہ پنکھا کیسے پسند آگیا؟ کیا یہ مردہ کھوپڑی تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

"توبہ ہے۔ مجھے تو یہ کھوپڑی دکھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ میں تو صرف عمر خیام والی تصویر دیکھتی ہوں۔ پنکھے کو بائیں طرف جھلتے وقت نظریں ہٹا لیتی ہوں۔ اس لئے کھوپڑی نظر نہیں آتی۔"

"نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے' کھوپڑی تو اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ دیکھو سائرہ! تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندان ہی میں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا نخواستہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں تو میں خاندان کی کسی لڑکی کو بیاہ لوں۔ اس کے لئے وہ تم پر جادو ٹونے اور عمل بھی کروا سکتے ہیں۔ تمہیں ایسی چیزوں سے محتاط رہنا چاہئے۔"

میری باتیں سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی۔ میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا کہ رانی میرے بچے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا کہ جلد ہی رانی کی یہاں سے چھٹی کر دوں گا۔ میں نے اسی وقت ماچس نکالی۔ ایک تیلی جلائی اور اس پنکھے کو آگ لگا دی۔

پنکھے سے شعلہ بلند ہونے لگا۔ شعلے کے افق پر میں نے دور کھڑی رانی کو دیکھا۔ وہ برآمدے میں تھی اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ پنکھے سے لپٹی ہوئی آگ جب میری انگلیوں تک پہنچنے لگی تو میں نے اسے پرے پھینک دیا۔ وہ غصہ سے طنطناتی ہوئی برآمدے سے نکلی پھر تیزی سے چلتی ہوئی حویلی سے باہر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ملازمہ کی حیثیت سے واپس نہیں آئی۔

اس کے دوسرے یا تیسرے دن سائرہ کو تیز بخار چڑھا۔ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے جسم میں سوئیاں چبھتی رہتی ہیں۔ میں نے حکیموں اور ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا۔ روز بروز اس کی تکلیف اور بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا بھی سہارا لیا۔ اس طرح سائرہ کو وقتی طور پر سکون مل جاتا تھا لیکن پھر وہی نادیدہ سوئیاں اس طرح چبھنے لگتی تھیں جیسے زہریلی چیونٹیاں کاٹ رہی ہوں۔ اب میں تفصیل کیا بیان کروں' میں اپنی رفیق حیات کو موت کے منہ سے نہ بچا سکا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

چند روز تک میں اس کی موت کا سوگ مناتا رہا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں رہ رہ کر رانی کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ میں تو اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا تھا لیکن نہ جانے کیسے میری مرضی کے خلاف وہ میرے خیالوں میں چلی آتی تھی۔ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی سائرہ کو بھول کر کسی دوسری عورت کے تصور میں کھو جاؤں مگر یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ مجھے اپنی سوچ پر قابو نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں جھلا کر جتنا اسے گالیاں دیتا تھا اتنی ہی بے شرمی سے وہ میرے تصور میں چلی آتی تھی۔

آخر میں نے سوچا کہ مجھے ٹھنڈے دماغ سے کام لینا چاہئے۔ اگر وہ تصور میں آتی ہے تو آتی رہے میرا کیا جاتا ہے۔ البتہ سامنے آئے گی تو میں اسے جوتے مار کر بھگاؤں

گا۔ میں ذرا نرم پڑ گیا تو وہ ذرا اور بے باک اور بے شرم ہو گئی۔ اب میرے خیا
میں آکر اپنے لباس کو اِدھر اُدھر سے سرکانے لگی۔ راتوں کو نیند حرام کر دیتے
کتاب پیش کرنے سے پہلے اس کی چند سنسنی خیز جھلکیاں پیش کرنے لگی۔ میرا خیال
کہ آدمی اخلاقی پابندیوں میں رہ کر خواہ کتنا ہی شریف بن جائے لیکن وہ کبھی کبھی
کی سکرین پر خیالوں کی بلیو فلمیں ضرور دیکھتا ہے۔

ایک رات میں نے خواب میں اسے دیکھا۔ جس بات کو خیالوں میں چھوٹ
وہ خوابوں میں بھی چلی آتی ہے۔ وہ بھی چلی آئی اور مجھے اپنی طرف بلانے لگی۔ میرے
قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ میں خیالوں میں اس سے کتراتا تھا مگر خوابوں میں
زدہ سا ہو کر بڑھتا چلا گیا۔ سچ پوچھئے تو وہ رانی کا مکمل چہرہ نہیں تھا۔ رہ رہ کر اس چہرے
پر سائرہ کا چہرہ نمایاں ہو جاتا تھا۔ چینی پنکھے کی طرح زاویہ بدلتے ہی تصویر بدل جاتی
تھی۔ کبھی رانی اور کبھی سائرہ۔ اسی طرح جب وہ ایک بار سائرہ نظر آئی تو میں نے لپک
کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں
سائرہ تبدیل ہو کر رانی نہ بن جائے۔ ایسے وقت یوں بھی چہرہ کون دیکھتا ہے۔ جذبات
کی ہزار آنکھوں کے سامنے بدن کے لاکھوں نظارے انگڑائیاں لیتے ہیں۔ چہرہ دیکھنے کی
فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ سائرہ تھی یا رانی تھی کوئی بھی تھی۔ میں اس کے وجود میں
ڈوب گیا تھا۔ جب جذبات کا نشہ ہرن ہوا تو میرے سائے میں رانی قہقہے لگا رہی تھی۔
میں پریشان ہو کر اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہاں سے بھاگتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آگیا۔
پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پریشان ہو کر چاروں طرف
دیکھنے لگا۔ میرے بستر پر وہ نہیں تھی۔ کمرے میں بھی نہیں تھی۔ کھڑکیاں اور
دروازے اندر سے بند تھے۔ نہ وہ میری خواب گاہ میں آسکتی تھی' نہ میں اس کے پاس
گیا تھا۔ وہ محض ایک خواب تھا۔

اس ایک خواب کو میں نے دوسری رات بھی دیکھا' تیسری رات بھی دیکھا۔ پھر
تقریباً دو ماہ بعد ایک صبح میرے پاس آئی اور فخر سے بولی۔

"میں امید سے ہوں۔ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

میں اس الزام تراشی پر حیران رہ گیا۔ پھر میں نے اسے گالیاں دیں کہ نہ جانے
وہ اب تک کس کے ساتھ گناہ کی زندگی گزارتی آئی ہے اور اب اس حرامی بچے

مجھے بتا رہی ہے۔ اس نے جواباً کہا میں تین راتیں اس کے ساتھ گزار چکا ہوں۔
باپ کے تفصیلی واقعات بتائے میں نے خواب دیکھا تھا' وہ حقیقت بیان کر
اس نے ہر رات تھی۔ یہ کیسی عجیب اور انہونی بات تھی کہ خواب اور حقیقت کے ملاپ سے وہ
رہی میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے............؟ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا
ناممکن ہے۔ وہ میری آڑ لے کر اپنا گناہ چھپانا چاہتی تھی۔ اس طرح اسے دوہرا فائدہ
حاصل ہوتا۔ وہ اپنے بچے کو میری جائیداد کا وارث بنا سکتی تھی۔ اگر میں احمق ہوتا'
لیکن وہ مجھے فریب نہ دے سکی۔ میں نے ملازموں کو بلا کر اسے دھکے دے کر گھر سے
نکلوا دیا۔

اس رات میں نے پھر اسے نیند کی حالت میں دیکھا۔ اب میں اسے خواب نہیں
کہنا چاہتا کیونکہ میرا خیال ہے' شاید میں کسی عمل کے زیر اثر نیند کی حالت میں چلتا پھرتا
تھا۔ اپنے بستر سے اٹھ کر خود ہی خواب گاہ کا دروازہ کھولتا تھا اور باہر جا کر کہیں رانی
سے ملتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سی جگہ ہوتی تھی۔ وہاں سے واپس آکر پھر خواب گاہ کا
دروازہ اندر سے بند کرتا تھا اور اپنے بستر پر پہنچ کر نیند سے چونک جاتا تھا۔ اس وقت
مجھے کچھ دیر پہلے کی تمام باتیں خوب معلوم ہوتی تھیں۔ بہرحال میں نے رانی کو ایک بار
پھر نیند کی حالت میں دیکھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"تم احمق ہو۔ اپنے بچے کو ناجائز کہتے ہو اور یتیم خانے سے لائے ہوئے ایک
ناجائز بچے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھے ہوئے ہو مگر یہ یاد رکھو تمہارا بیٹا صرف یہی ہے جو میری
کوکھ سے جنم لینے والا ہے۔ یہی تمہاری دولت اور جائیداد کا حقدار ہے۔ اگر کسی
دوسرے نے حق جتایا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں نے اسے جواباً کیا کہا' یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید میں کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ اس کے
بعد دو برس گزر گئے' وہ خوابوں اور خیالوں میں نہیں آئی۔ تیسرے برس ایک بچے کو
لے کر اس حویلی میں آئی۔ اس کے دعوے کے مطابق وہ بچہ میرا تھا۔ اس بار میں نے
ملازموں کو بلانے کی بجائے خود ہی اسے پکڑ کر اچھی طرح پیٹا۔ پھر اس کے بالوں سے
پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا حویلی سے باہر لے گیا۔ وہ چیختی رہی' چلاتی رہی۔ پھر اس نے
کہا............ "میں عورت ہوں کمزور ہوں تم سے ہاتھا پائی نہیں کر سکتی۔ مگر یہ بچہ
جوان ہو کر میری توہین کا بدلہ لے گا اور اپنا حق تم سے زبردستی چھین لے گا۔ تم اس کی

حق تلفی کرنا چاہو گے تو یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بچے کا بایاں ہاتھ تھام کر اسے میری نگاہوں کے... کرتے ہوئے کہا۔

"اس ہاتھ کو اچھی طرح پہچان لو۔ ایک دن یہی ہاتھ تمہاری گردن تک... گا............"

میں نے اس بچے کے بائیں ہاتھ کو دیکھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں چھ ا... تھیں۔

"چھ انگلیاں؟" رب نواز نے چونک کر پوچھا۔ پھر کمبل کے اندر اپنے بائیں... کو اچھی طرح چھپانے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ شروع ہی سے کمبل کو اندر سے... رکھنے کے لئے کمبل کے اندر ہی تھا۔ بس وہ چھپانے کی ایک اضطراری حرکت تھی۔

"ہاں، چھ انگلیاں!" ہاشم نے تشریح کی۔ "بعض لوگوں کی چھ انگلیاں ہوتی ہیں... چار انگلیاں تو عام لوگوں کی طرح ہوتی ہیں۔ پانچواں جو انگوٹھا ہوتا ہے، اس انگوٹھے... ایک اور چھوٹا انگوٹھا ہوتا ہے۔ شاید آپ نے بھی کبھی دیکھا ہو گا۔"

رب نواز بھلا کیا دیکھتا............ خود اس کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں یعنی ایک انگوٹھے پر دوسرا انگوٹھا چڑھا ہوا تھا۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا کہ اگر ہاشم کو پتہ چل گیا کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں تو وہ بلا شبہ اسے اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ اب اسے محتاط رہنا چاہئے اور اپنے بائیں ہاتھ کو کمبل سے باہر نہیں نکالنا چاہئے۔

اس نے کمبل کو اپنے اطراف اچھی طرح لپیٹنے کے بعد کہا۔

"جی ہاں میں نے دیکھا ہے بعض لوگوں کی چھ انگلیاں ہوتی ہیں کیا آپ دشمن کو اس کے ڈبل انگوٹھے سے پہچانتے ہیں؟"

"جی ہاں، آپ کی طرح میں نے بھی اپنے دشمن کا چہرہ واضح طور سے نہیں... ہے۔ اس کی چھ انگلیاں دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بچہ جوان ہو چکا ہے اور اپنی ما... ہدایت کے مطابق مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ میں اس سے کمزور نہیں ہوں۔ میں... چاہوں تو ایک ہی وار میں اسے ٹھنڈا کر دوں کیونکہ میری جیب میں ہمیشہ......

ہاشم کہتے کہتے رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اس کی دو...

جیبوں میں دو چاقو ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ایک ہی ٹارگٹ پر خنجر پھینک سکتا ہے۔ یہ سن کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بلاشبہ اسے اپنا دشمن سمجھ لیتا اور وہ تو اتنا خوفزدہ ہے کہ چاقو دیکھتے ہی دہشت سے اس کا دم نکل سکتا تھا۔

لہٰذا ہاشم علی نے فوراً ہی بات بدلتے ہوئے کہا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری جیب میں کوئی ہتھیار نہیں ہوتا پھر بھی میں ایک بہترین باکسر ہوں۔ گھونسے مار مار کر اس کا بھرتہ بنا سکتا ہوں لیکن آپ کی طرح میں بھی اپنے دشمن کے سامنے سحرزدہ سا ہو جاتا ہوں۔ اسے مارنے یا اس کا حملہ روکنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو جنبش بھی نہیں دے سکتا۔ اس کا بایاں ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے۔ میں گم صم کھڑا رہ جاتا ہوں اور وہ میری گردن دبوچ لیتا ہے۔

"اُف! میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی چھ انگلیوں میں کتنی طاقت ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میری گردن کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے لیکن پھر وہ مجھے چھوڑ دیتا ہے۔ مجھے جان سے نہیں مارتا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کے اور میرے حالات ایک جیسے ہیں۔ میرے دشمن نے بھی مجھ سے یہی کہا ہے کہ نوچندی جمعرات میری زندگی کی آخری رات ہے۔"

رب نواز کچھ دہشت سے اور کچھ حیرت سے منہ کھولے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم بھی ذرا دیر کے لئے چپ ہو کر اس کا منہ تک رہا تھا۔

وہ رات دونوں کی زندگی کی آخری رات تھی۔

وہ دونوں زندگی کے آخری اسٹیشن پر آ پہنچے تھے۔

ویٹنگ روم اندر سے بند تھا۔ اب ایسا کوئی راستہ نہیں تھا کہ ان کا دشمن کسی طرح ویٹنگ روم کے اندر داخل ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی اپنی موت کو اس کمرے کے باہر ہی روک دیا تھا۔

اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے کی دوستی کے سہارے موت کا وقت ٹال رہے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہاشم کی دونوں جیبوں میں دو چاقو تھے اور رب نواز کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔

رب نواز نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں کمبل کو اس طرح جکڑ لیا جیسے اپنے خیالی دشمن کا گلا گھونٹ رہا ہو ہاشم کے دونوں ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں چلے گئے۔ اس

نے بھی دونوں چاقوؤں کو مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ دراصل وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اپنے کو احتیاطاً آزمارہے تھے کہ اگر دشمن آجائے تو کہیں وہ ہمیشہ کی طرح سحر زدہ ساکت تو نہیں ہوجائیں گے۔

چند لمحات تک بڑی عجیب سی' بڑی مہیب سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر ہاشم نے عادت کے مطابق تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"جو دشمن محض دھمکیاں دیتا ہو' میں اس سے کبھی خوفزدہ نہ ہوتا لیکن رات جبکہ اس نے میری گردن دبوچ کر میری موت کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس دوسری صبح میرا لے پالک بیٹا واجد اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ کسی نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اب آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ گلا گھونٹنے والا دشمن کون ہوسکتا ہے۔"

رب نواز نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے بائیں ہاتھ کو اچھی طرح چھپایا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح چھپا ہوا تھا۔ ہاشم علی نے کہا۔

"وہ ذلیل دشمن خود کو میری تمام جائیداد کا حقدار کہتا ہے۔ اسی لئے اس نے واجد کو مار ڈالا۔ وہ اپنے راستے کا ایک کانٹا صاف کرچکا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے میں اس کم بخت کو کبھی اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔"

رب نواز نے کہا۔ "لیکن اس طرح اس نے ثابت کردیا ہے کہ اس نے جو آپ کی موت کا وقت مقرر کیا ہے کہ وہ محض دھمکی نہیں ہے جس طرح اس نے آپ کے لے پالک بیٹے کو ہلاک کیا ہے۔ اسی طرح آپ کو بھی ہلاک کرسکتا ہے۔ پھر یہ کہ اس کے لئے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میری طرح آپ بھی اپنے دشمن کے سامنے دست و پا ہوجاتے ہیں۔"

ہاشم نے سہمے ہوئے انداز میں گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں ہم دونوں کے ساتھ یہی مجبوری ہے لیکن یہاں اس کی آمد کا خطرہ نہیں ہے۔"

"ہاں۔ وہ یہاں نہیں آسکے گا۔" دونوں پھر ایک بار محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ پھر ہاشم نے پریشان ہوکر کہا۔

"یہ رات نہیں گزر رہی ہے۔"

"ہاں ہماری باتیں ختم ہوگئیں مگر رات ختم نہیں ہورہی ہے۔"

"نہیں نواز صاحب باتیں ختم ہوں گی تو یہ رات ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جائے گی۔ ہمیں کچھ نہ کچھ بولتے رہنا چاہئے مثلاً ہمیں اپنی زندگی کے اس پہلو پر بحث کرنا چاہئے جسے ہم دونوں جانتے ہیں۔ یعنی ہماری داستان حیات کے مطابق ہمارا جو دشمن ہے' وہ ہمارا بیٹا ہے اور ہم دونوں اسے اپنی اولاد تسلیم نہیں کررہے ہیں اور نہ ہی کبھی کریں گے۔"

"آپ درست کہتے ہیں ہاشم صاحب! ہم ذرا غور کریں تو میری زندگی میں آنے والی ریشمی اور آپ کی زندگی میں آنے والی رانی ایک ہی تصویر کے دو رخ نظر آتے ہیں۔ بالکل چینی پنکھے کی طرح دائیں سے بائیں ہوتے ہی تصویر ذرا بدل جاتی ہے لیکن تصویر کی خاصیت نہیں بدلتی۔ ریشمی نے جو میرے ساتھ کیا وہی رانی نے آپ کے ساتھ کیا۔

اب آپ ہی سوچئے کہ اگر ریشمی کی کوکھ سے جنم لینے والا لڑکا میرا بیٹا ہے تو پھر اس میں میری کوئی خوبی ہونی چاہئے۔ میں خنجر زنی نہیں جانتا۔ پھر یہ خنجر زنی کا کمال اس میں کیسے پیدا ہوگیا؟"

ہاشم نے دونوں جیبوں کے اندر چاقوؤں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

"شاید اس نے کہیں سے یہ کمال سیکھ لیا ہے۔ ایسا ممکن ہے لیکن رانی جسے میرا بیٹا کہتی ہے اسے تو میری طرح ہونا چاہئے مگر اس کا بایاں ہاتھ مجھ سے مختلف ہے میری چھ انگلیاں نہیں ہیں' پھر اس کی چھ انگلیاں کیسے ہوگئیں؟"

رب نواز کی چھ انگلیاں مٹھی کی صورت میں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ باپ صحت مند ہوتا ہے اور بیٹا اپاہج پیدا ہوتا ہے۔ پانچ انگلیوں والے باپ کے ہاں چھ انگلیوں والا بیٹا ہوسکتا ہے لیکن ہم کیوں تسلیم کریں کہ ہماری اولاد ایک چڑیل کی کوکھ سے جنم لے سکتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کس شیطان کا نطفہ ہے۔ لعنت ہے اس پر ہزار بار لعنت ہے۔"

"ہاں نواز صاحب! ہم اسی انداز میں کیوں نہ سوچیں کہ وہ دشمن کسی شیطان کی اولاد ہے اور وہ ہمارے دو مختلف دشمن نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک ہی ہے یعنی کسی دشمن کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں اور اسی دشمن کو خنجر زنی کا کمال بھی حاصل ہے اچھا

یہ بتائیے کیا آپ نے اس خنجر چلانے والے دشمن کے بائیں ہاتھ کو غور سے دیکھا
کیا اس کی چھ انگلیاں نہیں ہیں؟"

"نہیں، میں نے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں خنجر دیکھ کر ایسا دہشت زدہ ہو جاتا تھا کہ خنجروں کے چمکتے ہوئے پھل کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارا دشمن ایک نہیں دو مختلف ہستیاں ہیں۔"

"وہ کیسے.........؟"

"وہ اس طرح کہ پہلے تو ہم یہ یقین کرلیں کہ دشمن ہماری اولاد نہیں اس چڑیل نے اپنی اولاد کو ہماری جائیداد کا وارث بنانے کے لئے چال چلی ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔"

"اب آپ یہ سوچئے کہ وہ چڑیل اپنے کالے علم سے ہمیں سحرزدہ کرتی ہے۔ آپ نے خود یہ کہا ہے کہ آپ نیند کی حالت میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں سحرزدہ ہو کر قبرستان کی جایا کرتا تھا۔ دیکھئے میں بڑی اہم بات کہہ رہا ہوں۔ آپ توجہ سے سنیں۔ وہ ساحرہ ایسے آدمیوں کو سحرزدہ کرتی ہے جن میں سے ایک خنجر زنی کا ماہر ہے اور دوسرا گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جس کی چھ انگلیاں ہیں۔ اب تک ہوتا آیا ہے کہ خنجر زن سحرزدہ ہو کر آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور مجھ پر نشانے کی دھاک جماتا ہے اور چھ انگلیوں والا سحرزدہ ہو کر آپ کے پاس جاتا ہے اور بائیں ہاتھ کے آہنی شکنجے سے دہشت زدہ کرتا ہے۔"

"آں.........؟" ہاشم نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"آ......... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے دشمن دو الگ الگ ہستیاں اور......... اور........."

وہ آگے نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس وقت بڑی سے یہ خیال اس کے دماغ میں آیا۔ میں......... میں ایک سچا نشانے باز ہوں۔ کیا سحرزدہ ہو کر کسی انجانے دشمن کو نشانہ بنانے جاتا ہوں۔ کیا......... کیا میں مقررہ نشانے کے مقابل آ پہنچا ہوں.........؟"

اسی وقت رب نواز نے بھی یہی سوچا۔ "میرے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں

اور میرے بائیں ہاتھ میں واقعی آہنی شکنجے کی سی قوت ہے۔ کیا میں سحرزدہ ہو کر کسی انجانے شخص کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ کہیں یہ وہی انجانا شخص تو نہیں ہے جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے.........."

وہ دونوں ایک دم سے ساکت ہوگئے تھے اور بڑی تیزی سے سوچتے جا رہے تھے۔

ہاشم نے پھر اسی انداز میں سوچا۔ "میں......... میں واقعی سحرزدہ ہوتا جا رہا ہوں شاید وہ چڑیل مجھے اسی رب نواز کے پاس بھیجتی ہے تاکہ میں اسے اپنی نشانہ بازی سے دہشت زدہ کروں اور شاید میں نے ہی سحرزدہ ہو کر اس سے کہا ہے کہ نوچندی جمعرات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میری موت کا وقت مقرر کرنے والا شخص کون ہے؟"

رب نواز نے بھی اسی انداز میں سوچا' کیا میں اس چڑیل کے کالے علم کے اثر سے ہاشم علی کا گلا گھونٹنے جاتا ہوں؟ کیا میں نے ہی سحرزدہ ہو کر اس کی موت کے لئے آج کی رات مقرر کی ہے؟ نن......... نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کیسے بے تکی سی باتیں سوچ رہا ہوں۔ ہاشم میرا دشمن نہیں ہے۔ میں اس کا گلا گھونٹنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔

ہاشم نے بھی دل ہی دل میں کہا۔ "رب نواز میرا دشمن نہیں ہے۔ مجھے فضول باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔ میں نے صرف اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ دونوں جانور رکھے ہیں۔ اگر وہ مقابلہ پر آئے گا تو میں اس سے نن......... نمٹ لوں گا۔ کیا میں خوفزدہ ہوں؟ نن......... نہیں تو......... میں خوف......... خوف زدہ نہیں ہوں........."

اتنے میں لالٹین کی روشنی آپ ہی آپ مدھم پڑنے لگی۔ رب نواز نے کہا۔

"یہ......... یہ لالٹین بجھنے والی ہے۔"

"شاید تیل ختم ہو چکا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ ابھی تو نہ جانے کتنی رات باقی ہے۔"

رب نواز نے کمبل کے اندر سے دونوں ہاتھ نکال کر لالٹین کو اٹھایا اور اسے اپنے کان کے پاس ذرا ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں سچ مچ تیل ختم ہو گیا ہے۔"

اس نے لالٹین کو میز پر رکھ کر اس کی لو بڑھادی۔ تھوڑی دیر کے لئے
بڑھ گئی۔ تیز روشنی میں میز پر پڑا ہوا ہڈیوں کا ڈھیر اور زیادہ واضح ہوگیا۔ پھر
جہاں سے ایک کھپرا اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ وہاں سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں
رہی تھیں۔ وہ سلگتی ہوئی آنکھیں کبھی ہاشم کو دیکھ رہی تھیں، کبھی رب نواز
رہی تھیں اور کبھی ہڈیوں کے ڈھیر کو گھور رہی تھیں۔

"اس لالٹین کو نہیں بجھنا چاہئے۔" ہاشم نے کہا۔ "اس سے پہلے
اسٹیشن ماسٹر کے پاس جاکر اس میں تیل بھروانا چاہئے۔"

"مم......... مگر!" رب نواز نے کہا۔ "باہر جانے کے لئے دروازہ کھولنا
گا۔ اگر وہ......... وہ دروازے کے باہر موجود ہوا تو.........؟"

رب نواز نے مشورہ دیا ہم یہاں سے چیخ کر اسٹیشن ماسٹر یا ڈرائیور یا فائرمین
بلا سکتے ہیں۔ جب وہ دروازے پر آجائیں گے تو ہم دروازہ کھول دیں گے۔"

"نہیں۔" ہاشم نے گھبرا کر کہا۔ "وہ روپ بدلنے والا اسٹیشن ماسٹر کی آواز
کر ہمیں دھوکا دے سکتا ہے۔ نہیں ہم آواز کے فریب میں نہیں آئیں گے۔
دروازہ صبح سے پہلے نہیں کھولیں گے۔"

لالٹین کی لو پھر کم ہونے لگی۔ روشنی گھٹنے لگی۔ دھواں دھواں سا اندھیرا
لگا۔ چھت کے شگاف سے لگی ہوئی آنکھیں اس نیم تاریکی میں ریڈیم ڈائل کی
چمک رہی تھیں۔ ہڈیاں......... ہڈیاں.........

اندھیرا بڑھتا آرہا تھا۔ لالٹین کی لو ڈوبتی جارہی تھی۔ کمرے کے سناٹے میں
سہمے ہوئے انسانوں کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور ہولے ہولے گونج رہی تھیں

"وہ چڑیل کوئی منتر پھونک رہی ہے......... ہے......... ہے
ہے........." آواز بازگشت کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟ یہ بڑھتا ہوا اندھیرا......... را......... را.........
بازگشت آواز۔ تھرتھراہٹ۔

اندھیرا۔ ڈوبتی ہوئی لو۔ آواز کی تھرتھراہٹ۔ اور دروازہ بند۔ فرار کا
مسدود۔ وہ آخری اسٹیشن تک پہنچ گئے تھے۔ زندگی کی گاڑی اس اسٹیشن سے
کبھی نہیں جاتی۔

یک بیک کھڑبڑاہٹ سی ہوئی۔ چھت کی کھپریں زور زور سے بجیں اور لالٹین
کی روشنی بجھنے سے پہلے تیزی سے بھڑکنے لگی۔

مرنے سے پہلے زندگی تڑپتی ہے۔ بجھنے سے پہلے روشنی بھڑکتی ہے۔ ایک
گونجدار آواز کے ساتھ دو کھپریں فرش پر آگریں اور ایک سیاہ سا وجود چھت کی
بلندی سے چھلانگ لگا کر دھم سے میز پر آگیا۔

ان دونوں کے حلق سے فلک شگاف چیخیں نکلیں۔ دونوں کرسیوں سے اچھل کر
کھڑے ہوگئے۔ ایک کے ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں سے نکلے اور کھٹاکے کی آواز کے
ساتھ چاقوؤں کے پھل باہر آگئے۔ دوسرے کے شانوں پر سے کمبل اچھل کر ایک
طرف گرا اور دونوں ہاتھ اپنے بچاؤ کے لئے فضا میں بلند ہوگئے۔

لالٹین کی لو رہ رہ کر بھڑک رہی تھی۔ دونوں چاقوؤں کے پھل جگمگا رہے تھے۔
اور بائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں تھرا رہی تھیں۔

رب نواز بھڑکتی ہوئی روشنی میں دو چمکتے ہوئے چاقو دیکھتے ہی ساکت ہوگیا تھا۔
جیسے سحرزدہ ہوگیا ہو یا مارے دہشت کے ہلکی سی جنبش کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

ہاشم علی نے بھڑکتی اور تھمتی ہوئی روشنی میں چھ انگلیاں دیکھیں۔ انگوٹھے پر
انگوٹھا......... اور حسبِ عادت وہ بھی دشمن کو دیکھ کر ساکت ہوگیا۔

پھر دونوں سانس لینا بھول گئے۔ دہشت سے پھیلے ہوئے دیدے پھیلے رہ گئے۔
چند ساعتوں تک وہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ پھر اپنی اپنی کرسیوں پر دھم سے گر
گئے۔

اس کے بعد لالٹین کی روشنی مر گئی۔

ڈائننگ روم گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس خاموشی اور تاریکی میں کڑکڑ کی
آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے کوئی ہڈیاں چبا رہا ہو۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں کی آخری چیخیں
سن کر اسٹیشن ماسٹر، ڈرائیور اور فائرمین وہاں پہنچ گئے تھے اور دروازے پر ہاتھ مار مار
کر آوازیں دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اندر کی خاموشی نے انہیں سمجھا دیا
کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ تینوں باری باری دھکے مار مار کر دروازے کو توڑنے لگے۔
دروازہ مضبوط تھا۔ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ البتہ چٹخنی جھٹکے کھا کھا کر نیچے آگئی اور

دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھل گئے۔

اسٹیشن ماسٹر کے ہاتھ میں لالٹین روشن تھی۔ اس روشنی میں دو ما
آئے۔ وہ دونوں اپنی اپنی کرسی پر زندگی کا سفر ختم کر چکے تھے۔ میز پر ایک
اسٹوو اور ایک بجھی ہوئی لالٹین رکھی تھی۔ ہڈیوں کے ڈھیر کے پاس ایک سیا
بلا بیٹھا ہوا ایک ہڈی چبانے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے اگلے دونوں پنجوں سے ایک
کو دبوچے ہوئے تھا اور بار بار اس پر منہ مار رہا تھا۔

چاقو کے چمکتے ہوئے پھل کی طرح اس بلے کی آنکھیں چمک رہی تھیں ا
کے اگلے بائیں پنجے کے ایک ناخن پر دوسرا ناخن یوں چڑھا ہوا تھا جیسے اگر
انگوٹھا............

☆------☆------☆

مردہ خط کی واپسی

اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا' اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو اس نے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا......مگر قاتل نے اسے ایسا فریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

طیاروں نے ایسی زبردست بمباری کی تھی کہ وہ ہنستا بولتا شہر ایک دم سے کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔ انسانی بستیاں بار بار اجڑتی ہیں اور بار بار بستی ہیں۔ وہ پہاڑی بستی رفتہ رفتہ پھر آباد ہونے لگی۔ جنرل پوسٹ آفس کی عمارت کا وہ حصہ جہاں مردہ خطوط کا ذخیرہ ہوتا تھا وہاں کی ایک طرف کی دیوار گر پڑی تھی اور تمام خطوط تنکوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ وہ ایسے خطوط تھے جن پر یا تو نامکمل پتے تھے یا وہ ناقابلِ فہم تھے۔ کوشش کے باوجود پڑھے نہیں جاتے تھے یا پھر اپنے پتے پر جاکر اس لئے واپس آگئے تھے کہ انہیں وصول کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے خطوط مردہ کہلاتے ہیں' اس لئے مردہ خطوط ایک الگ دفتر میں رکھے جاتے ہیں۔ بمباری کے بعد وہ مُردہ خط قید خانے سے آزاد ہوگئے۔ یعنی ایک طویل مدت کے بعد اپنی قید سے نکل کر دور تک آزادی سے اڑ رہے تھے۔ انہی میں ایک دو سال پرانا بند لفافہ تھا۔

اس لفافے پر ڈاک خانے کی مہر بتا رہی تھی کہ اس کی موت کو دو سال گزر گئے ہیں۔ اس پر جو پتہ تھا وہ واضح تحریر میں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس شخص تک نہیں پہنچ سکا تھا جس کا نام اس لفافے کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس لفافے کو ایک سمت بہا رہی تھی۔ کبھی کسی جگہ وہ رک جاتا تو درختوں کی شاخیں شور مچا دیتیں اور اپنے پتوں کی ہوا دے کر اسے آگے بڑھا دیتی تھیں۔

بہت دور اڑنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔ لوگ بمباری کے باعث حواس باختہ تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ کٹی ہوئی پتنگ کو دوڑ کر پکڑے۔ بچوں کو اس دنیا کا کوئی المیہ متاثر نہیں کرتا۔ ایک بچہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے وہاں سے گزر رہا تھا' اس نے دوڑ کر اسے پتھر کی آڑ سے اٹھالیا۔ اس کی ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا کر رہے ہو مُنّے.......... جلدی چلو' کہیں پھر دشمن نہ آجائیں۔" وہ مُنّے کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔

"امی! ماموں جان کا خط آیا ہے۔ آپ کہتی تھیں نا کہ خط آنے والا ہے۔"

"تمہارے ماموں جان کا خط کیا راستے میں پڑا رہے گا' چلو پھینک دو اسے.......... یہ تمہارے ہاتھ میں رہے گا تو تم مجھے کاغذ کی ناؤ بنانے کے لئے کہو گے۔"

ماں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ چھین کر راستے میں پھینک دیا۔ پھر بچے کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ لفافہ بھی لوٹ پوٹ کر سڑک پر چلنے لگا۔ تیز ہوائیں اس کے پیچھے پیچھے جیسے چابک مار رہی ہوں' یا ٹھوکروں سے آگے بڑھا رہی ہوں۔ راستے میں اب کوئی بڑا سا پتھر نہیں تھا اس لئے وہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک بوڑھا پاگل اپنی پیٹھ پر ایک بڑی سی گٹھڑی لئے کاغذ چنتا پھر رہا تھا۔ اس نے لفافے کو دور سے آتے دیکھا تو خوشی سے اچھلنے لگا۔

"یہی ہے.......... یہی میرے بیٹے کا خط ہے۔ لوگ کہتے ہیں میرا سپاہی بیٹا لام میں مارا گیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں' بوڑھے باپ کے کلیجے کو چھلنی کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جوان بیٹا ساری عمر کی کمائی ہوتا ہے۔ کیا دشمن کی ایک گولی سے عمر بھر کی کمائی لٹ جاتی ہے؟ نہیں نہیں.......... میرا بیٹا زندہ ہے' اس نے واپس آنے کے لئے خط لکھا ہے' اور وہ آرہا ہے خط.........."

وہ لڑکھڑاتا ہوا لفافے کی طرف بڑھنے لگا۔ لفافہ قریب آرہا تھا۔ پاگل باپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت ہوا بل کھا گئی۔ لفافہ ذرا اِدھر ہو کر بوڑھی گرفت سے کترا گیا۔ پھر رخ بدل کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا بوڑھے نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے اور چیختے ہوئے کہا۔

"میرے بچے رک جاؤ۔ کہاں جارہے ہو میرے لعل.......... کیوں روٹھ گئے بوڑھے باپ سے؟ میرے پاس آؤ.......... آؤ.........."

وہ پچکارتے ہوئے لفافے کے پیچھے بھاگنے لگا۔ لفافے کی رفتار تیز نہیں تھی مگر بوڑھے پاؤں سست رفتار تھے۔ کبھی وہ قریب پہنچ جاتا تھا کبھی لفافہ دور ہو جاتا تھا۔ وہ دونوں بہت دور تک آگے پیچھے بھاگتے رہے۔ آخر بوڑھے نے بڑی ہمت کرکے مختصر سی چھلانگ لگائی اور لفافے پر اوندھے منہ گر پڑا۔

شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ہوائیں بوڑھے پر سے سسکتی ہوئی گزر رہی تھیں اور

وہ اوندھے منہ پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کے نیچے وہ لفافہ موجود تھا۔ ذرا دیر بعد سانسیں درست ہوئیں تو اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ڈاک خانے سے اسے نکالا۔ لفافہ بہت پرانا ہوچکا تھا اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بوڑھے نے اپنے تھیلے میں دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کاغذات سے بھرے ہوئے جھولے کو اس نے پیٹھ پر رکھا۔ پھر دوسرے کاغذات چننے کے لئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

"پتہ نہیں کس کاغذ پر میرے بیٹے نے لکھا ہوگا۔ پیارے ابا جان! میں یہاں خیریت سے ہوں اور خدا کے فضل و کرم سے آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے واپس آرہا ہوں.......... ہاں ہاں میرے بیٹے نے ضرور کسی کاغذ پر لکھا ہوگا۔ میں اس بستی کا ایک کاغذ بھی نہیں چھوڑوں گا' جب تک سانس باقی ہے کاغذ چنتا رہوں گا۔"

وہ کانپتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں سے جگہ جگہ کاغذ چنتا ہوا ایک قبرستان میں پہنچ گیا۔ بستی بھی اجڑ کر قبرستان بنی ہوئی تھی۔ اس بوڑھے کے لئے دونوں ہی جگہیں برابر تھیں۔ وہ قبرستان میں داخل ہوکر سیمنٹ کے اس چبوترے پر آکر بیٹھ گیا جہاں نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ بستی میں بلیک آؤٹ تھا۔ قبرستان میں ہمیشہ بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ وہ پاگل اس اندھیرے میں اپنے بیٹے کا خط پڑھنے آیا تھا۔ پتہ نہیں اس اندھیرے میں نظر آتا بھی تھا یا نہیں۔ مگر وہ کاغذ سے بھرے ہوئے تھیلے کو کھولنے کے بعد ایک ایک کاغذ کو اٹھا کر اس تاریکی میں پڑھ رہا تھا۔

کوئی پورا کاغذ تھا' کوئی آدھا تھا' کوئی آدھے کا آدھا' کوئی اخبار کا تراشا تھا۔ مگر وہ سبھی کو خط سمجھ کر پڑھ رہا تھا اور وہی پڑھ رہا تھا جو اس کا پاگل پن اسے سمجھا رہا تھا۔ ہر کاغذ کو کھولنے پڑھنے کے بعد وہ پھینک دیتا تھا۔

"نہیں یہ میرے بیٹے کا خط نہیں ہے' شاید یہ میرے بیٹے کا خط ہے۔"

اسی طرح وہ دوسرا کاغذ اٹھا لیتا۔ پھینکے ہوئے تمام کاغذ دور دور تک اُڑ رہے تھے۔ اسی وقت تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جھولے کے دوسرے کاغذات ہوا کے اس جھونکے کی زد میں ۔دور تک بکھر گئے۔ بوڑھے نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

"کون ہے یہ.......... کون میرے بیٹے کا خط مجھ سے چھین رہا ہے؟ ارے ظالمو! مرنے کے بعد تو اپنی قبروں میں آرام سے پڑے رہو۔ میں اسی لئے بستی میں خط نہیں

ڈھونڈتا ہوں کہ زندہ انسان چھین لیں گے مگر تم مُردے ہوکر بھی انسانی فطرت کو نہیں بھولے۔ ایک دوسرے سے چھیننے کی عادت نہیں گئی.........."

وہ اڑتے ہوئے کاغذات کو پکڑنے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مگر کاغذات چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ وہ انہیں پکڑنے کے لئے کہاں کہاں جاتا۔ مگر وہ جہاں گیا وہاں ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں اس کا پاؤں دھنس گیا۔ وہ گرتے ہی کراہنے لگا اور اس قبر کے مُردے کو گالیاں دینے لگا۔ وہ لاوارث لفافہ بوڑھے سے بہت دور پہنچ گیا تھا۔ مگر ایک جگہ ٹھہر نہ سکا۔ اِدھر سے اُدھر قبروں کی گھنی گلیوں سے گزرنے لگا۔

کھلی فضا میں ہوا کا مزاج بدل جاتا ہے' وہ مستی میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی ہے۔ نہیں' وہ سیٹیاں نہیں بجاتی' جن قبروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں وہی سیٹیاں بجاتی ہیں۔ قبرستان کی اندھیری گلیوں میں ایک انسان کا آخری مکان ذرا ٹوٹا ہوا تھا۔ قبر کی اس ٹوٹی دیوار سے ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لفافہ نشے میں سرشار جھومتا اور ڈگمگاتا ہوا آیا اور اس ہتھیلی پر آکر ٹھہر گیا۔

شاید وہ اپنے پتے پر پہنچ گیا تھا۔

☆-------☆-------☆

ڈانس کا ایک راؤنڈ ختم ہوتے ہی وہ دونوں ایک میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ڈانس فلور کے اطراف ہر میز پر دھیمی دھیمی سی روشنی تھی اور میز کے چاروں طرف کرسیوں پر دھیمی دھیمی تاریکی تھی۔ نوجوان جوڑوں کے لئے عجیب سا رومانی ماحول تھا میز پر کھانے کی چیزیں نظر آتی تھیں اور کھانے والوں کے چہرے واضح طور سے نظر نہیں آتے تھے۔ پرکاش نے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ریتا کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تم تھک گئی ہو؟"

"میں تھکتا نہیں' تھکانا جانتی ہوں۔ چلو ڈانس کا دوسرا راؤنڈ بھی ہوجائے۔"

پرکاش نے ہوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بھرے بھرے بدن کی اس عورت میں ایسی چستی اور پھرتی تھی کہ واقعی وہ دوسروں کو تھکا ڈالتی ہوگی۔ پرکاش نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ بابا.......... اب ڈانس کرنے جائیں گے تو دل کی بات دل ہی میں رہ جائے گی۔"

ریتا نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہے تمہارے د
بات؟"

"بس تمہاری یہی ادائیں مارڈالتی ہیں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہتی
آخر محسن میں کیا بات ہے کہ تم اس کے پنجرے کی مینا بن گئی ہو؟"

وہ اپنے ہونٹ سکوڑ کر ناگواری سے بولی۔ "اس کا نام نہ لو۔ وہ بار میں بیٹھا
ہے۔ نام لیتے ہی شیطان کی طرح یہاں پہنچ جائے گا۔"

پرکاش نے پھر ایک بار اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ دھندلی سی روشنی میں
تک نظر آرہی تھی' اس کے بعد میز نے اسے چھپالیا تھا۔ مگر جس حد تک نظر آرہی
اس حد سے بہت آگے للچا رہی تھی۔ ڈانس کرنے کے بعد اس کا زرخیز سینہ اب
سانسوں کی ہلچل سے لرز رہا تھا' ہولے ہولے تھرتھرا رہا تھا اور بار بار دیکھنے والی نگاہوں
پکار رہا تھا۔ اس کے جسم اور چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ وہ اونچی سوسائٹی میں "سو
سیکسی" کہلاتی تھی۔ کتنے ہی منچلے اس کی تمنا کرتے تھے۔

"تمہاری تمنا کرنے کے لئے اس شیطان کا نام لینا ضروری ہے۔ تم اس سے اتنا
کیوں ہو۔ کیا اس نے ذرا دھمکا کر تم سے شادی کی تھی۔"

"نہیں......... اس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ ا
وقت اس پر میرا دل آگیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ مسلمان ہے۔
بھی اونچی سوسائٹی میں دھرم ایمان کہاں ہوتا ہے۔ یہاں ڈانس فلور پر کتنے ہی دھرم
عورتیں اور مرد رقص کرتے وقت گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔"

"پھر بھی تمہیں محسن سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"مگر اب تو ہوچکی ہے۔ اگر میں اس سے طلاق لے کر تمہارے پاس آؤں گی
تمہارے کتنے ہی رقیب ہیں جو مجھے بدنام کریں گے کہ میں رقص کے پارٹنر کی طرح
کے پارٹنر بھی بدلتی رہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ خود ہی میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"مگر وہ تو خود تمہارا دیوانہ ہے تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ میں ہی اسے اپنے را
سے ہٹا دوں گا۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔
خطرناک مرد پسند ہیں۔ تم زبانی دعوے نہ کرو' خطرناک بن کر دکھاؤ۔"

"تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ میں آج ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔"

ریتا نے کھانے کی چیزوں سے شغل کرتے ہوئے کہا۔ "سانپ کو اس طرح مارو کہ لاٹھی نہ ٹوٹے۔ اس شہر میں اس کا بڑا نام ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ بہت پُراسرار ہے' میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں کی انٹیلی جنس کا بہت ہی اہم آدمی ہے۔ اکثر کئی دنوں کے لئے مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پوچھنے پر کہتا ہے کہ کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کا کاروبار میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا تم اسے پُراسرار بنا کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ اسے اس شہر سے دور لے جاکر ٹھکانے لگا دو۔ اس سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے پاس آنے کے لئے کتنی بے چین ہوں۔ میں کل محسن کے ساتھ چندرپور کی پہاڑی بستی میں جارہی ہوں۔ پہاڑی علاقے میں اگر اسے کوئی حادثہ پیش آجائے یا وہ ہلاک کر دیا جائے تو ہم دونوں پر کوئی شبہہ نہیں کرے گا۔"

"گڈ آئیڈیا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ کل وہ تمہارے ساتھ جائے گا' پھر واپس نہیں آسکے گا۔"

ریتا نے بار کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس' چپ ہوجاؤ۔ وہ آرہا ہے۔"

پرکاش نے پلٹ کر دیکھا' چھ فٹ کا قد آور جوان نشے کی ترنگ میں ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آرہا تھا۔ پرکاش نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ کر اپنی قوت کا اندازہ کیا۔ وہ محسن سے ڈیل ڈول میں کسی طرح کم نہ تھا۔ اسے ہاتھوں کی قینچی میں پھنسا کر اس کی گردن توڑ سکتا تھا لیکن اس وقت محسن کے قریب آتے ہی وہ اخلاقاً مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ محسن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ریتا سے پوچھا۔

"ہنی ہیو یو انجوائے یور ڈانس؟"

"اوہ شیور۔" وہ چہک کر بولی۔ "پرکاش بہت اچھے ڈانس پارٹنر ہیں۔"

محسن نے پرکاش کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تھینک یو پرکاش! تم نے میری بیوی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ڈارلنگ! اب ہمیں چلنا چاہئے' وی آر گیٹنگ لیٹ۔"

وہ بل ادا کرنے کے بعد پرکاش سے رخصت ہو کر محسن کے ساتھ جانے لگی۔ ہر سے پہلے چور نظروں کا تبادلہ ہوا کہ جو منصوبہ بنایا گیا ہے اس پر پوری طرح عمل کیا جا گا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد پرکاش کلب میں واپس چلا گیا تو محسن نے ریتو کو اپنی طرف کر اس کو دبوچتے ہوئے کہا۔

"لٹ می ہیو اے کس۔"

وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے' کوئی دیکھے کیا کہے گا۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پارکوں میں' گلیوں میں اور کاروں میں یہی ہوتا ہے۔ کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پہلو سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھے..... کوئی بات نہیں' گھر پہنچتے ہی قرضہ چکا دینا۔"

اس نے بڑی درندگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کار اسٹارٹ کی' پھر تیزی سے ڈرا کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ غصے سے کہنے لگی۔

"تم بہت ظالم ہو۔ عورت کو تو پھول کی طرح چھونا چاہئے' یہ نہیں جانتے۔ کیا نے نہیں دیکھا کہ لوگ ڈانس فلور پر مجھے پھول کی طرح نازک سمجھ کر ہاتھ لگاتے ہیں؟"

"وہ سب تمہارے ناکام عاشق ہیں اور میں تمہارا پتی دیو بن گیا ہوں' اور ایک جانتا ہے کہ عورت کو کس طرح چبانا چاہئے۔"

وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ قہقہے کے دوران یوں لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑ زلزلے سے جھٹکے کھا رہا ہو۔ وہ ڈرتی بھی تھی اور پہاڑ کے دامن میں رہتی بھی تھی۔ اپنی کوٹھی میں پہنچ وہ لباس تبدیل کرنے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔ محسن وہسکی کی کیبنٹ کھول کر اپنے لئے ایک جام بنانے لگا۔ وہ لباس بدل کر واپس آئی تو جام خالی ہو چکا تھا۔ اس کی ساری شراب محسن کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

"اِدھر آؤ۔"

"میں نہیں آؤں گی۔"

محسن نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ "اچھا' تو لوگ تمہیں پھول کی طرح چھوتے ہیں' انہیں کیا معلوم کہ تم کس طرح قابو میں آتی ہو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کراہتی ہوئی اور چیختی ہوئی اس

کے بازوؤں میں آئی پھر اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے اسے نوچنے کھسوٹنے لگی۔ محسن نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر کہا۔

"میں نے کار میں تمہیں چومنا چاہا تم نے انکار کیوں کیا؟ کیا آج کل پرکاش پر دل آ گیا ہے؟"

"ہاں۔ آ گیا ہے۔" وہ جھلا کر بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ پر ایک طمانچہ پڑا۔ وہ پھر اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے بلی کی طرح پنجے مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ محسن کا دوسرا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے بعد اس کی شامت آ گئی۔ وہ اس کے بال پکڑ کر کھینچ رہا تھا' اس کے کپڑے پھاڑ رہا تھا' درندے کی طرح غرا غرا کر کبھی مار رہا تھا' کبھی دانتوں سے کاٹ رہا تھا........ آخر تھک ہار کر وہ صوفے پر گر پڑی۔ پھر ہائے ہائے کہتی ہوئی اس طرح کراہنے لگی جیسے ساری خشک حسرتیں سیراب ہو گئی ہوں۔ جب وہ صوفے پر آیا تو وہ بڑے پیار سے اس کے سینے سے لگ گئی۔ محسن نے ایک بار اسے چومنے کے بعد کہا۔

"یہ عاشق نہیں جانتے........ پتی دیو جانتا ہے کہ تم کس طرح قابو میں آتی ہو۔"

☆------☆------☆

پہاڑوں پر برف جم رہی تھی۔ گرمیوں کا موسم گزارنے والے چندر پور کی بستی سے رخصت ہو گئے تھے کیونکہ کبھی کبھی شدید برفباری ہوتی تھی۔ اس وقت بھی دور دور بنے ہوئے مکانات کی دیواریں' کھڑکیاں اور دروازے باہر کی طرف برف سے چھپ گئے تھے۔ ہوائیں تیزی سے سرگوشیاں کرتی ہوئی کانوں کے قریب سے گزر جاتی تھیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ راستے پر اتنی برف جمی ہوئی تھی کہ پاؤں کی ہڈیاں اس میں دھنستی جا رہی تھیں۔ اس کے بدن کی ہڈیوں سے گزرتی ہوائیں کتنے ہی ڈراؤنے سُر سناتی جا رہی تھیں۔

ایک مکان کے اندر آتش دان روشن تھا۔ اس کے قریب ہی بستر پر ایک موٹی سی عورت اپنی دس سالہ بچی کو ایک بھوت کی کہانی سناتے سناتے سو گئی تھی۔ وہ سو گئی تھی مگر بچی جاگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کہانی کا بھوت ناچ رہا تھا۔ اس کی ماں نے کہانی سناتے وقت کہا تھا۔

"شیلا بیٹی! ہمارا عقیدہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں اچھے کرم کرتا ہے تو دوسری بار پھر آدمی بن کر جنم لیتا ہے۔ اگر پاپ کرتا ہے تو

بھوت بن کر اس دنیا میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک آدمی تھا' اس کا نام جیون رام تھا۔ وہ اپنی پتنی کو بہت ستاتا تھا اور اپنی چھوٹی سی بچی کو بہت مارتا تھا۔ اس لئے وہ مرنے کے بعد بھوت بن گیا۔"

شیلا نے معصومیت سے کہا۔ "ممی! مجھ کو پپا بہت مارتے تھے آپ کو بھی بہت رُلاتے تھے۔ کیا وہ مرنے کے بعد بھوت بن گئے ہوں گے۔"

"تم بیچ میں مت بولو۔ چپ چاپ کہانی سنتی رہو۔ ہاں تو وہ جیون رام مرنے کے بعد بھوت بن گیا اور اپنی کرنی پر پچھتانے لگا۔ بھگوان نے اس سے کہا اگر تیری پتنی اور تیری بیٹی تجھے معاف کر دیں گی تو میں تجھے نرک سے نکال کر آدمی کے روپ میں پھر اس دنیا میں بھیج دوں گا۔ تب جیون رام اس دنیا میں آکر اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو تلاش کرنے لگا۔ ماں بیٹی پرانا مکان چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلی گئی تھیں۔ جیون رام بھوت بن کر بھٹک رہا تھا اور گھر گھر جا کر ان کا پتہ پوچھتا تھا لیکن اسے دیکھتے ہی لوگ ڈر جاتے تھے اور پتہ بتانے سے پہلے ہی اپنے گھر کے دروازے بند کر کے چھپ جاتے تھے۔"

"ہائے بیچارہ۔" ننھی شیلا نے ہمدردی سے کہا۔ "وہ بیچارہ اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ لوگ اس کا پتہ کیوں نہیں بتاتے تھے ممی؟"

یہ سوال کرتے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ کہانی سناتے سناتے سو گئی تھی۔ اس نے ماں کو آواز دی۔ پھر جواب نہ پا کر اس ادھوری کہانی کو اپنی کچی عقل سے پوری کرنے لگی۔ مگر وہ جیون رام کا بھوت اپنی بیٹی تک کیسے پہنچے گا' اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آدھی رات گزر چکی تھی' باہر برف کا طوفان تھا۔ ایسے وقت کون آسکتا تھا۔ کیا پپا آگئے؟ نہیں......... جیون رام ہوگا۔ وہ ادھوری کہانی مکمل ہونے کے لئے اس کے دروازے پر آگئی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی بیڈ روم سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دل ڈر رہا تھا مگر خوف سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ تھا کہ بھگوان جیون رام کو معاف کر دے اور وہ انسان کے روپ میں اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائے......... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پپا بھوت بن گئے ہوں اور وہ اس کی ممی سے اور اپنی بیٹی سے معافی مانگنے آئے ہوں۔ وہ معاف کر دے گی اور پھر اس کے پپا آدمی بن کر آ جائیں گے۔ وہ مارتے تھے تو کیا ہوا' ٹافیاں بھی تو لاتے تھے۔ وہ سوچتے سوچتے بیرونی دروازے

تک پہنچ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی باہر سے آواز آئی۔

"کوئی ہے......... ہے ہے ہے........."

پوچھنے والے کے منہ کی ہڈیوں سے ہوا پھسل رہی تھی' اسی لئے "کوئی ہے" کے الفاظ صاف طور سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں "ہے ہے" کی آواز سے ہوا تھرتھرا رہی تھی۔ شیلا نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اوپر چٹخنی لگی ہوئی تھی' اس کے ننھے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے' اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو......... کیا تم میرے پپا ہو؟ دیکھو پپا! میں بہت چھوٹی ہوں' ابھی ایک کرسی لا کر اس پر چڑھوں گی' پھر دروازہ کھولوں گی۔"

باہر سے آواز آئی۔ آواز سرد ہواؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔ "دروازہ نہ کھولو' تمہیں سردی لگ جائے گی۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ تمہارے پپا کا نام کیا ہے؟"

"میرے پپا کا نام مرلی دھر تھا......... تم میرے پپا نہیں ہو تو پھر جیون رام ہو؟"

"میں جیون رام نہیں ہوں۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرا قاتل ہے اور اس کا نام محسن ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔ اس کے اندر جو خط ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ محسن نے مجھے قتل کیا تھا۔ وہ اس مکان کا مالک ہے۔ اس خط میں اسی مکان کا پتہ لکھا ہوا ہے۔"

شیلا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ممی نے مجھے بتایا ہے کہ جب میں آٹھ برس کی تھی تو پپا نے ایک مسلمان سے یہ مکان خریدا تھا۔ تم نے اس کا نام کیا بتایا ہے؟"

"محسن۔" ایک سرد ہوا کے جھونکے نے کہا۔

"ہاں۔ شاید اس مسلمان کا نام محسن ہی تھا۔ ممی کہتی تھیں کہ وہ مکان بیچ کر فیض آباد چلا گیا تھا۔"

"فیض آباد۔" سرد ہوا کے جھونکے بڑبڑانے لگے۔ "میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ ڈھونڈنا اس لئے آسان ہے کہ اس کے ساتھ ایک حسین عورت ہوگی جو لاکھوں میں پہچانی جاتی ہے۔ میں اپنے قاتل کو پہچان لوں گا۔ تمہارا شکریہ بے بی......... جاؤ سو جاؤ' اچھے بچے اتنی رات تک نہیں جاگتے۔"

باہر شدید برفباری میں وہ آواز گم ہوگئی۔ شیلا اسے آوازیں دینے لگی۔ اچانک اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔

"شیلا! تم وہاں کیا کر رہی ہو' کسے آوازیں دے رہی ہو؟"

وہ دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔ پھر حیرت اور مسرت سے بولی۔ "ممی! وہ کہانی والا بھوت آیا تھا۔ مگر وہ جیون رام نہیں تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ کہانی صرف کہانی ہوتی ہے۔ چلو یہاں آکر چپ چاپ سو جاؤ۔"

ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اسے اپنی آغوش میں چھپا لینے کے بعد تھپک تھپک کر سلانے لگی۔

☆------☆------☆

محسن نے چندرپور کے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روکتے ہوئے کہا۔

"ریتا........ ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ بڑے غضب کی سردی ہے۔ اس برفباری میں تم اپنا مکان فروخت کرنے آئی ہو' کمال ہے۔"

کار کی پچھلی سیٹ پر ریتا کا مکان خریدنے والے وہ گاہک بیٹھے تھے۔ وہ بھی اس کے ساتھ کافی پینے کے لئے ریسٹورنٹ میں آگئے۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد مکان خریدنے والے ایک سیٹھ نے ریتا سے کہا۔ "شریمتی جی! میں نے مکان کے کاغذات دیکھ لئے ہیں۔ کاغذات میں کوئی گھپلا نہیں ہے مگر یہ راجندر مہتہ کون ہے' جس نے آپ کے نام مکان لکھا ہے؟"

ریتا نے جواب دینے کے بجائے محسن کی طرف دیکھا' محسن نے جواب دیا۔ "یہ ان کے ذاتی معاملات ہیں۔ جب کاغذات پکے ہیں تو پھر آپ کو کوئی دوسرا سوال نہیں کرنا چاہئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے محسن صاحب۔ مگر ہم ڈرتے ہیں کہ بعد میں راجندر مہتہ آکر مکان کے لئے گھپلا نہ کرے۔"

"وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو مرچکا ہے۔ آپ میری اسٹیٹ ایجنسی کے ذریعے ریتا کا مکان خرید رہے ہیں۔ لہٰذا میں آپ کی تسلی کے لئے بتا دیتا ہوں کہ راجندر' ریتا کا منگیتر تھا۔ اس نے شادی سے پہلے ہی اپنا مکان اس کے نام لکھ دیا تھا۔ مگر موت کبھی پوچھ کر نہیں آتی۔ وہ شادی سے پہلے ہی مرگیا۔ یا یوں سمجھئے کہ تقدیر نے ریتا کو میرے نام لکھ دیا

تھا' اس لئے یہ میری پتنی بن گئی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ پہلے منگیتر کی کوئی نشانی میری پتنی کے پاس رہے' اس لئے ہم اسے فروخت کر رہے ہیں۔"

"میں خود نہیں چاہتی۔ میرے پتی کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ آپ بہت لکی ہیں' بہت سستے داموں میرا مکان خرید رہے ہیں۔"

کافی پینے کے بعد وہ پھر کار میں آکر بیٹھ گئے اور ریتا کے مکان کی طرف جانے لگے۔ پختہ سڑکوں پر سے برف ہٹائی جا رہی تھی۔ وہ دس منٹ کے بعد ہی ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ چوکیدار جلدی سے بیلچہ لاکر دروازے کے سامنے سے برف ہٹانے لگا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک مکان کو اندر سے دیکھتے رہے اور رقم کی ادائیگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہ طے ہوگیا کہ فیض آباد پہنچ کر مکان خریدار کے نام منتقل کر دیا جائے گا۔ محسن نے واپسی میں انہیں بستی کے باہر ٹیکسی کے اڈے پر پہنچا دیا اور ریتا کے ساتھ پھر واپس آنے لگا۔

اس وقت شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں مدغم ہو رہا تھا۔ محسن نے مکان کے سامنے کار روکتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! چلو ذرا برف میں پیدل چلیں۔ میدانی علاقوں میں یہ نظارے کہاں ملتے ہیں' ذرا تفریح رہے گی۔"

وہ کار سے باہر آگئے۔ ریتا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں دور دور تک کیسی ویرانی ہے۔ مجھے ویران علاقوں میں بہت ڈر لگتا ہے۔ اچھا ہے کہ یہ مکان فروخت ہو رہا ہے۔"

محسن نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کس کا ڈر ہے؟ اس برف باری میں کوئی بھوت آئے گا تو وہ بھی سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے گا۔"

"بھوت کا نام نہ لو' مجھے ڈر لگتا ہے۔"

محسن نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے کہ تم بھوت سے ڈرتی ہو۔ کیا یہ نہیں جانتیں کہ انسان تو انسان' شیطان بھی عورت سے پناہ مانگتا ہے؟"

"جی نہیں' یہ سب مردوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں' ورنہ عورت بہت ہی معصوم اور مظلوم ہوتی ہے۔"

"ریتا جانی! تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس دو سال کے عرصے میں تمہارے دو عاشق پرلوک سدھار گئے ہیں' اب تیسرے کی بھی شامت آگئی ہے۔"

ریتا غصہ دکھانے کے لئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس سے الگ ہوگئی۔ "کون تیسرا عاشق؟ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ جھگڑا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"نہیں......... اس برفباری میں لات گھونسے مار کر گراؤں گا تو تم مر ہی جاؤ گی۔ ایسے میں تو صرف بیڈ روم میں ہی جھگڑا کیا جاسکتا ہے۔"

وہ میٹھی ناراضگی سے اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ محسن کی پچھلی درندگی نے اس کی ناراضگی میں مٹھاس پیدا کردی۔ اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ محسن اس کے موڈ کو سمجھ کر قہقہہ لگانے لگا۔ اس کے قہقہے برفانی علاقے میں چاروں طرف گونجنے لگے۔ تھوڑی دور جاکر اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے یہ مکان کبھی میرا تھا میں نے مرلی دھر نامی ایک شخص کے ہاتھ بیچا ہے۔ جب اتنی دور آگئے ہیں تو چلو مرلی دھر کی خیریت معلوم کرلیں۔"

وہ ریتا کا ہاتھ تھام کر چلتا ہوا دروازے پر آگیا اور دستک دینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرلی دھر کی پتنی نے دروازہ کھولا۔ محسن نے کہا۔

"میں مسٹر مرلی دھر سے ملنے آیا ہوں' کیا وہ موجود ہیں؟"

"جی نہیں' ایک سال پہلے ان کا دیہانت ہوگیا ہے' آپ کون ہیں؟"

"میرا نام محسن ہے۔ آپ کے پتی نے مجھ سے یہ مکان خریدا تھا۔ میں یونہی ملنے چلا آیا تھا۔"

اسی وقت کمرے کے اندر سے ننھی شیلا دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "ممی بھوت نے یہی نام بتایا تھا' اس کا نام بھی محسن ہے۔"

محسن نے مسکراتے ہوئے ذرا جھک کر شیلا کو دیکھا۔ پھر اس کی ٹھوڑی کو پکڑتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ "اچھا بے بی کیا تم بھوت سے دوستی کرتی ہو؟"

"میں دوستی نہیں کرتی۔ وہ خود ہی کل رات یہاں آپ کو مارنے آیا تھا۔ آپ نے اس بھوت کو کیوں مار ڈالا تھا؟"

اس کی ممی نے ڈانٹ کر کہا۔ "چپ رہو شیلا! تم بڑوں کے بیچ میں کیوں ٹانگ اڑاتی

ہو۔ اندر جاؤ' یہاں بہت سردی ہے۔" پھر وہ محسن سے بولی۔ "یہ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔ مجھ سے بھی کہہ رہی تھی کہ کل رات یہاں ایک بھوت آیا تھا اور آپ کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک لفافہ تھا' اس پر لکھے ہوئے پتے کے مطابق وہ اس مکان کے پہلے مالک سے ملنے آیا تھا......... بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے؟"

محسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ بے بی کو چڑیل اور بھوت کی کہانیاں سناتی ہیں۔ اسی لئے یہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ اچھا' اب ہم چلتے ہیں۔"

شیلا کی ماں نے دروازہ بند کردیا۔ ریتا نے اپنے مکان کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔ "محسن! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سچ مچ کوئی بھوت آیا ہو۔ مجھے پتہ ہے تم پولیس والوں کے لئے کام کرتے ہو۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے اسٹیٹ ایجنسی کا دفتر کھول رکھا ہے۔ پولیس والوں کے ساتھ مل کر تم نے کسی بے گناہ شخص کو مجرم سمجھ کر مار ڈالا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھوت بن کر انتقام لینے آیا ہو۔"

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتنی دور کی باتیں کیوں کرتی ہو' ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو' تمہارا عاشق میرے ہی ہاتھوں سے مارا گیا ہے۔"

"میرا کوئی عاشق نہیں تھا۔" وہ غصے سے بولی۔ "مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم میری خوبصورتی سے جلتے ہو اور مجھ پر الزامات لگاتے ہو۔"

محسن اس کے غصے سے محظوظ ہوکر قہقہے لگاتا رہا۔ وہ گھر پہنچے تو چوکیدار ان کے لئے کھانا تیار کررہا تھا۔ محسن کار کی ڈگی سے شراب کی بوتل نکال کرلے آیا۔ پھر بیڈ روم میں بیٹھ کر پینے کے دوران ریتا سے کہا۔

"باہر والا دروازہ اندر سے بند کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا وہ بھوت عاشق مجھے تلاش کرتا ہوا آجائے۔"

ریتا اسے گھورتے ہوئے بیڈ روم سے نکل گئی۔ پھر ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا لیکن اس کے ساتھ والی کھڑکی کی چٹخنی گرادی۔ شاید اسے یقین تھا کہ بھوت وہاں ضرور آئے گا۔

مکان کے اندر روشنی تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ شیشوں سے باہر جانے والی روشنی میں باہر کی برف دور تک چمک رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس برف میں کسی کے دھنستے ہوئے قدم مکان کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ محسن نے تیسرا پیگ ختم کیا مگر ہوش

وحواس میں تھا، ہلکی سی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

"ریتا........ تم ڈرائنگ روم میں کیا کر رہی ہو؟ یہاں آجاؤ۔ شراب کی کر[ی] نہیں ہے۔"

پھر خود ہی اٹھ کر جھومتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں پہنچتے ہی اچانک ایک بجلی کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ وہ بڑی پھرتی سے اچھل کر پیچھے چلا گیا کی حاضر دماغی نے اسے بچا لیا تھا۔ نقاب پوش حملہ کرنے کی جھونک میں اس کی لڑکھڑا گیا۔ محسن نے اس کے ہاتھ پر ایک ٹھوکر ماری۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل جا گرا۔ پھر دونوں ہی گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں ہی قد آور اور قوی ہیکل تھے او ہاتھیوں کی طرح آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ لڑنے کے دوران محسن نے اس کے چہ نقاب کھینچ لیا۔

وہ پرکاش تھا۔ اس نے بے نقاب ہوتے ہی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کھڑکی سے باہر آکر وہ پھر لڑنے لگا۔ کبھی پرکاش اس پر پڑتا تھا اور کبھی وہ پرکاش کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔ وہ اندھیرے میں لڑتے لڑتے مکا پیچھے چلے گئے۔ مکان کے پیچھے ایک گہری کھائی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس بات کو سمجھتا تھا کہ اس طرف جانے سے جان کو خطرہ ہے لیکن وہ لڑنے کے د سنبھل نہ سکا۔ اس طرف بڑھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ جب اس کے انداز مطابق وہ گہری کھائی ایک قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ اچانک ہی گر پڑا۔ پرکاش نے ا چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ ویرانے میں گونجتی چلی گئی۔ محسن نے پاؤں پر رکھ کر پیچھے کی طرف اچھال دیا تھا۔ پرکاش اندھیرے میں برف کی دبیز تہ ہو چکا تھا۔ اسی وقت ریتا نے مکان کی پچھلی کھڑکی کھول کر بڑی پریشانی سے پوچھا۔

"محسن! تم اندھیرے میں کس سے جھگڑا کر رہے ہو؟ کون ہے وہ دشمن؟"

محسن نے برف سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اپنے عاشقو فہرست سے تیسرے کا نام کاٹ دو۔ اب وہ صرف بھوت بن کر ہی واپس آسکتا ہے۔"

☆=====☆=====☆

دوسرے دن وہ دونوں فیض آباد سے واپس آگئے۔ ریتا پچھلی ساری رات سہمی رہی تھی کیونکہ اس نے اپنے تیسرے عاشق کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ

رہی تھی کہ اب محسن اس پر ظلم کی انتہا کر دے گا۔ اسے دوسروں سے عشق کرنے کا مزہ چکھائے گا لیکن خلافِ توقع اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسے مارنے کے لئے ہاتھ بھی نہیں اٹھایا۔ صرف بیڈ روم سے باہر نکال دیا تاکہ وہ کھڑکی کھلی رکھے اور اپنے عاشق کا انتظار کرتی رہے۔ ڈرائنگ روم میں آتشدان نہیں تھا۔ باہر ایسی برفباری ہو رہی تھی کہ وہاں ساری رات اس کی قلفی جمتی رہی۔

وہ کچن میں جا کر آگ تاپتی رہی اور دل ہی دل میں محسن کو گالیاں دے کر سوچتی رہی کہ کس طرح اس سے پیچھا چھڑائے۔ اونچی سوسائٹی میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ طلاق لے کر بدنام ہونا نہیں چاہتی تھی۔ محسن میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی بیوی کی بہت تعریفیں کرتا تھا۔ اس کی عاشق مزاجی پر پردہ ڈال دیتا تھا۔ مگر چپکے ہی چپکے اس کے عاشقوں کو ٹھکانے لگا دیتا تھا۔

وہ محسن کے سائے میں ہر طرح سے محفوظ تھی مگر آزاد نہیں تھی۔ جوانی میں پر نکل آتے ہیں۔ ایسے میں اڑنے کی آزادی نہ ملے تو ریتا جیسی عورتیں پنجرہ توڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ پھر ایسے ساتھی کی تلاش کرنے لگی جو اسے محسن کے پنجرے سے آزاد کرا سکے۔ محسن بظاہر اس سے لاپروائی برتتا تھا۔ ریتا کو کلبوں اور تفریح گاہوں میں جانے کی آزادی دے رکھی تھی۔ ساتھ یہ بھی جتا دیا تھا۔

"ڈارلنگ! میری معلومات کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ تم میری دی ہوئی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ گی تو ہمارا تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا' وہ تیسرا آدمی جان سے جائے گا جو ہمارے درمیان آئے گا۔"

وہ بہت اسمارٹ اور بہت دلیر تھا مگر ریتا کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ایسے مرد پسند نہیں تھے جو بالکل ہی حاکم بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ محسن کی دنیا سے باہر کتنے ہی دولتمند تھے جو پروانوں کی طرح اس کا طواف کرتے رہتے تھے۔ ریتا کو کسی من پسند ساتھی کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑا۔ جگدیو نامی ایک نوجوان اس کے حسن کے دربار میں خود ہی ہاتھ باندھ کر چلا آیا۔ جگدیو بھی ایک دیو کی طرح قوی ہیکل تھا لیکن ریتا نے اپنے جنات قسم کے سب عاشقوں کو محسن کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا تھا۔ لہٰذا جب پہلی بار جگدیو نے قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا کہ وہ محسن سے اس کا پیچھا چھڑائے گا تو ریتا نے صاف طور سے انکار کر دیا۔

"نہیں، تم محسن کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ وہ طاقت کے ذریعے کی میں نہیں آئے گا۔ تم کوئی اچھی سی تدبیر سوچ کر بتاؤ پھر میں تمہاری طرف ب جرأت کروں گی۔"

جگدیو کو یہ بات بہت بری لگی کہ ریتا اس کی جسمانی قوت پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ ریتا کا مشورہ نہ مان کر اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حسین عور کے بے شمار شیدائی تھے، اب اس کی آغوش میں آنا چاہتی تھی لیکن محسن نے ا طرح دہشت زدہ کر دیا تھا' اس نے کہا۔

"میں اسے چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں۔ مگر تم میری طاقت پر بھروسہ نہ ہو۔ جب طاقت استعمال نہیں کی جائے گی تو پھر ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے' وہ یہ ک کالے جادو سے مارا جائے۔"

ریتا نے کہا۔ "میں نے کالے جادو کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے لیکن آنکھوں سے اس جادو کا اثر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم کچھ بھی کرو، مگر اس بات کا خیا کہ محسن کو ہم پر شبہ نہ ہونے پائے۔"

"اسے شبہ نہیں ہوگا' جب تک کالا جادو اپنا کام نہ دکھائے تم مجھ سے دور رہنا۔"

"کیا تم جادو جانتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا لیکن ایک بہت ہی مشہور جادوگر کو جانتا ہوں۔ اس کا نام ہے مگر وہ پروفیسر سامری کے نام سے مشہور ہے۔"

"ہاں' میں نے سامری جادوگر کی کہانیاں پڑھی ہیں۔"

"یہ کہانیوں والا سامری جادوگر نہیں ہے۔ بہت پہلے یہ ہمارے دیس کا ایک بڑ سائنسدان تھا۔ پھر اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی لیبارٹری تباہ ہوگئی۔ لوگ کہتے ہیں کالے جادو اور سائنس کو گڈمڈ کر کے کالے جادو کو سائنسی علم بنانا چاہتا تھا۔ مگر ا وجہ سے، اس کا دماغ خراب ہوگیا۔"

"تم اس پاگل آدمی سے کیا کام لے سکو گے؟"

"اب وہ پاگل نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اپنی پوری کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری مراد بھی پوری ہو جائے۔"

"میں پروفیسر سامری سے ملاقات کروں گی پہلے اس کی دماغی حالت سے مطمئن ہو جاؤں گی پھر ہم اس سے کوئی کام لیں گے۔"

"اچھی بات ہے' ابھی چلو۔"

"میں ابھی نہیں جا سکتی پتہ نہیں محسن کس طرح میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ کل صبح وہ شہر سے باہر جا رہا ہے۔ کل ہم اطمینان سے پروفیسر سامری کے پاس جا کر اس سے اپنے مطلب کی باتیں کریں گے۔"

دونوں نے دوسرے دن ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ پھر وہ جگدیو سے رخصت ہو کر جلد ہی اپنی کوٹھی میں واپس آ گئی۔ محسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس چکر میں رہتا تھا۔ ریتا اس کی پتنی بننے کے باوجود اس کی مصروفیات کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ رات کو دیر سے آیا تو اچھے موڈ میں تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس سے اچھے ہی موڈ میں رخصت ہوا۔ ریتا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے جلدی واپس آنے کی قسمیں دیں۔ مگر دل ہی دل میں کہا۔

"جاؤ رخصت ہو جاؤ۔ میں تو ہمیشہ کے لئے تمہیں رخصت کرنے والی ہوں۔"

جب وہ چلا گیا تو اس کے ایک گھنٹے کے بعد ریتا کار میں بیٹھ کر جگدیو کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ وہ انتظار کر رہا تھا۔ ریتا کو ساتھ لے کر سیدھا سامری کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ پروفیسر سامری کی کوٹھی کسی عجائب گھر کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کے طور پر بڑے سلیقے سے مردہ کھوپڑیاں اور ڈمی کے طور پر خونخوار درندے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں قدم رکھتے ہی لوگ دہشت زدہ ہو کر پروفیسر سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ پروفیسر سیاہ چغہ پہنے ہوئے ڈرائنگ روم کے ایک چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر سیندور سے ایک سو گیارہ کا عدد بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بوڑھے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ بھی کوئی ڈھانچہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس ڈھانچے سے سرخ آنکھوں نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا چاہتی ہے؟ تیری منو کامنا پوری ہوگی۔"

جگدیو نے ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! اس کا پتی بہت ظالم ہے۔ یہ اپنے گھر کو سورگ بنانا چاہتی ہے' وہ نرک بنا دیتا ہے۔ یہ ایسے ظالم پتی سے، اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔"

پروفیسر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ تیرا بھی پتی ہے؟ اگر نہیں ہے مورکھ......... تُو بیچ میں نہ بول۔“

جگدیو جھینپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ریتا آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

”مہاراج! میں بہت پریشان ہوں۔ اپنی نادانی سے ایک مسلمان کے پیار ہوں۔ دھرم سے بے دھرم ہو کر آپ کے پاس سہائتہ کے لئے آئی ہوں۔“

”تُو سہائتہ کے لئے آئی ہے‘ مگر یہ کون ہے؟“

”یہ جگدیو ہے۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔“

”اپنے ہمدرد سے بول‘ باہر چلا جائے تیرا کام ہے اس لئے تُو یہاں رہے گی۔“

ریتا نے جگدیو کی طرف دیکھا‘ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ وہ چلا جائے خاموشی سے سر جھکا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر سامری نے اپنے ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں آکر بیٹھ جا اور مجھے بتا کہ تیرا پتی کون ہے اور کیا ہے؟“

ریتا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ پروفیسر نے کہا۔

”اری ڈرتی کیوں ہے‘ کیا میں تجھے کھا جاؤں گا؟ ذرا اور قریب آجا۔“

ریتا کھسک کر ذرا اور قریب آگئی اور محسن کے بارے میں اسے بتانے لگی۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے پتی کے علاوہ دوسروں سے بھی عشق کرتی رہی۔ پروفیسر نے کہا۔

”تُو کہتی ہے کہ وہ خطرناک ہے۔ مگر تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ خطرناک ہے۔ ہمدرد جگ... ملوان نظر آتا ہے‘ کیا یہ تیرے پتی کو ٹھکانے نہیں لگا سکتا؟“

”میرا پتی اس سے زیادہ بلوان ہے۔“

”تجھے کیسے معلوم ہوا......... کیا تیرے پتی نے جگدیو کی پٹائی کی ہے؟ تو بھی کچھ چھپائے گی تو میں تیرے کام نہیں آسکوں گا۔“

ریتا کو مجبور ہو کر تمام باتیں بتانی پڑیں کہ کس طرح اس کے پہلے عاشق ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اب وہ نہیں چاہتی کہ جگدیو بھی مارا جائے۔ اسی لئے استعمال کرنے کے بجائے پروفیسر کے کالے علم سے فائدہ اٹھانے آئی ہے۔ پروفیسر

”جہاں آدمی کے شریر کی طاقت کام نہیں آتی‘ وہاں میرا دماغ کام کرتا ہے۔

سمجھ لینا چاہئے کہ میں تیرے جگدیو اور محسن سے زیادہ بلوان ہوں‘ اس لئے کہ میں ہی تیرے کام آسکتا ہوں۔“

پروفیسر نے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ریتا کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بوڑھا بھی اس پر مر مٹے گا۔ وہ بوڑھا تھا مگر اس کی پتلی سی کمر پر بوڑھی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو چھڑا کر اس سے دور ہو گئی۔ پھر غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ کیا حرکت ہے۔ کیا تم نے مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے؟“

پروفیسر نے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تُو بازاری نہیں ہے مگر اونچے درجے کی عاشق مزاج ہے۔ جگدیو چوتھا ہے‘ پانچویں نمبر پر میرا نام لکھ لے اور یہاں سے جا کر ٹھنڈے دماغ سے سوچ کہ کون تیرے کام آسکتا ہے۔ تُو مجھے بوڑھا نہ سمجھ۔ میرا دل جوان ہے۔ میں ایک پھونک میں محسن کو اڑا دوں گا۔ جب بھی اس سے پیچھا چھڑانا ہو میرے پاس چلی آنا۔ اب بھاگ جا یہاں سے تیرے جیسی یہاں کتنی ہی آتی رہتی ہیں......... بھاگ یہاں سے.........“

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر آگئی۔ جگدیو کار میں بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ریتا کو دیکھتے ہی پوچھا۔

”کیا بات ہے‘ تم غصے میں نظر آ رہی ہو؟“

وہ کار میں بیٹھ کر ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کرتی ہوئی بولی۔

”تم کس گدھے کے پاس مجھے لے آئے ہو۔ وہ بوڑھا ہڈی کا ڈھانچہ مجھے اپنی گود میں بلا رہا تھا‘ کمینہ۔ بدمعاش۔“

جگدیو نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس نے ایسی ذلیل حرکت کی ہے تو میں ابھی جا کر اس کا گلا دباتا ہوں۔“

وہ اسٹیئرنگ سیٹ سے باہر جانے لگا۔ ریتا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ٹھہرو۔ پاگل نہ بنو۔ وہ بوڑھا بہت خطرناک ہے۔ اگر اس نے جادو کے ذریعے تمہیں نقصان پہنچایا تو پھر مجھے تمہارا سہارا بھی نہیں ملے گا۔“

جگدیو غصے میں بھول گیا تھا کہ وہ ایک نامور جادوگر سے ٹکرانے جا رہا ہے۔ ریتا کے کہنے سے مان گیا۔ مگر وہ خود کو بزدل ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے

بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں اس بوڑھے سے سمجھ لوں گا۔ اس کی یہ مجال کہ تمہیں ہاتھ لگائے۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ محسن تمہارے قریب آئے۔ میں ایک ہی گھونسے اسے ناک آؤٹ کر سکتا ہوں مگر تم مجھے روک دیتی ہو۔"

"مرد غصے میں پاگل ہوجاتے ہیں۔ میں نے پرکاش وغیرہ کا انجام دیکھ لیا ہے۔ تمہیں محسن کے پاس جانے کی کبھی اجازت نہیں دوں گی۔ غصہ تھوک دو، آج میں تمہاری ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے۔ یہ سنہری موقع غصے میں ضائع نہ کرو۔"

جگدیو خوش ہوکر مسکرانے لگا۔ وہ ریتا کو لے کر سیدھا اپنی کوٹھی پر آیا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر ریتا تھکے ہوئے انداز میں ہائے کہتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ بستر سے ابھری ہوئی "ہائے" ایک بلاوہ تھا۔ جگدیو نے مسکراتے ہوئے مینٹل پیس پر سے وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ پھر ایک پیگ بنا کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"یہ جام تمہاری جوانی کے نام ہے.......... چیرز.........."

یہ کہتے ہی اس نے شراب حلق سے اتار لی۔ پھر آگے بڑھا مگر گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ خود بھی گلاس کی طرح فرش پر آگیا اور تڑپتے ہوئے اپنے حلق کو سہلانے لگا۔ ریتا گھبرا کر بستر سے اٹھ گئی۔ اس کے پاس فرش پر آکر جھکی۔ اس وقت تک وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

وہ اس صورت حال سے بالکل ہی بوکھلا گئی۔ جگدیو کے جسم کی رنگت بدل گئی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شراب میں زہر ملا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ کسی نے اسے جگدیو کے ہمراہ وہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لی جاتی تو وہ زہر دینے کے الزام میں پکڑی جاتی۔ اس سے پہلے کار اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کوٹھی میں آگئی۔

اپنی چھت کے نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بچ گئی تھی۔ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ شراب میں زہر کس نے ملایا ہوگا؟ بیڈ روم میں پہنچتے ہی جواب مل گیا۔ محسن بستر پر پاؤں رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"کیا جگدیو کا کریا کرم ہو چکا ہے؟"

ریتا کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ ایک پل میں ساری باتیں سمجھ میں آگئیں۔ اس کا سر چکرانے لگا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں محسن کی آواز گونجنے لگی۔

"تم مجھ سے کتنی دور بھاگو گی؟ تم جہاں جاؤ گی میرے ہاتھ تمہارے چاہنے والے کی شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مگر میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گا یا پھر تم اسی طرح بھاگتی بھاگتی مر جاؤ گی۔ نفرت کے باوجود ایک بات ہم دونوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ تم اذیت پسند ہو اور مجھے ایسی ہی عورتیں پسند ہیں۔ تم نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وچن دیا ہے اور تم یہ وچن نبھاؤ گی۔ اب بھی یقین نہ ہو تو کسی پانچویں عاشق کو تلاش کرو۔"

وہ جواب میں کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کے پاس عام عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا ایک ہی ہتھیار رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی، دونوں بانہیں پھیلا کر اس پر گر پڑی۔ پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

☆------☆------☆

محسن اس کے لئے ایسا نوالہ بن گیا تھا جسے وہ نگل سکتی تھی نہ اُگل سکتی تھی۔ عاشقوں سے مدد حاصل کرنے کے دوران وہ محسن کو برابر اُگلنے کی کوشش کرتی رہی۔ اب اس کے دل میں دہشت بیٹھ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ محسن کی آغوش میں جاکر سوچتی کہ مرد ہو تو ایسا ہو۔ عورت کو مدہوش بھی کرلے اور مرعوب بھی۔ وہ مرعوب ہوکر سوچتی تھی۔ مگر جب پروانے اس کے چاروں طرف منڈلانا شروع کردیتے تو وہ پھر سے ہوکر سوچنے لگتی کہ ایک ہی پنجرے میں قید ہوکر زندگی گزارنا حماقت ہے۔ محسن سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

اس کی تلون مزاجی پھر اسے بھڑکانے لگی۔ بس ایک کوشش اور کرنی چاہئے ہر ہے کہ اس بار محسن سے پیچھا چھوٹ جائے۔ اس مرتبہ انسانی طاقت سے نہیں شیطانی قوت سے کام لینا ہوگا۔ مگر اس مقصد کے لئے اس بوڑھے خبیث جادوگر کے پاس جانا ہوگا۔ بوڑھے سامری کے تصور سے ہی اسے کراہت سی ہوتی تھی۔ مگر آخری بار کامیابی کی امید صرف اسی کی ذات سے تھی۔

وہ دو دن تک شدید الجھنوں کا شکار رہی۔ دل کسی طرح بوڑھے کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کا غرور اسے سمجھا رہا تھا کہ بوڑھے سامری کی مدد حاصل نہ کی تو محسن ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہے گا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ بوڑھا اس کے کاندھے پر سوار ہوگیا ہے۔ وہ اسے اپنے کاندھے سے اتارنا چاہتی ہے تو بوڑھا اپنی دونوں ٹانگیں اس کی گردن میں قینچی کی طرح پھنسا دیتا ہے اور وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگتی ہے۔

شاید ریتا نے کبھی سندباد جہازی کی کہانی پڑھی ہوگی۔ سندباد کے کاندھے پر بھی بوڑھا اسی طرح سوار ہوگیا تھا۔ وہی بوڑھا جادوگر سامری کے روپ میں اب ریتا کے کاندھے پر سوار ہوگیا تھا۔ ریتا اس کے بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اور دا

دانت نکال کر کہہ رہا تھا۔

"جوان عورت کبھی خالی نہیں رہتی۔ اسے ایک کے بعد دوسرے کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر تُو ایک سے نجات حاصل کرلے گی تو دوسرا کسی بہانے چلا آئے گا۔ میں نے تجھے محسن سے نجات دلائی ہے' اس کا معاوضہ تو وصول کرنے دے۔"

ریتا اسے کاندھے پر اٹھائے ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ صبح سے شام ہوگئی۔ شام کے بعد رات آگئی۔ رات کے وقت اس بوڑھے پر غنودگی طاری ہوئی تو ریتا نے اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاکر اسے ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس بوڑھے کے ساتھ خود بھی گہری پستی میں لڑھکتی جارہی ہو۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی صبح ہونے والی تھی۔ اس کے پاس ہی بستر پر محسن گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے خواب میں اس دیو سے پیچھا چھڑالیا تھا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی وہ سامنے موجود تھا لیکن وہ خواب میں بھی اس سے پیچھا چھڑاکر مطمئن نہیں تھی۔ کیونکہ بوڑھے نے اسے قید کرلیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس کی قید میں رہنا بہتر ہے۔ جوان کی قید میں یا بوڑھے کی؟

وہ جوان بے حد خطرناک تھا۔ کتنے ہی کڑیل جوان عاشق اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ریتا کی کوئی چالاکی بھی کام نہ آتی تھی۔ اسی لئے اب وہ بوڑھے کو ترجیح دے رہی تھی۔ اس خواب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ذرا چالاکی سے کام لے تو اس بوڑھے سے بھی پیچھا چھڑالے گی۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاکر اس کا سر کچل دے گی یا کھانے میں زہر دے کر اسے ہلاک کردے گی۔ بوڑھا کتنا ہی شاطر ہو' جوان عورت کے چھل فریب میں آجائے گا۔

صبح دس بجے جب محسن حسب معمول گھر سے چلا گیا تو وہ گھنٹہ بھر تک سنگھار کرتی رہی۔ اس نے بہترین لباس پہنا' بہترین خوشبو لگائی۔ پھر بوڑھے جادوگر پر اپنی جوانی کا جادو جگانے پہنچ گئی۔ اسے دیکھتے ہی بوڑھے کا منہ خوشی سے کھل گیا۔

"میں جانتا تھا کہ تُو ضرور آئے گی۔ کیونکہ تیرے جیسی عورت جب اپنے پتی سے نفرت کرتی ہے تو اس بے چارے کو نرک میں پہنچانے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرتی ہے۔"

بوڑھے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے چومتے ہوئے کہا۔ "اب یہ ہاتھ ہزار اب تیرا پتی اسے کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔"

ریتا نے بڑی کراہت سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا کیونکہ بوسہ لیتے وقت بوڑھے کی رال ٹپک گئی تھی۔ مگر اس نے ٹھیک کہا تھا' ایسی عورتیں بڑی سے بڑی قیمت ادا ہیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لیبارٹری کی طرف لے جانے لگا۔ ریتا نے پریشان ہو کر پوچھا

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"نردان کے راستے پر........ چپ چاپ چلی آ۔"

"تم........ تم محسن کو کس طرح راستے سے ہٹاؤ گے؟"

"تُو نے اپنی جو بپتا سنائی ہے اور تیرے پچھلے عاشقوں کا جو حال ہوا ہے' اس سے نے سمجھ لیا ہے کہ تیرا پتی سچ مچ خطرناک ہے۔ میں اس کا سامنا نہیں کروں گا' میرے اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔"

اس نے لیبارٹری کا دروازہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے جو منظر دکھائی اسے دیکھتے ہی ریتا خوف سے چیخ پڑی اور بوڑھے سے لپٹ گئی۔ لیبارٹری کے ایک بڑے سے کمرے میں مردہ انسانوں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ بوڑھا اس کے لپٹنے کے انداز سے تھوڑی دیر تک محظوظ ہوتا رہا پھر اس نے تسلی دینے کے انداز میں اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اری ڈرتی کیوں ہے۔ ان ڈھانچوں میں جان نہیں ہے۔ ان میں صرف اسی وقت جان پڑتی ہے جب میں چاہتا ہوں۔ یہ میری مرضی کے بغیر تیرے قریب نہیں آئیں گے۔"

وہ سہم کر بولی۔ "میں اندر نہیں جاؤں گی۔"

"اندر نہیں جائے گی۔ ان ڈھانچوں کو نہیں سمجھے گی تو محسن کا زندہ ڈھانچہ تیرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

اسے مجبوراً لیبارٹری کے اندر جانا پڑا۔ اندر پہنچ کر بھی وہ بوڑھے سے چپکی رہی۔ اس لیبارٹری میں کبھی بہترین سائنسی آلات تھے۔ اب بھی دو چار مشینیں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ان کے ساتھ استخوانی ڈھانچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سامری جادوگر اسے ڈھانچے کے پاس لے گیا اور اسے چھوتے ہوئے ریتا سے بولا۔

"تو بھی ہاتھ لگا کر دیکھ میری موجودگی میں یہ تجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

ریتا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ لگایا۔ ان ڈھانچوں پر پتلی سی کھال منڈھی ہوئی تھی۔ ابھری ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ہڈیوں کے درمیان کا خلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

"اس ڈھانچے کے سینے میں اور کھوپڑی میں سائنسی آلات نصب کئے گئے ہیں کالے جادو کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ سائنسی آلات کے ذریعے میں جو کام ان ڈھانچوں سے لے سکتا ہوں' کوئی جادوگر نہیں لے سکتا۔ اِدھر آ۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ میرے تمام چیلے کس طرح میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔"

وہ ایک چھوٹی سی مشین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس مشین میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بٹن لگے ہوئے تھے ریتا توجہ سے اسے دیکھنے لگی۔ ہر بٹن کے ساتھ ہدایات کے طور پر ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ جس بٹن پر آن لکھا ہوا تھا' بوڑھے نے اسے ایک انگلی سے دبا دیا۔

آن ہوتے ہی سامنے کھڑا ہوا ڈھانچہ ہولے ہولے لرزنے لگا۔ ریتا نے سہم کر بوڑھے کے بازو کو تھام لیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"ڈرتی کیوں ہے۔ وہ ڈھانچہ اتنا خطرناک نہیں ہے' یہ مشین خطرناک ہے۔ تُو اس مشین کے چھوٹے سے ٹی وی اسکرین کو دیکھتی رہ جب کبھی یہ ڈھانچہ ہماری نظروں سے دور محسن کے پاس جائے گا تو ریڈیائی لہروں کے ذریعے یہ یہیں اسکرین پر نظر آتا رہے گا۔ اس ڈھانچے کے سامنے جو لوگ ہوں گے' وہ بھی اسکرین پر نظر آئیں گے۔ اب دیکھ' اس بٹن کے سامنے "فارورڈ" لکھا ہے' میں اسے دباؤں گا تو یہ ڈھانچہ آگے کی طرف بڑھے گا۔ اس بٹن کو دباؤں گا تو یہ دائیں طرف بڑھے گا اور اسے دباؤں گا تو یہ بائیں طرف جائے گا۔"

وہ یکے بعد دیگرے بٹن دباتا گیا۔ ان کے مطابق وہ ڈھانچہ آگے پیچھے دائیں بائیں حرکت کرنے لگا۔ بوڑھے نے ریتا سے کہا۔

"یہ تو شریفانہ حرکت ہے۔ اب دیکھ' یہ لڑتا کس طرح ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مختلف بٹنوں کو دبانے لگا۔ ریتا حیرانی سے ڈھانچے کو دیکھنے لگی۔ وہ ڈھانچہ ایک بہترین فائٹر کی طرح پینترے بدل رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے

کراٹے کے انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک میز پر ایک استخوانی کھوپڑی رکھی ہوئی
بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"اب دیکھو' یہ اپنے دشمن کا گلا کس طرح گھونٹ سکتا ہے۔"

بوڑھا پھر مشین آپریٹ کرنے لگا۔ ڈھانچہ آگے بڑھتا ہوا اس کھوپڑی کے
اور اسے دونوں ہاتھوں کے استخوانی پنجوں میں دبوچ لیا۔ پھر اسے اتنی قوت سے
شروع کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے شکنجے میں چُور چُور ہو گئی۔ ریتا نے بوڑھے کو
سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ونڈر فل.......... اس سے تو محسن کا باپ بھی نہیں بچ سکے گا تم اسے محسن
کیسے پہنچاؤ گے؟"

"اسے محسن کے پاس پہنچانا میرا کام ہے' ابھی تم میرے پاس پہنچ جاؤ۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اسے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

☆======☆======☆

اپنی کوٹھی میں پہنچ کر اسے بوڑھا یاد آتا رہا۔ ساتھ ہی ابکائیاں بھی آتی رہیں۔
جتنی گالیاں یاد تھیں' اسے دل ہی دل میں دیتی رہی۔ بے چاری مجبور تھی اونچی ہوا
میں آزاد تتلی کی طرح اڑنے کے لئے بوڑھے طوفان کی زد میں آگئی تھی۔ مگر ہزار گا
دینے کے باوجود وہ اس کی احسان مند تھی۔ جب تک وہ بوڑھے کے پاس رہی' وہ
کام کی باتیں بتاتا رہا اور منصوبے بتاتا رہا کہ کس طرح محسن کو گھیرا جائے گا۔

ریتا نے بوڑھے کو بتایا تھا کہ آج رات وہ محسن کے ساتھ پہاڑ تلی جائے گی۔
کے ریسٹورنٹ میں وہ لوگ کھانا کھائیں گے' وہاں کی سیر کریں گے پھر آدھی رات کے
واپسی ہوگی۔ واپسی میں کسی ویران راستے پر وہ ڈھانچہ اس کا راستہ روک سکتا
بوڑھے نے اس سے سوال کیا۔

"کیا محسن بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتا ہے؟"

"نہیں۔ وہ ان باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔"

"میں بڑے بڑے مذاق اڑانے والوں کو قائل کر چکا ہوں کہ مردہ ڈھانچے بھی
انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے ہیں۔ اب سے پہلے کئی بار میں نے ایسے لوگوں
دروازوں پر اس ڈھانچے کو بھیجا ہے۔ جب وہ آدھی رات کو اپنے دروازے پر اسے

ہیں تو ساری اکڑفوں بھول جاتے ہیں۔"

ریتا کو اچانک کچھ یاد آیا' اس نے پوچھا۔

"کیا تم نے چندر پور کی بستی میں بھی کبھی ڈھانچے کو بھیجا تھا؟"

"ہاں۔ ایسے وقت جب وہاں برفباری ہو رہی تھی تو اس ڈھانچے کو میں اپنے ساتھ
لے گیا تھا مگر ان غیر ضروری باتوں سے کیا حاصل ہوگا۔ تجھے کام کی باتیں پوچھنی
چاہئیں۔"

پوچھنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ محسن کو ہلاک کرنے کا پروگرام پہلے ہی بن چکا تھا۔
چونکہ وہ مطمئن ہو چکی تھی' اسی لئے اس کا ذہن ننھی شیلا کی طرف بھٹک رہا تھا جس نے
اس ڈھانچے کی کہانی سنائی تھی۔ اب ریتا سوچ رہی تھی کہ واقعی بھوتوں کا کوئی وجود نہیں
ہوتا۔ بوڑھے سامری جیسے شعبدے باز اچھے خاصے ذہین لوگوں کو بھی خوفزدہ کر دیتے
ہیں۔

اس رات وہ پروگرام کے مطابق محسن کے ساتھ پہاڑ تلی گئی۔ وہ بہت خوش نظر
آ رہی تھی اور اپنی اداؤں سے یہ ثابت کر رہی تھی کہ اب وہ محسن کی خاطر ساری دنیا کو
بھول چکی ہے۔ محسن نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اب راہِ راست پر آگئی ہے۔ اس خوشی میں
وہ وہسکی کے چھ پیگ حلق سے اتار گیا۔ جب وہ بارہ بجے رات کو وہاں سے واپس چلے تو
نشے کی وجہ سے اس کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر
اس نے ایک پیگ اور چڑھایا۔ پھر ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کرتا ہوا شہر کی طرف چل
پڑا۔

ریتا اس کے پاس بیٹھی ہوئی کار کی تیز رفتاری سے گھبرا رہی تھی اور اسے سمجھا رہی
تھی کہ ذرا آہستہ ڈرائیو کرے۔ مگر وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ اور اس کے پاؤں
اس کے قابو میں نہیں تھے بس وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ سامنے دور تک ایک راستہ چلا گیا ہے
اس پر اسے تیز رفتاری سے چلتے رہنا ہے۔ مگر آگے جا کر اس کے سامنے رکاوٹ پیدا
ہو گئی۔ ایک کار سڑک پر ترچھی کھڑی ہوئی تھی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ ہیڈ
لائٹس کی روشنی میں محسن دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے متواتر ہارن دینے
لگا مگر اس کار نے راستہ نہیں چھوڑا۔ مجبوراً اسے اپنی کار روکنی پڑی۔ وہ نشے کی حالت
میں جھلاتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اسی وقت سامنے کھڑی

ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک ڈھانچہ باہر نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

محسن بوکھلا کر بار بار اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھوت کار سے نکل کر کس طرح آ سکتا ہے۔ ریتا نے خوفزدہ ہونے کی کی اور اس سے کہا۔

"محسن! معلوم ہوتا ہے یہ وہی بھوت ہے جو شیلا کے یہاں تمہیں تلاش کر تھا۔ یہاں سے بھاگ چلو۔"

محسن نے نشے کی ترنگ میں ایک بڑھک مارتے ہوئے کہا۔ "میں بزدل نہیں میں اس بھوت کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا اور اس کے پاس تو صرف ہڈی اور پ ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ کار کی سٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا پروفیسر سامری آپریٹ کر رہا تھا۔ اس کے مطابق ڈھانچہ بھی آگے بڑھا۔ محسن نے سوچا تھا کہ ہڈیوں پھلکا سا ڈھانچہ ہے' ایک ٹھوکر میں اڑ جائے گا۔ مگر اس سے پہلے ہی ڈھانچے نے ا اس کے سینے پر ایک لات ماری۔ ڈھانچے کا نشانہ اس لئے خطا نہیں ہو سکتا تھا کہ سامری مشین کے چھوٹے سے ٹی وی سکرین پر محسن کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس پوزیشن ہے اور اس پر کس طرح حملہ ہونا چاہئے۔

لات کھا کر گرتے ہی محسن کا آدھا نشہ ہرن ہو گیا۔ اب کی بار وہ جم کر میدان اور آگے بڑھتے ہی متواتر دو ہاتھ مارے ایک ہاتھ ڈھانچے نے روک لیا مگر دوسرا گیا اور تنکے کی طرح اچھل کر دور جا پڑا۔ وہ جتنی دور جا کر گرا تھا اتنی ہی پھرتی سے کر پھر قریب آ گیا۔ محسن نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں مشین کی تیزی سے چل رہے تھے۔ مشین کو صرف آپریٹ کرنے والی کلوں سے روکا جا انسانی ہاتھ اس کی زد میں آ کر زخمی ہو جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ محسن نے بڑ زخمی ہو کر گرتے گرتے ڈھانچے کے بازو پر کھڑی ہتھیلی کی ایک ایسی ضرب لگ ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ محسن بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا زمین پر گر پڑا۔ اس کی ناک سے اور باچھوں سے لہو رس رہا تھا۔ ڈھانچے نے اسے لگائی تھیں کہ اس کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔

دوسری طرف ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر گرتے ہی ریتا اور سامری پریشان ہو

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ محسن مشینی ڈھانچے پر بھی سبقت لے جائے گا۔ سامری کا منصوبہ یہی تھا کہ ڈھانچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے محسن کا گلا دبوچ لے گا۔ مگر اب اس کا ایک ہاتھ رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود پروفیسر پھر مشین آپریٹ کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اب ذرا سی دیر میں محسن اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا کیونکہ وہ بری طرح مار کھانے کے بعد ایسے گرا تھا کہ دوبارہ نہیں اٹھ سکتا تھا۔

ڈھانچہ اچھل کر اس کے قریب آیا تا کہ اسے ٹھوکریں مار مار کر بالکل ہی زمین کا پیوند بنا دے۔ محسن کے چہرے پر اور سینے پر دو زبردست ٹھوکریں پڑیں۔ وہ چیختا ہوا نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ ڈھانچہ بھی اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ سطح زمین پر پہنچ کر محسن کا زخم خوردہ جسم ٹھہر گیا۔ ڈھانچے نے پھر ایک لات چلائی محسن نے اپنی آخری تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ڈھانچے کی ٹانگ پکڑ لی۔ پھر اسے پوری قوت سے دوسری طرف پھینک دیا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا پتھر تھا۔ اس پتھر سے ٹکراتے ہی ڈھانچے کی کھوپڑی سے کچھ ٹوٹنے پھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کھوپڑی کے اندر جو آلات تھے انہیں کہیں سے نقصان پہنچا تھا۔ اب اس ڈھانچے کی آنکھیں اپنے سامنے کا منظر ٹیلی کاسٹ نہیں کر رہی تھیں۔ مشین کے ٹی وی اسکرین پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

پروفیسر سامری خوفزدہ ہو کر کار سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈھانچے کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ محسن زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کی خبر نہیں تھی۔ کار سے اتر کر اُدھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ڈھانچے کی طرح اس کے بھی ٹکڑے نہ کر دے۔ اس نے آزمائش کے طور پر مشین کو پھر آپریٹ کیا۔ چند لمحوں بعد ڈھانچہ نشیبی حصے سے ابھر کر سڑک کے کنارے آ گیا۔ مگر اس کی حالت عجیب تھی۔ ایک بازو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ کھوپڑی تڑخ کر دو حصوں میں تقسیم ہونے والی تھی اور سامنے کی طرف جھک کر سینے پر ٹھہر گئی تھی۔ سینے میں جو آلات نصب تھے وہی اسے کشاں کشاں پروفیسر کے قریب لے گئے۔ پروفیسر نے کار سے نکل کر ڈھانچے کو پچھلی سیٹ میں ٹھونس دیا۔ ریتا دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ پھر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

"م..........محسن کہیں زندہ تو نہیں ہے؟"

پروفیسر کی آواز بھی سہمی ہوئی تھی۔ "تت.......... تُو جا کے دیکھ میرا خیال ہے کہ وہ مر چکا ہے۔"

"تم کیسے مرد ہو' خود نہیں جاتے۔ مجھے آگے بڑھا رہے ہو۔"

"اس میں مردانگی کی کیا بات ہے۔ تُو اس کی پتنی ہے' تجھے اس کے پاس جانا
پتہ نہیں کس شیطان سے تُو نے شادی کی ہے۔ وہ تو ایسا خطرناک ہے کہ مرنے کے
یقین نہیں آتا کہ مرچکا ہے۔ میرا یہ ڈھانچہ بہت قیمتی ہے میں اسے لے کر جا رہا ہوں
وہ زندہ بچ گیا تو پھر میرے پاس آنا۔ کوئی دوسری تدبیر کی جائے گی۔"

اس نے ریتا کا جواب نہیں سنا۔ کار اسٹارٹ کرنے کے بعد "وِش یُو گڈ لک"
اسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ ریتا تھوڑی دیر تک سہمے ہوئے انداز میں کھڑی رہی۔ پھر
ڈرتے قدم بڑھاتی ہوئی سڑک کے کنارے آئی۔ اس کے دماغ نے سمجھایا' ڈرنے
بات ہے۔ محسن اس بار اس پر شبہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس بار اس کے کسی عاشق نے
پر حملہ نہیں کیا تھا اور حملہ کرنے والا ڈھانچہ اس کا عاشق نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے
اطمینان ہوا تو اس نے نشیب کی طرف دیکھا۔ محسن بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ وہ
پر رینگتا ہوا اور کراہتا ہوا سڑک کی طرف آرہا تھا۔ ریتا نے اچانک آنسوؤں کا حربہ ا
کیا۔ وہ روتی ہوئی اور چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

"ہائے ہائے محسن! یہ تمہیں کیا ہوگیا میری جان......... نہ جانے اس بھوت
سے کیا دشمنی ہوگئی تھی۔ دیکھو تو اس نے تمہاری کیا حالت کی ہے۔"

وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ محسن نے اس کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے
نقاہت سے کانپتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

"کہاں ہے وہ بھوت......... میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔"

"وہ بھاگ گیا ہے۔ تم بہت دلیر ہو محسن! مجھے تم پر ناز ہے۔"

وہ اس کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اپنے زخموں
بھولنے کے لئے وہسکی یا برانڈی کی ضرورت تھی ریتا نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر
بورڈ سے وہسکی کی چھوٹی سی بوتل نکالی۔ پھر اسے محسن کی طرف بڑھا دیا۔ محسن نے
اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ میں وہی بوتل استعمال کرتا ہوں جو میرے پاس لاکڈ ہوتی ہے
دیر میں اس ڈھانچے سے لڑتا رہا' اتنی دیر یہ بوتل تمہارے قریب تھی۔ مجھے یاد ہے
نے اپنے پہلے عاشق کو شراب میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ

گزار سکتا ہوں مگر تم پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ اس بوتل کو باہر پھینک دو اور کار ڈرائیو کرو
میں مرہم پٹی کے لئے فوراً ہی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"تم خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کرتے ہو۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھی کہو گے کہ وہ ہڈیوں کا
ڈھانچہ میرا عاشق تھا۔"

"میں یہ نہیں کہوں گا۔ ویسے تمہارے جیسی ناکام عورتیں مجبور ہو کر بھوتوں سے
بھی عشق کرلیتی ہیں۔ چلو وقت ضائع نہ کرو گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

ریتا نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہسکی کی بوتل کو گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھینک
دیا۔ پھر کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔ ایک ڈھانچے کا سہارا لے کر وہ مصیبت میں پڑ
گئی تھی۔ گھر پہنچ کر اسے ساری رات محسن کی تیمارداری کے لئے جاگنا پڑا۔ دوسرے دن
وہ پچھلی رات کی نیند پوری کرتی رہی۔ تیسرے دن محسن زخموں کے باوجود چلنے پھرنے کے
قابل ہوگیا۔ وہ گھر سے باہر گیا تو یہ بھی پروفیسر کے پاس پہنچ گئی۔ پروفیسر نے اسے دیکھتے ہی
کہا۔

"تیرا کوئی عاشق مرنے کے بعد واپس نہیں آیا۔ مگر میرے ڈھانچے کی مشین ٹوٹنے
کے بعد پھر بن گئی ہے۔ اس بار محسن اس سے نہیں بچ سکے گا۔"

"اور اگر بچ گیا تو تم مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔" ریتا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بیکار باتیں نہ کر میں نے تجھے جیون بھر ساتھ دینے کا وچن نہیں دیا ہے۔ میرا کام
صرف محسن کو مارنا ہے۔ میں اس لئے بھاگتا ہوں کہ مجھے اپنی جان پیاری ہے۔ مگر اب
بھاگنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرے ساتھ آ' میں تجھے بتاتا ہوں۔"

وہ پھر اسے لیبارٹری میں لے آیا۔ اس بار جو ڈھانچہ مستعد کھڑا ہوا تھا' اس کے ہاتھ
میں ایک سائیلنسر لگا ہوا ریوالور تھا۔ پروفیسر نے مشین کے پاس پہنچ کر کہا۔

"پہلے والا ڈھانچہ نہتا تھا۔ پچھلے تجربے نے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان ہو یا شیطان'
وہ محسن سے نہتا ہو کر مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اب ذرا قریب آکر اس اسکرین پر دیکھ۔ اس
ڈھانچے کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرے گا۔"

ریتا قریب آئی تو پروفیسر نے مشین کو آن کیا۔ اسکرین پر سامنے کی دیوار پر ایک
تختی لگی ہوئی تھی۔ اس تختی پر ایک چھوٹا سا نقطہ بنا ہوا تھا۔ پروفیسر مختلف بٹنوں کو دباتا
جارہا تھا۔ ڈھانچے کا ریوالور والا ہاتھ اٹھ رہا تھا۔ اسکرین پر صحیح ٹارگٹ کا ایک دائرہ نظر

آرہا تھا۔ اس دائرے کی سیدھ پر جب ریوالور کی نال پہنچی تو پروفیسر نے فائر کر دیا۔ نشانہ بالکل صحیح تھا۔ ایک کھٹ کی آواز سنائی دی اور تختی پر جو نقطہ بنا ہوا تھا ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ ریتا نے اس نشانے سے مطمئن ہوکر اطمینان کی ایک سانس لی۔ اب یقین ہوگیا تھا کہ محسن ریوالور کی زد میں آکر نہیں بچ سکے گا۔ پروفیسر نے کہا۔

"آج آدھی رات کے بعد میں اس ڈھانچے کو لے کر تیری کوٹھی میں آؤں گا۔ باہر کار میں بیٹھ کر مشین آپریٹ کرتا رہوں گا۔ ڈھانچہ تیری کوٹھی کے اندر جائے گا۔ محسن ریوالور کی موجودگی میں اس کے قریب آکر اپنے داؤ پیچ سے اسے توڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ کھیل زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ ڈھانچہ اس پر فائر کرے گا۔ ریوالور میں چھ گولیاں ہوں گی۔ محسن اس کی بچی نشانہ بازی سے بچ نہیں سکے گا۔ اسے ہلاک کرنے کے بعد یہ واپس آجائے گا۔ اس کے بعد تم اپنے بال کھول کر اس کی لاش پر روتی رہنا۔ فرمانبردار بیویاں یہی کرتی ہیں۔"

وہ بہت دیر تک محسن کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بناتے رہے۔ پھر ریتا مطمئن ہو کر واپس آگئی۔ اس رات محسن کے باہر جانے کی توقع نہیں تھی کیونکہ پچھلے زخم ابھی تازہ تھے۔ رات آئی تو دس بجے محسن ڈنر کے وقت پینے کے لئے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ اس رات سیاہ بادل اُمڈ اُمڈ کر آرہے تھے۔ وہ گرج رہے تھے اور برس رہے تھے۔ بجلیاں رہ رہ کر کوند رہی تھیں اور بھیانک اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ہوائیں زور زور سے سیٹیاں بجارہی تھیں اور فضا بہت ہی دہشت ناک لگ رہی تھی۔

ایسے میں پروفیسر سامری کار ڈرائیو کررہا تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے ونڈ اسکرین کے پار کا منظر دھندلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بوڑھے کی آنکھیں تیز تھیں اور وہ احتیاط سے ڈرائیو کررہا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈھانچے کے پاس ایک بڑی سی مشین رکھی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے سوچ رکھا تھا کہ ریتا کی کوٹھی کے پاس پہنچ کر وہ پچھلی سیٹ پر آجائے گا۔ اس کے بعد مشین آپریٹ کرے گا لیکن ابھی مشین کے پاس ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔

سڑک بہت ہی خستہ حالت میں تھی۔ جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی۔ اس لئے

اِدھر سے اُدھر ڈگمگا جاتی تھی۔ کار کے ساتھ ڈھانچہ بھی اِدھر سے اُدھر ڈگمگا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کا ہاتھ مشین کے آن والے بٹن پر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھانچہ بھی آن ہوگیا۔ بارش اور طوفان کے شور میں مشین کی دھیمی دھیمی سی آواز دب گئی تھی۔ ڈھانچے کے ڈگمگانے کا عمل جاری تھا۔ کار کے بار بار اچھلنے کے باعث ڈھانچے کا ہاتھ بھی اچھل اچھل کر مختلف بٹنوں پر پڑ رہا تھا۔ ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ پروفیسر کی کھوپڑی کے پیچھے ریوالور شانے پر پہنچ کر رک گیا۔ سڑک تھوڑی دور تک ذرا اچھی حالت میں تھی۔ تھوڑی دور تک پروفیسر کے نصیب بھی اچھے رہے آگے جاکر کار پھر ڈگمگانے لگی۔ بار بار اچھلنے لگی۔ بارش اور طوفان کے شور میں سائیلنسر لگے ریوالور نے شور نہیں مچایا لیکن کار بے قابو ہوگئی اور ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔ پروفیسر کی کھوپڑی میں سوراخ ہوچکا تھا۔ اس کے بعد بھی کھٹا کھٹ فائرنگ ہو رہی تھی۔ کیونکہ فائر والا بٹن بدستور دبا ہوا تھا۔ ریوالور خالی ہوچکا تھا مگر ڈھانچے کی انگلی ٹرائگر پر چلتی جارہی تھی۔ اب نہ تو وہاں مشین کو آف کرنے والا کوئی تھا اور نہ ہی اسے آپریٹ کرکے ڈھانچے کو کوئی باہر نکال سکتا تھا۔ وہ چابی دیئے ہوئے کھلونے کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھا ٹرائیگر دباتا رہا۔

ریتا اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ محسن ڈرائنگ روم میں وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ بہت دیر ہوگئی تھی اور ڈھانچہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ریتا کی گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ اسی وقت زور کی بجلی کوندی۔ ایسی دل ہلا دینے والی آواز تھی کہ ریتا چیخ کر بستر پر گر پڑی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن نے شراب کا جام میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"درو.......... زا.......... کھول.......... ہو.......... دو.........."

سرد ہوائیں دروازے کے باہر تھرتھرا رہی تھیں۔ محسن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پھر ایک بیک اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ باہر وہی ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی محسن کے زخم پھر تازہ ہوگئے۔ وہ اپنی کمزوری کو سمجھ رہا تھا کہ اس بار مقابلہ ہوگا تو ڈھانچے کے ہاتھوں نہیں بچ سکے گا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

ڈھانچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس کی آواز سرد ہواؤں کی سرسراہٹ تھی۔

"محسن! میرے قاتل............ میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ آخر یہاں ہی گیا۔"

"میں تمہارا قاتل نہیں ہوں............ تم کون ہو؟"

"میرا نام راجندر مہتہ ہے۔ میں ریتا کا منگیتر تھا۔ میں نے شادی سے پہلے چندر مکان ریتا کے نام لکھ دیا تھا۔ ایسے ہی وقت تم نے میری منگیتر کو اپنی محبت کے جال پھنسا لیا۔ میں تمہاری سازش سے بے خبر تھا لیکن فیض آباد سے میرے ایک وفادار ملا نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم ریتا کے ساتھ چندر پور آرہے ہو تاکہ مجھے زہر دے کر ہلا کر سکو۔ میرے ملازم نے چندرپور کے اسی مکان کے پتے پر مجھے خط لکھا تھا جسے میں ریتا کے نام کر دیا تھا۔ مگر ان دنوں برفباری ہو رہی تھی' اس لئے وہ مکان مقفل میرے ملازم کا وہ خط اس دروازے سے واپس ہو کر مردہ خطوط کے ذخیرے میں چلا اس طرح مجھے تمہاری سازش کا علم نہیں ہو سکا۔ ایک ہفتے بعد میں برفباری کے منظر لطف اندوز ہونے کے لئے اس مکان میں آیا۔ اس مکان کی ایک چابی میرے پاس تھی۔ اس کے دوسرے ہی دن تم ریتا کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور میری غفلت سے فا اٹھا کر میری وہسکی کی بوتل میں زہر ملا دیا۔ وہاں میرا جو چوکیدار تھا' وہ تم سے ملا ہوا تھا اس نے میری لاش کو چھپانے کے لئے مسلمانوں کے ایک قبرستان میں لے جا کر دفن دیا۔"

اتنا کہہ کر وہ چند لمحات تک ہانپتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"وہاں مانوں کی لاشیں نہلا دھلا کر دفنائی جاتی ہیں۔ وہ پاک صاف ہوتے ہیں ان کے قبرستان میں بھی پاکیزگی ہوتی ہے۔ مگر میں ناپاک تھا۔ مرنے کے بعد بھی ناپاک حالت میں قبر کا عذاب سہتا رہا۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے مہینے اور کتنے سال گزر گئے ۔ پھر ایک رات اس لفافے نے میری ہتھیلی پر آکر مجھے وہاں سے دوبارہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اب میں اپنے قاتل کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ میں ابھی تمہیں ہلاک کر دوں اس کے بعد شمشان گھاٹ پہنچ کر اپنے کسی دھرم والے کی جلتی ہوئی چتا پر لیٹ کر بھسم ہو جاؤں گا۔"

محسن نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو............ آگے نہ بڑھو میں تمہارا قاتل نہیں ہوں۔ تم مجھے مارنے کے بعد پچھتاؤ گے۔ تم پچھلی باتیں ذرا اچھی طرح یاد کرو۔ جب میں ریتا کے ساتھ تمہاری کوٹھی میں مہمان بن کر آیا تھا تو تم نے وہسکی کی بوتل کھول کر دو جام بنائے تھے۔ ایک جام مجھے دیا تھا اور ایک خود اپنے لئے اٹھایا تھا۔ پینے کے دوران ریتا نے بتایا تھا کہ تم بہت بڑے آرٹسٹ ہو۔ تم اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئے۔ مجھے اپنے فن پارے دکھانے کے لئے اپنے ساتھ اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ اس وقت بھی ہم دونوں کے ہاتھوں میں اپنے اپنے شراب کے جام تھے۔ اسٹوڈیو سے واپسی پر پھر میں نے دوسرا جام نہیں لیا اور وہاں ذرا دیر کے لئے بھی نہیں ٹھہرا۔ ریتا کو اپنا مکان دکھانے کے لئے تمہاری کوٹھی سے باہر لے گیا۔ میرا مکان وہاں سے قریب ہی تھا۔ مگر جب میں ریتا کے ساتھ دوبارہ واپس آیا تو وہاں تمہاری لاش پڑی ہوئی تھی۔ تم خود ہی سوچو کہ جب ہم دونوں اسٹوڈیو میں تھے تو ڈرائنگ روم میں کھلی ہوئی بوتل کے پاس ریتا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس بوتل میں زہر کس نے ملایا ہوگا۔ میں نے یا ریتا نے؟"

ڈھانچہ چند لمحوں کے لئے بالکل ساکت ہوگیا۔ اس پر تمام حقیقتیں روشن ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ریتا معصوم اور نادان ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے زہر ملایا تھا۔ میں اس سے پوچھوں گا............ وہ کہاں ہے؟"

محسن نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھانچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنی ہڈیاں کھڑکھڑاتا ہوا بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ریتا اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔

"تت............ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ پروفیسر کہاں ہے؟ اس نے کہا تھا کہ تم محسن کو ہلاک کرو گے۔ کیا وہ ڈرائنگ روم میں نہیں ہے؟"

ڈھانچے نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "تم محسن کو کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہو؟"

"تم یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ پرسوں تو تم باتیں نہیں کر رہے تھے۔ پرسوں تم نے گونگے کی طرح محسن پر حملہ کیا تھا۔"

"اچھا تو تم محسن پر پہلے بھی حملہ کرا چکی ہو؟"

"تم فضول باتیں نہ کرو۔ پروفیسر کہاں ہے؟ وہ کس طرح مشین آپریٹ کر رہا ہے؟ تم محسن کو ہلاک کرنے کیوں نہیں جاتے؟"

ڈھانچے نے پھر سرد لہجے میں پوچھا۔ "پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم نے راجندر مہتہ کو بھی اسی طرح راستے سے ہٹایا تھا؟"

"ہاں۔ اس وقت میں محسن کو پسند کرتی تھی۔ میں نے راجندر مہتہ کی شراب میں زہر ملا دیا تھا تاکہ وہ منگنی ٹوٹنے سے پہلے ہی زندگی سے ٹوٹ جائے.......... میں نے تمہاری بات کا جواب دے دیا' اب محسن کے پاس جاؤ ورنہ وہ بھاگ جائے گا۔"

ڈھانچے نے آگے بڑھ کر اپنے استخوانی پنجوں سے ریتا کی گردن دبوچ لی۔

"میرا شکار مجھ سے نہیں بھاگ سکتا اور اس وقت وہ میرے شکنجے میں ہے۔"

ڈرائنگ روم میں محسن بیٹھا ہوا ایک نیا جام بنا رہا تھا۔ بیڈ روم سے "اونک آغ" کی گھٹی گھٹی سی آواز آ رہی تھی۔ وہ مردہ خط ہوا کی زد میں آ کر لڑھکتا اور لڑکھڑاتا ہوا روم سے باہر آ رہا تھا۔ محسن نے اس مردہ خط کی طرف وہسکی کا جام اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چیئرز.......... گڈ لک فارمی۔"

☆======☆======☆

دل کے لئے

دس لاکھ مالیت کے نایاب ہیروں کی چوری کا انوکھا واقعہ۔ ایک ڈاکٹر نے ان ہیروں کو ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں قانون بے بس تھا۔

ایک ایسی دل کی مریضہ کی کہانی جسے زندہ رکھنے کے لئے وہ پانچ ہیرے لازمی تھے۔

سالگرہ پارٹی ہزاروں کینڈل پاور کی روشنیوں سے جس طرح جگمگا رہی تھی طرح اچانک ہی گہری تاریکی میں ڈوب گئی۔ شاید مین سوئچ آف کر دیا گیا تھا۔ بالکو باہر بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب سے نیون سائن کی دم ہوئی روشنی بالکونی کے راستے اندر آ رہی تھی جس میں تمام مہمانوں کے تاریک یوں نظر آ رہے تھے جیسے بہت سارے بھوت اور بھتنیاں آپس میں ٹکرا کر اِدھر اُ گزر رہے ہوں۔

اس اندھیرے میں شہزادی شاہینہ گم ہو گئی تھی۔ صرف اس کی صراحی دار گرد نولکھا ہار جگمگا رہا تھا۔ گہری تاریکی میں اس کے پانچ عدد ہیرے اپنے چمکتے دمکتے وجود کسی دل والے کو للچا رہے تھے کہ آؤ اور ہمیں اس صبیح گردن کی نزاکت سے اتار کر جاؤ۔

اچانک تاریکی چھا جانے کے باعث وہ ماحول کچھ رومانٹک اور کچھ پُراسرار سا ہو تھا۔ چند حسیناؤں کے منہ سے سہمی سہمی سی ہائے نکل رہی تھی۔ پھر یہ ہائے کسی نہ کے بازوؤں میں سمٹ کر گنگناتی ہوئی سسکیوں میں بدل رہی تھی لیکن شہزادی شاہینہ لئے وہ اندھیرا عذابِ جاں بن گیا تھا۔ اسے کتنے ہی سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آ ر تھے۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان میں سے کون نولکھا ہار کا لالچی ہے اور کو اس کے جسم کے نگینے کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

شہزادی کے مسلح باڈی گارڈز ہال کے اندر آ گئے تھے اور نولکھا ہار کی چمک دیکھ شہزادی کی سمت بڑھتے ہوئے اور مہمانوں سے ٹکراتے ہوئے' معذرت چاہتے جا رہے تھے۔ ان سے پہلے ہی کسی نے شہزادی کے نگینے جیسے جسم کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ سہم کر چیخنا چاہتی تھی لیکن اس قدآور بھوت نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ چیخنے سے پہ ہی اس کے رس بھرے لبوں کو اپنے سفاک ہونٹوں کے درمیان قید کر لیا۔

اس نے تلملا کر آہنی گرفت سے نکلنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ اس گرما گرم آغوش سے نہیں نکل سکے گی۔ اندھیرے میں وہ بھوت ایک آئیڈیل کی طرح اسے پگھلا رہا تھا۔ گلابی گلابی مکھڑے پر اس کی سانسوں کے بھبکے آ رہے تھے۔ وہ مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہ لمحات طویل ہو جائیں لیکن وہ رنگین سپنا جلد ہی ٹوٹ گیا جس طرح بوتل سے کاگ اڑنے کی آواز آتی ہے' ویسی ہی آواز سے بوسہ چیخ کر اڑ گیا اور صراحی دار گردن سے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔

مسلح محافظ ہال کے وسط میں ہی رک گئے تھے۔ شہزادی جیسے ہی اس بھوت کی آغوش میں گئی تھی' ویسے ہی اس نولکھا ہار کے پانچ عدد ہیروں کی چمک بھی اس آغوش میں گم ہو گئی تھی۔ اس لئے محافظ ٹھٹک کر یہ سوچنے لگے کہ شہزادی شاید پلٹ کر جا رہی ہے۔ دوسری طرف گھومنے کے باعث ہیروں کی چمک دمک چھپ گئی ہے۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ انتظار کرنے لگے کہ شہزادی کہیں رک کر پلٹے اور ہیروں کی چمک سمت کا تعین کرے تو وہ اس کی جانب بڑھیں۔

لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ بھوت نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ اب اس بھوت کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ آہنی گرفت اور بوسے کی لذت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کسی کو صورت شکل سے پہچانا نہیں جاتا بلکہ ایک دوسرے کے ہاتھوں اور جسموں کے لمس سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے سانسوں سے اندازہ لگایا تھا کہ اس بھوت کے سینے میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا بوسہ اب بھی انگارے کی طرح اس کے رس بھرے لبوں سے چپکا ہوا تھا۔ اب وہ اس آغوش اور اس بوسے کو دن کے اجالے میں بھی پہچان سکتی تھی (اگر وہ دوبارہ نصیب ہو جاتا)۔

اندھیرے میں کوئی اس سے ٹکرایا تو وہ رنگین خیالات سے چونک گئی۔ چونکتے ہی سب سے پہلے اپنے نیکلس کا خیال آیا پھر وہ گردن اور سینے پر ہاتھ پھیر کر چیخنے لگی۔ ”میرا ہار......... کوئی میرے گلے سے ہار نکال کر لے گیا ہے.........“

اس کی چیخ و پکار سے اندھیرے میں کھلبلی مچ گئی۔ مسلح محافظ تیزی سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے آواز کی سمت جانے لگے۔ اتنی سی دیر میں کتنے ہی لوگوں نے اپنے اپنے لائٹر اور ماچس کی تیلیاں روشن کر لی تھیں۔ لائٹر اور دیا سلائی کی ننھی روشنیاں پہلے بھی ہو سکتی تھیں لیکن نوجوانوں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ زحمت نہیں اٹھائی تھی

لیکن اب بات دوسری تھی۔ ایک بیرونی ملک کی شہزادی چیخ رہی تھی اور یہ خبر سنا رہی کہ کوئی اس کا نولکھا ہار چرا کر لے گیا ہے۔

اس بیش قیمت ہار کو دولتمند عورتوں نے رشک سے دیکھا تھا۔ ہر عورت کی یہ تھی کہ وہ ہار اس کے گلے کی زینت بن جائے۔ اب وہ خوش ہو گئیں کہ ہمیں نہ ملا سہی، چلو شہزادی بھی محروم ہو گئی۔ اس ہار کو تمام مردوں نے بھی تعریفی نظروں سے د تھا۔ یہ سن کر کہ اس حسینہ کے گلے سے ہار غائب ہو گیا ہے، اب ہر مرد کی یہی تمنا تھی وہ آگے بڑھ کر اسے تسلی دے اور تسلی دینے کے بہانے ایک شہزادی کے گلے کا ہار جائے۔

اس طرح تمام لوگ شہزادی کی طرف بڑھنے لگے اور بڑھنے سے زیادہ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے۔ وہ آپس میں ٹکرا رہے تھے، گر رہے تھے، سنبھل رہے تھے۔ خ بھی شور مچاتی ہوئی گر رہی تھیں۔ ایک عجب قیامت کا شور برپا ہو گیا تھا۔ ابھی وقت اچانک چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔

ایک قیمتی ہار کی چوری سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ سوئچ آن ہوتے ہی عمارت کے باہر بھی روشنی پھیل گئی۔ اتنی دیر میں ایک خوش پوش نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت کے مین گیٹ سے باہر آ چکا تھا اور اب فٹ پاتھ تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ وہاں سے پچاس گز آگے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر سٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ سامنے سے گزرنے والی گاڑیوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر سے پھسلتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پانچ عدد ہیروں کے متعلق سوچنا چاہئے تھا جو نولکھا ہار میں جڑے ہوئے تھے اور جو اس وقت اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے لیکن عجب بات یہ تھی کہ وہ خلافِ عادت اس حسین اور نازک سے بدن کے متعلق سوچ رہا تھا جو ایک نگینے کی طرح یوں اس کی آغوش میں سما گیا تھا جیسے نولکھا ہار اس کی جیب میں سمایا ہوا تھا اب تو وہ ماحول نہیں تھا اور وہ اندھیرا بھی نہیں تھا۔ وہ حسینہ بھی آغوش میں نہیں تھی لیکن وہ بار بار خیالوں میں آ رہی تھی اور اس لٹیرے کے دل و دماغ کو لوٹ کر لے جا رہی تھی۔

وہ ایک بدنام چور تھا۔ معمولی ڈکیتی میں اس کا نام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جہاں ہیرے جواہرات کے چرائے جانے کی بات آتی تو سب سے پہلے اسی کا نام آتا۔ پولیس والے اس کی ناکہ بندی شروع کر دیتے اور انٹیلی جنس کے بڑے بڑے افسران اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے تھے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اسے پہلے اپنے بچاؤ کے متعلق سوچنا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ دل و دماغ اپنے اختیار میں نہیں تھے۔ رہ رہ کر اسی نازک اندام نگینے کی طرف بہک رہے تھے۔ اب داستانِ حیات اس رخ پر چل رہی تھی کہ ایک نے اس کی صراحی دار گردن سے نولکھا ہار چرایا تھا، دوسری اس چور کے سینے سے دل چرا کر لے گئی تھی۔

اس نے کئی بار شہزادی شاہینہ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ دل کے چور دروازے سے دماغ میں آتی رہی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے پوری طرح دل کے دروازے کھول دیئے۔ پہلی بار کسی لڑکی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس لئے اس نے کھلی آزادی دے دی کہ آؤ اور مجھے لوٹ لو۔ خیالوں میں لٹ کر کوئی کنگال نہیں ہو جاتا۔

اس کی یہی سوچ غلط تھی کہ خیال ہی خیال میں کوئی کنگال نہیں ہوتا حالانکہ وہ زندگی میں آہستہ آہستہ ذہنی طور پر کنگال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حسینہ بڑی خاموشی سے اس کی سوچ کے خزانے لوٹ رہی تھی۔ مرد اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ عورت خیالوں میں آ کر کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ بگاڑتی اور بناتی رہتی ہے۔ خیالوں سے حقیقی دنیا میں آ کر (شادی کے بعد)۔

اس نے اپنی کار ایک پولیس اسٹیشن کے قریب روک دی۔ کار کے رکتے ہی ایک سیاہ سوٹ میں ادھیڑ عمر کا شخص تیزی سے آیا اور دروازہ کھول کر پاس والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کام ہو گیا؟"

"ہاں!" اس نے کوٹ اتارتے ہوئے جواب دیا۔ "مال کوٹ کی اندرونی جیب میں ہے۔ تم بتاؤ، تمہارا کام ہو گیا؟"

"ہاں!" اس نے بھی جواباً کہا۔ "میں نے تھانیدار کو دو ہزار روپے دے دیئے ہیں۔ تھانیدار نے یہ رپورٹ لکھ لی ہے کہ تم یعنی شاکر جمالی کے مکان پر اس شبہ کی بناء پر چھاپہ مارا گیا تھا کہ اس کے ہاں سے کافی مقدار میں چرس برآمد ہو سکے گی لیکن جمالی نے شاید پہلے ہی چرس کا اسٹاک کہیں دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔ اس کے ہاں صرف ایش ٹرے

میں پڑے ہوئے ایک ٹوٹے میں چرس کے اجزاء پائے گئے ہیں۔ شام کے چھ بجے جمالی کو حراست میں لے کر مالی پور کے تھانے میں لایا گیا اور اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد اگر جرم ثابت نہ ہوا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ فی الحال حوالات میں رکھنے کے لئے یہی جرم کافی ہے کہ وہ چرس کا سگریٹ استعمال کرتا ہے اور اس سگریٹ کا ٹوٹا اس کی ایش ٹرے میں پایا گیا ہے۔"

شاکر جمالی نے تھانے کی جانب دیکھا پھر مطمئن ہو کر پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شام کے چھ بجے سے اس تھانے کی حوالات میں بند ہوں۔ قصرِ سلیمان میں سالگرہ پارٹی ہو رہی ہے' وہاں پونے نو بجے جو ہار چرایا گیا ہے' اس چوری سے میرا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ مالی پور کے تھانے کی رپورٹ کے مطابق میں شام چھ بجے سے ایک قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے حوالات سے رہائی کب نصیب ہوگی؟"

"کل صبح چھ یا سات بجے تک تمہیں رہا کر دیا جائے گا؟"

"ٹھیک ہے۔" جمالی نے اپنا کوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہار دانیال جوہری کے پاس لے جاؤ' اس سے کہو کہ ہار میں سے پانچ عدد ہیرے علیحدہ کر کے انہیں پلاسٹک کے ڈیڑھ انچ کے کیپسول میں رکھ دے۔ اس کے بعد تم وہ کیپسول لے کر ثمینہ کے پاس جانا۔ وہ نیازی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے دو نمبر کمرے میں ہے۔ تین دن کے بعد اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ یہ ہیرے تین دن تک اس کے پاس محفوظ رہیں گے۔ پولیس والے ہم سب سے پوچھ گچھ کرتے رہیں گے لیکن ان کا دھیان ہسپتال کی طرف نہیں جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے جمالی! مگر ثمینہ آج کل ڈاکٹر خاور سے عشق کر رہی ہے۔ ڈاکٹر بھی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ثمینہ جذبات کی رو میں بہہ کر اس کے سامنے ہیروں کا ذکر کر دے۔ ایسی صورت میں اس کا عشق ہمارے لئے مصیبت بن جائے گا۔"

شاکر جمالی آنکھیں سکیڑ کر سوچنے لگا۔ وہ ثمینہ کے متعلق غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر خاور سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار ڈاکٹر کی مسلسل توجہ پر ہے۔ وہ ڈاکٹر کی احسان مند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ احسان کے بوجھ تلے دب کر اسے سب کچھ بتا دے۔ بہرحال ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ تم ثمینہ کو

سمجھا دو کہ وہ تین دن تک اپنی زبان بند رکھے۔ اگر ڈاکٹر خاور کو ہیروں کا علم ہوا تو جمالی دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی پتلون بھی اتارنے لگا۔ اس نے پتلون کے نیچے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ جب وہ کار سے باہر آیا تو اس کے جسم پر قمیض اور پاجامہ تھا اور پاؤں میں چپلیں تھیں۔ اس کا ساتھی کار لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیدل چلتا ہوا تھانے میں آیا۔ تھانیدار نے اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحہ کیا پھر اسے پانچ سو پچپن کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ شاکر جمالی کے لئے حوالات کا دروازہ کھول دے۔

جمالی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا پھر دھواں چھوڑتا ہوا حوالات کے اندر چلا گیا۔ سپاہی حوالات کے آہنی دروازے کو بند کر کے تالا لگانے لگا۔

☆======☆======☆

سالگرہ پارٹی میں آنے والے تمام مہمانوں کو عمارت سے باہر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ قصرِ سلیمان کے چاروں طرف پولیس کے جوان سختی برت رہے تھے اور ملازموں کی بھی تلاشی لئے بغیر انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑے ہال میں بھی تلاشی کا سلسلہ جاری تھا۔ مہمانوں میں ملک کے بڑے بڑے رئیس اور حکومت کے اعلیٰ افسران تھے۔ ان کی جیبوں کی بھی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ سب اپنی توہین محسوس کر رہے تھے لیکن ایک پرائے دیس کی شہزادی کو لوٹا گیا تھا۔ اس طرح اپنے دیس کی عزت پر حرف آ رہا تھا۔ لہٰذا بڑے بڑے لوگوں کو بھی مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی عزت یا اپنی اونچی پوزیشن کا خیال نہ کریں اور تلاشی دینے کے لئے چپ چاپ اپنے کپڑے اتار دیں۔

ایک علیحدہ کمرے میں لیڈی پولیس انسپکٹر اور دو لیڈی کانسٹیبل عورتوں کی باری باری تلاشی لے رہی تھیں لیکن ایک گھنٹے بعد پولیس والوں کو مایوسی ہوئی۔ وہ نولکھا ہار برآمد نہ ہو سکا۔ خفیہ پولیس کا ایک افسر صفدر علی وہاں سادے لباس میں موجود تھا اور ہر شخص کو گہری نظروں سے دیکھتا اور سونگھتا پھر رہا تھا۔ شہزادی ایک بیڈ روم میں آ کر ایزی چیئر پر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ملک کے سفارت خانے کے دو افسر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور اسے یقین دلا رہے تھے کہ وہ قیمتی ہار جلد ہی برآمد کر لیا

جائے گا۔

شہزادی شاہینہ چپ چاپ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اسے ہار کی ضرورت ہے یا چرانے والے کی آرزو ہے۔ ہار بلاشبہ قیمتی تھا اور اس میں جڑے ہوئے ہیرے نایاب تھے۔ اس ہار کو اپنے گلے کی زینت بنا کر وہ ساری دنیا کو یوں فخر سے دیکھتی تھی جیسے وہ تمام انسانوں سے برتری کا تمغہ حاصل کر چکی ہو۔ شہزادی کو اس نولکھا ہار سے اتنی محبت تھی کہ اتنی محبت اسے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اسے کس کی ضرورت ہے۔ ہار کی یا اندھیرے میں آنے والے بھوت کی؟

صفدر علی نے بیڈروم میں آکر اسے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ اطمینان رکھیں۔ چور کتنا ہی چالاک ہو پھر بھی وہ ہم سے بچ کر نہیں جائے گا۔ ہم بہت جلد اسے ہار سمیت گرفتار کرلیں گے۔"

"سچ؟" شہزادی اسے پُرامید نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ صفدر علی نے سمجھا کہ وہ ہار کے لئے بے چین ہے لیکن وہ چور کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ "کیا وہ گرفتار ہو جائے گا؟"

"جی ہاں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ضرور گرفتار کر لیا جائے گا لیکن اس سلسلے میں ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"فرمایئے' میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتی ہوں؟"

"میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے خاطر خواہ جواب دیئے تو میں ان جوابات کی روشنی میں اس چور تک پہنچ جاؤں گا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ چور ابھی اسی عمارت میں موجود ہے؟"

"جی ہاں۔ یہاں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نائٹ چوکیدار' دربان اور دوسرے ملازموں سے یہی پوچھا ہے کہ انہوں نے کسی کو عمارت سے باہر جاتے دیکھا ہے یا نہیں۔ سب کا بیان یہی ہے کہ مہمانوں میں سے ایک بھی شخص باہر نہیں گیا ہے۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ آپ کے قریب آنے والا کوئی مہمان تھا یا ملازم تھا؟ اور یہ بات آپ بتا سکتی ہیں۔"

"میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ اندھیرے میں وہ نظر نہیں آیا تھا۔"

"اس کا نظر آنا اتنا ضروری نہیں ہے۔ ہم اندھیرے میں کسی کو چھو کر اس کے لباس

معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ مہمانوں کی طرح ڈنر سوٹ میں تھا یا ملازموں کے لباس میں۔ وہ بھی اندھیرے میں آپ سے ٹکرایا ہوگا۔ کیا آپ کو اتنا موقع ملا تھا کہ آپ اسے چھو کر محسوس کرسکیں؟"

"ہاں۔ آپ بہت ذہین آفیسر ہیں۔ واقعی میں نے اسے چھو لیا تھا اور یہ یقین سے کہتی ہوں کہ وہ ڈنر سوٹ میں تھا۔ اگر کوئی مہمان باہر نہیں گیا ہے تو ابھی وہ ہال میں موجود ہوگا لیکن آپ محض ڈنر سوٹ کے ذریعہ اس کے گریبان تک کیسے پہنچیں گے؟"

صفدر علی نے کہا۔ "ڈنر سوٹ سے اتنا تو ثابت ہو گیا ہے کہ وہ کوئی معزز مہمان ہے۔ اب میں آپ سے دوسرا سوال کرتا ہوں۔ نیکلس اتارتے وقت اس کی انگلیاں آپ کی گردن یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے ضرور مس ہوئی ہوں گی۔ آپ ذرا اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ وہ انگلیاں موٹی تھیں یا پتلی' سخت تھیں یا ملائم۔ دیکھئے' اندھیرے میں اور گھبراہٹ میں اکثر عورتیں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتی ہیں لیکن آپ جیسی کنواری دوشیزائیں اس عمر میں بڑی حساس ہوتی ہیں اور کسی بھی مرد کے ہاتھوں کے لمس کو بڑی سنجیدگی سے محسوس کرتی ہیں۔ میرے اس سوال میں ذرا بے تکلفی ہے لیکن میں مجبور ہو کر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ ان اجنبی انگلیوں کو اب بھی محسوس کرسکتی ہیں؟"

شہزادی شاہینہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ وقتی طور پر زبان چپ ہو گئی اور تصور کے دریچے کھل گئے۔ وہ سخت فولادی انگلیاں اس کی گردن پر سرسرانے لگیں۔ بوسے کے دوران ان انگلیوں نے گردن پر پھیلے ہوئے بالوں کو سختی سے جکڑ لیا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی لیکن ایسی راحت بھی مل رہی تھی کہ اس راحت کے لئے وہ بار بار ان ظالم انگلیوں کی تمنا کرسکتی تھی۔

صفدر علی ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے شہزادی کے شگفتہ چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک چور کی انگلیوں کے ذکر سے اس حسینہ کا چہرہ کیوں تمتما رہا ہے اور غزالی آنکھیں یوں لگ رہی ہیں جیسے خواب میں کھو گئی ہوں۔

آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نولکھا ہار سینے کے ابھاروں تک پھیلا ہوا تھا۔ چور کی انگلیاں یقیناً نشیب و فراز میں بھٹک گئی ہوں گی اور شہزادی جذباتی انداز میں ابھی تک ان انگلیوں کو محسوس کر رہی ہے۔ صفدر نے کسی حد تک اس کی کمزوریوں کو بھانپتے ہوئے دوبارہ وہی سوال کیا۔ "کیا آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی وہ انگلیاں کیسی

تھیں؟"

"وہ ایک مرد کی انگلیاں تھیں۔ سخت' کھردری۔ ایک چور کی بے رحم انگلیاں ایک محبوب کی طرح مہربان انگلیاں.........." وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی بڑبڑاتی رہی۔ یک بیک اس نے چونک کر پوچھا۔ "آں......... میں نے ابھی کیا کہا ہے؟"

صفدر نے مسکرا کر کہا۔ "جس انداز میں آپ نے انگلیوں کی خوبیاں بیان کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں بہت دیر تک پوری توجہ اور دلچسپی سے محسوس کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ مجھے آپ سے کتنا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے باہر جا کر اب صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ میں رکھوں گا جن کی انگلیاں مضبوط' سخت کھردری ہوں گی اور جتنے مہمان مردوں کے ہاتھ ملائم ہوں گے' میں انہیں یہاں سے رخصت کر دوں گا۔ اس طرح مہمانوں کی بھیڑ چھٹ جائے گی اور میں رفتہ رفتہ اس مہمان یا چور تک پہنچ جاؤں گا لیکن ابھی چند سوالات اور ہیں۔"

"فرمایئے۔ میں بخوشی جواب دوں گی۔"

صفدر علی نے سوال کیا۔ "کیا آپ نے تاریکی میں اس کی جسامت کا اندازہ کیا تھا؟"

وہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔ خیالوں میں وہی اندھیرا تھا اور وہی بھاری بھرکم اجنبی وہ اس کی آغوش میں یوں سمائی ہوئی تھی جیسے ہیرے کی کنی انگوٹھی میں سما گئی ہو۔ تاریکی میں اس نے احساس کی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اجنبی کا سینہ چٹان کی طرح تھا' بازو فولادی تھے اور قد اتنا اونچا تھا کہ وہ بوسے کی تکمیل کے لئے آپ ہی آپ کے بل اٹھ گئی تھی۔ پھر بھی اس کے قد کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ آخر میں اجنبی نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

صفدر علی دوسری بار شہزادی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر تاڑ گیا کہ شہزادی ہار چوری ہو جانے کے باعث گم صم نہیں ہے بلکہ چور کے رنگین و سنگین تصور میں ہوئی ہے۔

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "اگر وہ چور گرفتار ہو جائے تو آپ اسے معاف کریں گی یا سزا دینا پسند کریں گی؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "اس نے میرا ہار چرایا ہے۔ وہ میرا مجرم ہے۔ میں طور پر اسے سزا دوں گی۔"

صفدر علی نے کہا۔ "لیکن وہ ہمارے ملک کا مجرم ہے۔ ہمارے ملک میں اس نے جرم کیا ہے۔ اسے سزا بھی یہاں کی عدالت سے ملے گی۔ چونکہ اس کے اس جرم سے ہمارے ملک کی بدنامی ہو گی اور خارجہ پالیسی پر حرف آئے گا' اس لئے اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے سات سال قید بامشقت ہو گی۔ اس کے علاوہ بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا ہو گا۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا اس کی زندگی کے سات سال یونہی ضائع ہو جائیں گے؟" پھر وہ خود ہی جواب سوچنے لگی کہ نہیں۔ اس نوجوان کی زندگی کے سات سال' سات سو سال اور سات ہزار سال میری زلفوں کے سائے میں گزرنے چاہئیں۔ اسے قید بامشقت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کی آغوش میں قید بامحبت کی سزا پاؤں گی۔

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی کہ اسے سزا دی جائے۔ یہ معاملہ یہیں ختم کر دیجئے۔"

صفدر علی نے جواب دیا۔ "معاملہ ختم کرنا یا کسی کے جرم کو چھپانا بھی ایک جرم ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "اگر ایک جرم کو چھپا کر آپ اپنے ملک کو بدنامی سے بچا سکتے ہیں تو اسے ضرور چھپانا چاہئے' میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمارے سفارت خانے میں یہ معاملہ ختم کر دیا جائے گا' بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ہمارے اخبارات نیکلس کی چوری کی خبریں شائع نہیں کریں گے۔"

صفدر علی سوچ میں گم ہو گیا۔ اب مصلحت یہی تھی کہ وہ اپنے ملک کو بدنامی سے بچا لیتا۔ شہزادی جذبات کی رو میں نولکھا ہار کی چوری کو نظر انداز کر رہی تھی۔ صفدر نے اس کے مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ملک کی خاطر آپ کے اس مشورے کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کچھ ذاتی قسم کی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس گفتگو کا تعلق اس چور سے بھی ہے۔"

شہزادی نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سفارت خانے کے دونوں افسروں سے کہا کہ وہ بیڈ روم سے جائیں اور اپنے سفارت خانے سے نیکلس چوری کی خبر شائع نہ کریں اور اس کے آئندہ احکامات کا انتظار کریں۔

دونوں آفیسر اس کے حکم کے مطابق وہاں سے چلے گئے۔ شہزادی نے صفدر سے

پوچھا۔ "ہاں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس چور کو سزا سے کیوں بچا رہی ہیں۔ درست ہے کہ آپ کی نظروں میں نو دس لاکھ روپے کے ہار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ نولکھا ہار کو یوں بھول گئی ہیں جیسے دو چار پیسے گم ہو گئے ہوں لیکن اس چور کو معاف کر کے آپ کو کیا حاصل ہو گا جبکہ آپ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ ایک اندھیرے کی پہچان ہے جو اجالے میں گم ہو جاتی ہے۔ آپ اس پر مہربان ہونے کے باوجود اسے روشنی میں نہیں پہچان سکتیں' کیا آپ پہچان سکتی ہیں؟"

"نہیں۔ آپ درست کہتے ہیں۔ میں اسے روشنی میں نہیں پہچان سکتی۔"

"کیا آپ نہیں چاہتیں کہ وہ روشنی میں آپ کے سامنے آ جائے؟"

"ہاں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے سامنے آ جائے لیکن قانون کے سامنے نہ آئے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ وہ دونوں کے سامنے آئے مگر آپ کی خاطر اسے سزا نہ ملے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" شہزادی نے خوش ہو کر پوچھا۔ "اگر آپ نے اسے سزا (سے) بچا لیا اور میرے سامنے لے آئے تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دے سکتی ہوں۔"

"میں انعام نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ ہار ایک مجرم کے پاس نہ رہے۔ آپ کو واپس مل جائے اور آپ اسے پہن کر اپنے ملک واپس چلی جائیں۔ ہم انٹیلی جنس والے ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔"

"آپ ایک فرض شناس آفیسر ہیں لیکن اس چور کا کیا بنے گا؟"

صفدر نے جواب دیا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ ہم اس کے پاس سے ہار برآمد کریں گے' لیکن ہار کی چوری کا ذکر کسی کی زبان پر نہیں آئے گا۔ اس چور پر کوئی دوسرا الزام عائد کر کے اسے ملک بدر کرایا جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں گی تو اسے آپ کے ملک کی شہریت حاصل ہو جائے گی۔"

"یہ اچھا آئیڈیا ہے' اگر وہ اس ملک سے نکالا گیا تو میں اسے اپنے ہاں پناہ دوں گی۔"

"اچھا تو پھر اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیجئے۔ یہ بتایئے کہ اندھیرے میں کتنی دیر تک آپ کے قریب رہا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس وقت مجھے وقت کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑے رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ازل سے اس کی آغوش میں تھی اور ابد تک رہوں گی' لیکن جب وہ چلا گیا تو یوں لگا جیسے وہ ایک چٹکی وقت لے کر آیا تھا اور پلک جھپکتے ہی واپس چلا گیا لیکن میں یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ کتنی دیر تک میرے قریب رہا۔

"ہاں یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ آپ جیسا قد آور تھا' لیکن آپ جیسا دبلا پتلا نہیں تھا۔ اس کا سینہ چٹان کی طرح چوڑا تھا اور بازو فولاد کی طرح سخت تھے۔ اگر ایک بار اندھیرا ہو جائے' اگر ایک بار وہ اندھیرے میں آ جائے تو میں اسے پہچان لوں گی۔"

"آپ کیسے پہچان لیں گی؟"

وہ اس سوال کا جواب کسی مرد کو نہیں دے سکتی تھی' یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ عورت اندھیرے میں مرد کو اس کے چہرے سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے اسے پہچانتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "اندھیرے میں آنکھیں نہیں دیکھتیں مگر دماغ دیکھتا اور سمجھتا رہتا ہے اور تاریکی میں عورتوں کی حس بہت تیز ہو ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی' بس میں اسے پہچان لوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ اگر آپ اسے پہچان لیں گی تو پھر میں ایک کام کرتا ہوں۔ میں ہال میں جا کر صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ کے لئے روکتا ہوں جو قد آور ہیں' سینہ چٹان کی طرح چوڑا ہے' بازو فولاد ہیں اور انگلیاں موٹی' مضبوط اور کھردری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے مہمان تعداد میں دو چار ہی ہوں گے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک وقت میں ایک مہمان کو اس بیڈ روم میں بھیجوں گا۔ آپ یہاں کی تمام لائٹس بجھا دیں' تاریکی میں خوف محسوس ہو تو ایک زیرو پاور کا بلب روشن کر لیں پھر اس نیم تاریکی میں اس آنے والے شخص کو پہچاننے کی کوشش کریں' کیا آپ اس طرح اسے شناخت کر لیں گی؟"

"ہاں۔ یہ اچھی تدبیر ہے۔" وہ راضی ہو گئی۔ صفدر علی بیڈ روم سے باہر چلا گیا۔ شہزادی شاہینہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام بتیاں بجھا دیں اور ایک زیرو پاور کا بلب روشن کر کے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں پھر وہی اجنبی اس [illegible] حواس پر چھایا رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی ایک بوسے کی سفاکی کو اور سانسوں کی آنچ کو اپنے لبوں اور چہرے پر محسوس کرتی رہی۔ آدھ گھنٹے کے بعد صفدر نے آ کر کہا۔ "صرف تین ہی مہمان ایسے ہیں

جو آپ کے بیان کے مطابق قد آور ہیں' سینہ چٹان ہے' بازو فولاد کے ہیں اور انگلیاں موٹی' مضبوط' سخت کھردری ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پہلے ایک مہمان کو یہاں بھیج دوں۔"

شہزادی نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ صفدر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ایک لمبا تڑنگا صحت مند نوجوان دستک دے کر بیڈ روم میں آیا۔ شہزادی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نوجوان نے کہا۔ "مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کی خواب گاہ میں حاضر ہوں۔ آپ مجرم کو پہچاننا چاہتی ہیں۔ یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ مجھ جیسا رئیس اعظم بھی ایک ملزم کی طرح حاضر ہو رہا ہے۔ نولکھا ہار کی اہمیت ہی کیا ہے' میں ابھی کھڑے کھڑے دس لاکھ روپے کا چیک لکھ سکتا ہوں۔"

شہزادی نے کہا۔ "آپ بیس لاکھ بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن اس ہار کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ہیرے نایاب ہیں۔ آپ لاکھوں ڈالر دے کر بھی وہ ہیرے کہیں سے نہیں لا سکتے' بہرحال میں نے یہاں آپ کو صرف پہچاننے کے لئے طلب کیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے بالکل قریب آ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانے پر اس طرح رکھ دیئے جیسے اس کے گلے میں بانہیں ڈالنا چاہتی ہو۔ نوجوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہزادی اس طرح اچانک بے تکلفی سے اس کے گلے کا ہار بن جائے گی۔ وہ چند لمحوں تک حیرت زدہ رہا پھر مارے خوشی کے اس کی بتیسی نکل آئی۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ ایک شہزادی اس پر مر مٹی تھی' اس نے فوراً ہی اسے اپنے فولادی بازوؤں کے حصار میں لے لیا اور اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگا۔

شہزادی اچانک ہی تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔ پھر ڈانٹ کر بولی۔ "یہ بیہودگی ہے' چلے جاؤ یہاں سے 'گیٹ آؤٹ.........."

نوجوان بوکھلا کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی صاحبہ پہل آپ نے کی تھی' لیکن دوسری بار اس کے منہ سے "گیٹ آؤٹ" کے الفاظ سنے تو وہاں ٹھہرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد دو اور مہمان یکے بعد دیگرے آئے۔ شہزادی نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ کسی کے بھی پیار میں اسے اجنبی کے پیار کی جھلک نظر نہیں آئی' ان میں اور اجنبی کے درمیان یہ فرق تھا کہ ان تینوں نے شہزادی کو بڑے احترام سے آغوش میں سمیٹ کر پیار کیا تھا لیکن اجنبی نے اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھینچ لیا تھا۔

شہزادی سمجھ کر تو سب ہی پیار کی بھیک مانگتے تھے' مگر پیار چھین لینے والا وہی ایک چور تھا جو لاپتہ تھا۔

صفدر علی کو شہزادی کی مایوسی کا علم ہوا تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ان مہمانوں میں کوئی چور نہیں ہے۔ چور باہر سے آیا تھا' اندھیرے میں آیا تھا اور اندھیرے میں کام بنا کر چلا گیا۔

ایسے وقت صفدر کے ذہن میں سب سے پہلے شاکر جمالی کا نام آیا کیونکہ وہ بھی قد آور تھا۔ شہزادی نے اس اجنبی کی جتنی خصوصیات بیان کی تھیں' وہ سب جمالی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ پھر یہ کہ ہیرے جواہرات کی چوریوں میں خاصا بدنام تھا۔

صفدر نے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھا کر مالی پور کے تھانے سے رابطہ قائم کیا۔ شاکر جمالی مالی پور کے علاقہ میں رہتا تھا' اس لئے وہاں کے تھانے والے فوراً اس کی ناکہ بندی کر سکتے تھے۔ تھانیدار سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔ "میں صفدر علی بول رہا ہوں۔ آپ فوراً شاکر جمالی کو تلاش کریں' وہ جہاں بھی ہو اسے حراست میں لے کر مجھے اطلاع دیں۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

دوسری طرف سے تھانیدار نے کہا۔ "آپ یہاں تھانے تشریف لے آئیں۔ شاکر جمالی شام چھ بجے سے حوالات میں بند ہے۔"

صفدر یہ سن کر مایوس ہو گیا کہ جمالی شام چھ بجے سے حوالات میں ہے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے نیکلس نہیں چرایا ہے۔ تھانیدار بتا رہا تھا کہ اسے کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے' صفدر بے دلی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے چور تک پہنچنے کے لئے کس طرف قدم اٹھانا چاہئے۔

پھر اسے دانیال جوہری کا خیال آیا۔ وہ چوری کا مال خریدنے کے سلسلے میں بدنام تھا۔ اس نے تھانیدار سے رابطہ قائم کر کے اس علاقہ کے تھانے سے رابطہ قائم کیا' جہاں دانیال جوہری رہتا تھا۔ اس نے تھانے کے انچارج سے کہا۔ "میں صفدر علی بول رہا ہوں۔ آپ فوراً دانیال جوہری کو چیک کریں۔ یہ معلوم کریں کہ آج رات ساڑھے آٹھ بجے سے اب تک کون کون اس سے ملنے آیا تھا۔ میں بھی کچھ دیر بعد وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کر شہزادی شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایزی چیئر پر بیٹھی فانوس کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ صفدر نے سمجھ لیا کہ وہ خیالوں کے

اندھیرے میں اس چور کے ۔گر لگ رہی ہے جو اس کے گلے کا ہار لے گیا۔

☆------☆------☆

ثمینہ اسپیشل وارڈ کے کمرے میں آرام دہ بستر پر دائیں کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بائیں کروٹ اس لئے نہیں لیٹ سکتی تھی کہ وہ دل کی مریضہ تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ڈاکٹر خاور کے اختیار میں تھیں کیونکہ اس کے سینے میں جو بیمار دل تھا وہ اپنی رفتار بھول گیا تھا۔ ڈاکٹر بیٹری کے ذریعے اس کے دل کی دھڑکنوں کو برقرار رکھتا تھا۔

وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی ٹائم پیس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رات کے دو بجے تھے ٹائم پیس سے ابھرنے والی ٹک ٹک کی آواز سن کر وہ سوچ رہی تھی کہ ایک گھڑی کی طرح اس کے دل کی دھڑکنیں بھی انسانی دماغ اور ہاتھوں کی محتاج ہیں، جب تک چابی نہ دو گھڑی نہیں چلتی، جب تک بیٹری نہ لگاؤ، اس مریضہ کا دل حرکت نہیں کرتا۔ اگر کبھی ایک بیٹری کی قوت کمزور پڑنے لگتی تو ڈاکٹر اس کی جگہ دوسری نئی بیٹری لگا دیتا تھا۔

وہ بہت ہی محتاط زندگی گزار رہی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ تیزی سے نہیں چلتی تھی، تیزی سے نہیں بولتی تھی۔ اچھلنا کودنا تو برسوں سے بھول چکی تھی۔ غرضیکہ کوئی ایسا کام نہیں کرتی تھی جس سے بیٹری کو جھٹکا پہنچے، اگر بیٹری لرز جائے تو دل کی دھڑکنوں کا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور پٹ سے اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کا مصنوعی دل ہر مصنوعی چیز کی طرح کمزور تھا۔

اس وقت پانچ عدد ہیرے اس کے تکئے کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ وہ بار بار تکئے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کے اس کیپسول کو چھو رہی تھی جس میں وہ نایاب ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پا کر اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا اور وہ دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ حد سے زیادہ خوشی ملے تب بھی بے تحاشا دھڑکنے کے باعث دل کی حالت بگڑ جائے گی اور بیٹری کی کارکردگی میں بھی فرق آجائے گا۔

لیکن وہ خوش ہونے پر مجبور تھی۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات ہر عورت کی کمزوری ہوتے ہیں۔ ثمینہ کچھ زیادہ ہی ہیروں کی خواہش مند تھی۔ ایسے ہی چمکنے والے پتھروں کے لالچ میں اس نے شاکر جمالی سے دوستی کی تھی پھر چوری کا مال چھپانے کے سلسلے میں اس کی قابل اعتماد دوست بن گئی تھی لیکن ایسے ہیرے موتی اس کے پاس نہ

نہیں رہتے تھے۔ چوری کا کیس ٹھنڈا پڑتے ہی جمالی تمام چوری کا مال اس سے واپس لے کر چلا جاتا تھا اور اس خدمت کے عوض اسے دو چار ہزار روپے دے دیا کرتا تھا۔

لیکن آج ثمینہ کی نیت بدل گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پانچ عدد ہیرے اگر جمالی کو واپس نہ کئے جائیں تو وہ کیا بگاڑ لے گا۔ ڈاکٹر خاور اگلے ہفتے اسے سوئٹزر لینڈ لے کر جا رہا تھا۔ یہ ملک چھوڑتے ہی شاکر جمالی سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا اور تنہا ان ہیروں کی مالکہ بن جاتی۔ وہ ہیرے ملک سے باہر لے جانے کے لئے اس نے ڈاکٹر خاور کو اپنا رازدار بنایا تھا۔

پہلے تو ڈاکٹر نے سمجھایا تھا کہ اسے اپنے پاس چوری کا مال نہیں رکھنا چاہئے، لیکن اس کے انکار پر وہ رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کیونکہ حد سے زیادہ صدمہ ہو تو دل ڈوبنے لگتا ہے اور اس طرح بھی بیٹری کی کارکردگی میں فرق آجاتا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھے، اپنے ہاتھوں سے اس لئے آنسو پونچھے کہ وہ محض ایک ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس کا عاشق بھی تھا۔ اس نے ایک عاشق کی طرح قسم کھائی اور وعدہ کیا کہ وہ ہر حال میں ان ہیروں کی حفاظت کرے گا اور انہیں چھپا کر اس ملک سے باہر لے جائے گا۔

ثمینہ کی زندگی چند روزہ تھی۔ اگر ایک پل کی بھی زندگی ہوتی تو وہ ان ہیروں کو کلیجے سے لگائی اور مرجاتی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کو طویل تر کرنے میں مصروف تھا، وہ اس لئے بھی ہیروں کا لالچ کر رہی تھی کہ ڈاکٹر اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اسے زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہیروں کی خواہش اس کی آخری خواہش ہو، اسی لئے ڈاکٹر نے اسے خوش رکھنے کے لئے یہ بات بھی مان لی تھی جو سراسر خلافِ قانون تھی۔

وہ تکئے کے نیچے سے کیپسول نکال کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار کیپسول کھول کر پانچ عدد ہیرے اپنی مٹھی میں لے کر دیکھ چکی تھی۔ وہ ہیرے سائز میں چنے کے دانے کے برابر تھے۔ ان میں ایسی ہلکی ہلکی سی میٹھی میٹھی سی چمک تھی کہ بار بار انہیں دیکھنے کو دل چاہتا تھا لیکن ہسپتال میں انہیں بار بار کھولنا مناسب نہ تھا۔ ہیرے کیپسول کے باہر ہوں یا اندر ہوں، فی الحال اس کی ملکیت تھے۔ اس لئے وہ کیپسول کو مٹھی میں لے لے کر خود کو تسکین پہنچا رہی تھی۔

دروازے پر آہٹ سن کر اس نے جلدی سے کیپسول کو تکئے کے نیچے رکھ
ایک نرس دروازہ کھول کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹیلی فون اور دوسرے
ہاتھ میں ریسیور تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "ڈاکٹر خاور آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون سرہانے کی میز پر رکھ دیا اور ریسیور ثمینہ کے ہاتھ
دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ثمینہ نے ماؤتھ پیس پر بڑی محبت سے پکارا۔ "ہیلو خاور
آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"ہاں جاگ رہا ہوں اور تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ میں نے نرس سے کہہ دیا تھا کہ
تمہیں نیند سے بیدار نہ کرے' کیا تم سو رہی تھیں؟"

"نہیں۔ میں بھی جاگ رہی تھی اور آپ کو یاد کر رہی تھی۔"

"پھر تو میں خوش نصیب ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ' وہ ہیرے مل گئے؟"

"ہاں۔ ابھی جمالی کا ایک آدمی یہاں پہنچا کر گیا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ جمالی
دھن کا پکا ہے۔ وہ شہزادی کے ہار سے ان ہیروں کو اڑا لائے گا۔ اس وقت وہ میرے
سرہانے رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ اتنے خوبصورت ہیں کہ ان پر آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ آپ
آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کسٹم والوں سے انہیں چھپا کر ملک سے باہر لے جائیں گے۔
آپ اپنا وعدہ پورا کریں گے نا؟"

"ہاں' میں تمہاری خاطر یہ وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ ہم اگلے ہفتے سوئٹزرلینڈ
جائیں گے۔ میں نے ابھی فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح تمہاری بیٹری چینج کر دی جائے تاکہ
طویل سفر کے لئے مکمل طور سے صحت یاب رہو۔ ابھی میرا مشورہ ہے کہ تم اطمینان
سو جاؤ۔ میں نے نرس سے کہہ دیا ہے کہ وہ انجکشن لگائے گی تو تمہیں نیند آ جائے گی۔"

"خاور! مجھے نیند تو آ جائے گی مگر ڈرتی ہوں کہ یہ ہیرے کہاں چھپاؤں۔ کوئی چرا
لے گیا تو میرا دم نکل جائے گا۔"

"مرنے کی باتیں نہ کرو' ہمیشہ زندہ رہنے کی لگن میں رہو۔ کیا وہ ہیرے کسی ڈبیا
میں ہیں؟"

"نہیں۔ ایک پلاسٹک کے کیپسول میں ہیں۔"

"کیپسول کا سائز کیا ہو گا؟"

"یہ لمبائی تقریباً سوا یا ڈیڑھ انچ ہے۔"

"ٹھیک ہے' بہت ہی ننھا سا کیپسول ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں تو عورتیں اپنی
چولی میں چھپا لیتی ہیں۔"

ثمینہ ہنسنے لگی۔ "آپ ایسی باتیں نہ کریں' مجھے شرم آتی ہے۔ ویسے میں چولی کے
اندر نہیں رکھوں گی۔ اگر نرس دوا پلانے آئے گی تو اسے وہ کیپسول نظر آ جائے گا۔ اچھا
اب آپ مشورہ نہ دیں' میں اسے ایک جگہ چھپا لوں گی۔"

"ایسی اور کون سی جگہ ہے جہاں ڈیڑھ انچ کا کیپسول چھپایا جا سکتا ہے؟"

"ایسی ایک جگہ ہے' آپ نہ پوچھیں۔"

"بھئی بتا دو نا' ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"توبہ ہے' آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ بھئی اور کہاں چھپاؤں گی' شلوار کے نیفے
میں رکھوں گی۔ صبح آ کر آپ لے لیجئے گا۔"

"ہائے۔ جانے صبح کب ہو گی' اب میں اسی انتظار میں سو رہا ہوں۔ تم بھی سو جاؤ'
خدا حافظ!"

فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ثمینہ نے ریسیور رکھ کر تکئے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور مٹھی
میں کیپسول کو لے کر شلوار کا ازار بند کھولنے لگی۔

☆======☆======☆

صبح ہوتے ہی صفدر علی کو جماہیاں آنے لگیں۔ وہ اپنے دفتر میں تمام رات جاگتا رہا تھا اور فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا رہا تھا کہ انہیں شہر کے کتنے چوروں کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ اس کے ایک ماتحت نے رات کے گیارہ بجے دانیال جوہری کا محاسبہ کیا تھا۔ اس کی کوٹھی کے احاطے میں اس نے وہ کار بھی دیکھی جس میں شاکر جمالی بیٹھ کر سلیمان سے مالی پور تھانے تک گیا تھا۔ پھر اس کا ایک ساتھی راجر اس کار کو تھانے سے دانیال جوہری کی رہائش گاہ تک لے آیا تھا۔

صفدر کا ماتحت یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کار کہاں کہاں استعمال کی گئی ہے لیکن اس نے دانیال کے ڈرائنگ روم میں راجر کو دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شاکر جمالی کا دست راست ہے۔ بڑی بڑی چوریوں کے کیسز میں جمالی کے ساتھ جو لوگ ملوث ہوئے تھے' ان میں راجر اور جولی خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ کئی بار ضمنی طور پر ثمینہ کا نام بھی آیا تھا لیکن ثابت نہ ہو سکا کہ ایک دل کی مریضہ جمالی کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ پھر وہ بہت بڑے ہارٹ سرجن ڈاکٹر خاور کے زیر علاج آ گئی اور رفتہ رفتہ اس کی محبوبہ بن گئی۔ اس کے بعد ان کی منگیتر بن گئی تو سوسائٹی میں اس کی عزت ہونے لگی اور قانون کے محافظ بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔

بہرحال رات کے سوا گیارہ بجے صفدر نے اپنے ماتحت کا فون ریسیو کیا اور اس پر یہ بھید کھلا کہ شاکر جمالی تو حوالات میں ہے لیکن اس کا ساتھی دانیال کے پاس گیا ہوا ہے۔ تو صفدر نے جمالی کے تمام ساتھیوں کے پیچھے خفیہ پولیس کے آدمی لگا دیئے۔ اس کا ساتھی دانیال کی کوٹھی سے واپس چلا گیا تھا۔ راجر نے سمجھا کہ اس پر شبہ نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ پانچ عدد ہیرے کیپسول میں رکھ کر ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے دانیال سے وہ ہار بھی لے لیا تھا جن سے وہ ہیرے نکال کر کیپسول میں رکھے گئے تھے۔ ہیروں سے خالی ہونے کے باوجود اب بھی اس ہار کی قیمت تقریباً تیس ہزار سے زیادہ ہو سکتی تھی

کیونکہ سونے کے اس ہار میں جگہ جگہ سچے موتی جڑے ہوئے تھے۔ راجر نے سوچا کہ ہیرے ثمینہ کے حوالے کرنے کے بعد وہ اپنے کاٹیج میں جائے گا اور اپنی بیوی جولی کو وہ قیمتی ہار تحفے کے طور پر پیش کرے گا۔

وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا' اسے شبہ تک نہ ہو سکا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے ثمینہ سے ملاقات کی' جمالی کا پیغام پہنچایا اور کیپسول اس کے حوالے کر کے ہسپتال سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ہولے ہولے سیٹی بجاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں ایک ایمبولینس اور ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں گاڑیاں خالی تھیں۔ لہٰذا وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ پولیس والوں کی جیپ ہے۔ وہ اطمینان سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر آیا اور اپنے کاٹیج کی طرف جانے لگا۔

کاٹیج شہر کے آخری سرے پر تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ ایک جیپ مسلسل اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ فوراً ہی کار کی رفتار بڑھا کر راستے بدلنے لگا تاکہ تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دے سکے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چاندنی رات تھی' تمام راستے روشن تھے۔ بار بار فریب کھانے کے بعد بھی جیپ اسی راستے پر چلی آتی تھی جس راستے سے گزر کر اسے کاٹیج تک پہنچنا تھا۔ اس تعاقب سے راجر سمجھ گیا کہ وہ پولیس والے ہیں اور شاکر جمالی کے تمام ساتھیوں کے نام پتے اور ٹھکانے جانتے ہیں۔

اب ان سے بچنے کی یہی صورت نظر آئی کہ کار میں رکھا ہوا ہار چلتی کار سے کہیں پھینک دے تاکہ اس پر اتنی بڑی چوری کا الزام عائد نہ ہو لیکن وہ ہار ہیروں سے خالی ہونے کے باوجود بہت قیمتی تھا۔ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ جانے پولیس والے کب سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے ہسپتال کے اندر بھی جاتے دیکھا ہو گا' تب اسے ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی جیپ یاد آ گئی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ پولیس والوں نے دور تک جال پھیلا رکھا ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ جولی تک بھی پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ جیپ بھی تیزی سے آ رہی تھی لیکن کار کی رفتار کا پیچھا نہیں کر سکتی تھی' اس لئے پیچھے رہ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ کاٹیج

قریب آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے کار کا ہارن بجایا تاکہ جولی سو رہی ہو تو اٹھ کر دروازہ کھول دے۔

اکثر عورتیں گہری نیند میں بھی اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ سن لیتی ہیں۔ اسی طرح جولی نے بھی راجر کی گاڑی کے ہارن کو سن لیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ وہ راستہ سیدھا کھڑکی کی طرف آتا تھا' پھر دروازے کی طرف مڑ جاتا تھا۔ اس نے چاندنی میں راجر کی گاڑی پہچان لی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

راجر کی کار دروازے کے سامنے آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے کار سے اترتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "جولی! گن نکالو۔ پولیس والوں سے مقابلہ ہے۔"

جولی دروازے سے بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راجر کار سے اتر کر دوڑتا ہوا کاٹیج میں آیا اور دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ لکڑیوں سے بنا ہوا وہ پرانا کاٹیج تھا۔ دروازہ زور سے بند کرنے یا کھولنے سے لکڑی کی دیواریں لرزنے لگتی تھیں۔ جولی فوراً ہی دو اسٹین گن لے آئی۔ راجر نے ایک گن اپنے ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں چھت پر جا رہا ہوں۔ تم یہاں کھڑکی پر مورچہ سنبھالو۔"

"آخر ہم پولیس کی نظروں میں کیسے آ گئے؟"

راجر نے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ شہزادی شاہینہ کا نولکھا ہار اس وقت میری جیب میں ہے۔"

مارے خوشی کے جولی کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ راجر کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ "جولی! ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ یہ پولیس کے دو چار آدمی بچ کر نہ جانے پائیں۔ یہ بچ گئے تو اپنے افسروں کے پاس پہنچ کر ہماری نشاندہی کریں گے........"

یہ کہنے کے دوران وہ چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے چھت اور دیواریں یوں کراہتی ہوئی ہل رہی تھیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ جولی مورچہ سنبھال کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت دور سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جولی کی نظریں دور راستے کے موڑ پر جم گئیں۔ جیپ اپنی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ پولیس والے راجر کے ٹھکانے سے واقف تھے' اس لئے اطمینان سے چلے آ رہے تھے۔

پھر وہ جیپ عین کھڑکی کے سامنے پچاس گز کی دوری پر نظر آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی جولی نے فائرنگ شروع کر دی۔ جیپ والے بھی محتاط تھے۔ وہ سب جیپ کے دائیں

چھلانگ لگا کر راستے کے کنارے جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ ایسی صورت میں گاڑی کو رک جانا چاہئے تھا لیکن وہ آپ ہی آپ کاٹیج کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔

جولی نے بوکھلا کر فائرنگ کی تاکہ گاڑی رک جائے۔ مگر کاٹیج نشیب میں تھا اور گاڑی راستے کی اونچائی سے نشیب کی طرف تیزی سے آ رہی تھی اور اسے روکنے کے لئے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی لیکن وہ اور راجر آگے بڑھ کر پولیس والوں کی فائرنگ کی زد میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ راجر نے چھت پر سے چیخ کر کہا۔ "جولی! پچھلے دروازے سے فوراً نکل جاؤ۔ گاڑی کاٹیج سے ٹکرانے والی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خود وہاں سے پلٹ کر بھاگنے لگا۔ اسی وقت ایک گولی اس کی پشت پر آ کر لگی اور وہ لڑکھڑا کر چھت پر گر پڑا۔ جولی کھڑکی سے پلٹ کر بھاگ رہی تھی۔ راجر کی چیخ سن کر ٹھٹک گئی اور سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھنے لگی۔ اوپر سے اس کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ وہ راجر کا نام لے کر چیختی ہوئی آگے بڑھی تو بدحواسی میں ایک کرسی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت جیپ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دیوار سے ٹکرا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ جس دیوار سے جیپ ٹکرائی تھی' وہ دیوار جولی کی طرف تیزی سے جھکتی چلی گئی۔ چھت چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ بیٹھنے لگی۔ باہر جھاڑیوں کے پیچھے سے فائرنگ کرنے والوں کو جولی کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ وہ سب دوڑتے ہوئے کاٹیج کی طرف جانے لگے۔ اس وقت تک چھت اور دیواریں زمین بوس ہو گئی تھیں۔ دیمک خوردہ لکڑیوں کا وہ کاٹیج جولی کا تابوت بن گیا تھا۔ اب اس کے اندر سے اس کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ پولیس کے دو جوان راجر کو چھت پر سے کھینچ کر سڑک پر لے آئے۔ وہ پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔ انہوں نے تلاشی لینے کے بعد اس کی جیب سے وہ نولکھا ہار نکال لیا جو اب پانچ عدد ہیروں سے محروم ہو چکا تھا۔

صفدر علی کو ساڑھے تین بجے اس واقعے کی اطلاع ملی۔ اس نے موقع پر پہنچ کر اس ہار کو دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ راجر نے اس کے پانچ عدد ہیرے شاید جولی کو رکھنے کے لئے دیئے ہیں۔ اگر وہ جولی کے پاس نہ پائے گئے تو صبح ہونے سے پہلے وہ نیازی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر دو میں جائے گا اور ثمینہ کا محاسبہ کرے گا۔

تباہ شدہ کاٹیج کی چھت اور دیواریں ہٹا کر جولی کی لاش نکالنے میں کافی وقت صرف

ہوگیا۔ پھر جولی اور اس کے دوسرے سامان کی تلاشی لی گئی لیکن وہ ہیرے دستیاب نہ ہو سکے۔ صفدر وہاں سے مایوس ہو کر پانچ بجے ہسپتال پہنچا۔ ثمینہ کو انجکشن دے کر سلایا گیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس لئے صفدر کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس نے ڈاکٹر خاور کو فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ اسے ثمینہ سے ملنے کی فوری اجازت دی جائے لیکن ڈاکٹر نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”مسٹر صفدر مجھے افسوس ہے کہ میں اس مریضہ کی نیند خراب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر وہ بیدار ہو جائے تو تب بھی آپ اس سے ملاقات نہ کریں۔ کل صبح اٹھ کر اس کے سیل بدلے جائیں گے۔ اس کے دل کی حالت بہت نازک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سیل بدلنے سے پہلے اسے ذہنی طور پر پریشان کیا جائے یا معمولی سی تحقیق کے لئے اسے ڈسٹرب کیا جائے۔“

”یہ معمولی سی تحقیقات نہیں ہے۔ شہزادی شاہینہ کا ایک نہایت ہی قیمتی ہار چرایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جولی اور راجر نامی دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ راجر کی جیب سے ہار دستیاب ہوا ہے لیکن اس کے ہیرے کمرہ نمبر دو کی مریضہ ثمینہ کے پاس ہو سکتے ہیں کیونکہ راجر رات کے دو بجے اس سے ملنے آیا تھا۔“

”اگر وہ ہیرے کمرہ نمبر دو میں ہیں تو آپ اطمینان رکھیں۔ وہ آپ کو مل جائیں گے۔ دیکھئے آپ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے جلد بازی سے کام لیا تو تیسری ہلاک ہونے والی ثمینہ ہوگی۔ میں بیٹری کے ذریعے انسان کو زندہ رکھنے کے تجرباتی دور سے گزر رہا ہوں۔ لہٰذا میں آپ کو اجازت نہیں دوں گا کہ آپ میرے تجربے کو ناکام بنائیں۔ اگر شام تک ثمینہ نارمل حالت میں رہی تو میں سب سے پہلے آپ کو اس سے ملنے کی اجازت دوں گا۔ دیٹس آل۔“

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے ڈاکٹر نے ریسیور رکھ دیا۔ صفدر سر تھام کر سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر طبی نقطہ نظر سے درست کہہ رہا تھا۔ وہ ثمینہ سے اس وقت تک نہیں مل سکتا تھا جب تک کہ ڈاکٹر اس سے ملاقات کو ضروری نہ سمجھتا۔ قانون کی نظر میں ایک شہزادی کے ہیرے اہم تھے لیکن ڈاکٹر کے لئے ایک عام سی عورت کی زندگی اہم تھی۔ ڈاکٹروں کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ پہلے وہ مریض کی زندگی بچائیں۔ صفدر وہاں سے مایوس ہو کر اپنے دفتر واپس آگیا لیکن ہسپتال میں اپنے خاص آدمیوں کو ڈیوٹی پر

لگا دیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کمرہ نمبر دو سے آپریشن تھیٹر تک ہر شخص پر کڑی نظر رکھیں۔ ڈاکٹر اور نرس کے سوا کوئی رشتہ دار، دوست یا اجنبی ثمینہ سے ملاقات نہ کرے۔ کمرہ نمبر دو سے کوئی بھی چیز باہر لے جائی جائے تو اسے اچھی طرح چیک کریں۔ صفدر نے ڈاکٹر خاور کی خواہش کے مطابق ثمینہ کو ڈسٹرب کئے بغیر ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں کہ وہ پانچ عدد ہیرے کہیں اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتے تھے۔

صفدر نے اس پہلو سے بھی غور کیا تھا کہ ڈاکٹر خاور ثمینہ کا صرف معالج نہیں ہے بلکہ عاشق بھی ہے۔ وہ ثمینہ کی دلجوئی کے لئے ان ہیروں کو چھپا کر لے جا سکتا تھا یا کسی نرس کو یا کسی وارڈ بوائے کو اس کام کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر خاور غیر معمولی شہرت کا حامل تھا۔ اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی تھی۔ صفدر علی کو اتنے اختیارات حاصل نہیں تھے کہ وہ ڈاکٹر خاور کی تلاشی لے سکتا لہٰذا وہ اس کارروائی کے لئے ریسیور اٹھا کر اپنے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

☆======☆======☆

شاکر جمالی حوالات میں تمام رات خراٹے لیتا رہا۔ صبح سات بجے آہنی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ تھانیدار نے اسے پانچ سو پچپن کا سگریٹ پیش کیا اور اس سے کہا۔ ”میں نے رپورٹ مکمل کر لی ہے۔ رپورٹ کے مطابق تمہارے مکان سے چرس برآمد نہ ہو سکی۔ تم صرف چرس کا ایک سگریٹ پینے کے مجرم ہو لہٰذا تم سے پچاس روپے جرمانہ لے کر اور تمہیں وارننگ دے کر صبح سات بجے حوالات سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ اس وقت سات بجے ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

وہ سگریٹ کے کش لیتا ہوا حوالات سے باہر آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حوالات کے باہر اس کے دو ساتھی مارے گئے ہیں اور ثمینہ پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اسے سب سے پہلے کس ساتھی سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔

اسی وقت صفدر علی ناگہانی مصیبت کی طرح وہاں آگیا اور اس نے شاکر جمالی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہیں رہائی نصیب ہو گئی ہے۔ میں عین وقت پر آگیا ورنہ تم سے ملاقات نہ ہوتی۔“

تھانیدار اسے چرس کے متعلق رپورٹ سنانے لگا۔ صفدر علی نے ہاتھ اٹھا کر قطع

کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ جمالی کو کس لئے گرفتار کیا گیا تھا اور اب کس لئے رہا کیا جا رہا ہے۔ میں جمالی سے اپنے طور پر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں جمالی، میرے ساتھ چلو گے؟"

جمالی نے دونوں شانوں کو اچکا کر کہا۔ "میں آپ کے ساتھ نہ جانا چاہوں گا، تب بھی آپ مجھے لے جائیں گے کیونکہ قانون آپ کے ساتھ ہے۔ چلئے آپ کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے تھانے سے باہر آ گئے۔ باہر صفدر علی کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اس کے دو ماتحت بیٹھے ہوئے تھے۔ صفدر نے جمالی کو اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دروازے کو بند کرتے ہوئے اور جمالی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ "جمالی کو تحفہ دکھا دو۔"

پچھلی سیٹ سے ایک ماتحت ہار نکال کر جمالی کی نگاہوں کے سامنے لے آیا۔ اسے دیکھتے ہی جمالی کا رنگ زرد پڑ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولا۔ "یہ کس کا ہار ہے؟ مجھے کیوں دکھایا جا رہا ہے؟"

صفدر اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ ہار تمہارے ایک ساتھی راجر کے پاس تھا۔ اب ہم اس کے پانچ عدد ہیرے ثمینہ سے حاصل کرنے جا رہے ہیں۔"

صفدر کی ان معلومات پر وہ حیران رہ گیا۔ ہار کو دیکھ کر اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ثمینہ سے ہیرے بھی حاصل کر لے گا۔ جمالی کو اس بات کا صدمہ تھا کہ تقریباً دس لاکھ روپے کا مال اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ قانون کے محافظ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں ڈال سکیں گے کیونکہ جس وقت ہار چرایا گیا، اس وقت وہ تھانے والوں کی گواہی کے مطابق حوالات میں بند تھا۔ لہٰذا کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ہار کی چوری میں شاکر جمالی کا بھی ہاتھ تھا۔

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ "راجر اور ثمینہ کا شمار میرے ساتھیوں میں ہوتا ہے اس لئے آپ مجھ سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں لیکن ان باتوں کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ میں اس ہار کی چوری میں شریک نہیں تھا پھر آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

صفدر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اس کیس کو آسان بنا دو یعنی چوری کا اعتراف کر لو۔"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کل تمام رات حوالات میں رہا اور آپ کہتے ہیں کہ میں خواہ مخواہ اس چوری کا اعتراف کر لوں۔"

"جمالی! تم بڑے شاطر ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھی پکڑے جاتے ہیں اور تم صاف بچ کر نکل جاتے ہو۔ اس بار بھی تم نے اچھی چال چلی ہے۔ تمہیں حوالات میں بند نہیں کیا گیا بلکہ تم نے خود کو بند کروایا ہے۔ مالی پور کا تھانے دار لالچی ہے۔ قانون کا محافظ بن کر وہ تمہارے جیسے چور بدمعاشوں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کل رات تم سب نے مل کر کیسا ڈرامہ کھیلا ہے، اس کا ایک ہلکا سا خاکہ میرے دماغ میں ہے۔ محض دکھاوے کے لئے تم پر چرس پینے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔"

"صفدر صاحب! آپ اپنے طور پر جو چاہے سمجھ لیں۔ میں نے تمام رات قانون کے محافظوں کی نگرانی میں گزاری ہے۔ تھانے کا ریکارڈ میری بے گناہی ثابت کرتا ہے اس لئے آپ مجھے مجرم ثابت کرنے کی فضول سی کوشش نہ کریں۔"

صفدر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ شاکر جمالی بھی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھی پولیس والوں کی نظروں میں آ چکے تھے۔ اس لئے وہ اندر ہی اندر مضطرب اور پریشان تھا۔ پچھلی رات وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔ اس نے حوالات کی سخت کھردری زمین پر لیٹ کر شہزادی شاہینہ کے خواب دیکھے تھے۔ تمام رات اس حسینہ کے بدن کی نرمی و گرمی کو اپنی خیالی آغوش میں محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کے پھول جیسے ملائم ہونٹ بوسے کی حرارت سے کس طرح اس کے ہونٹوں کے درمیان کھل رہے تھے اس کیفیت کو یاد کر کے وہ شہزادی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

حوالات کی وہ رات کتنی رنگینیوں اور خوشبوؤں سے سجی ہوئی تھی اور وہ دوسرا دن اس کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ اسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا اور انہیں بچانا اس کا فرض تھا اور اسے اس فرض کی ادائیگی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر صفدر نے گاڑی روک دی۔ اپنے ماتحتوں سے کہا کہ وہ ہسپتال کے اندر جائیں۔ جب وہ چلے گئے تو اس نے کہا۔ "جمالی میں تمہیں ایک مجرم

سمجھ کر یہاں نہیں لایا ہوں۔ آج تک یہی ہوتا آیا ہے کہ چوری کے بعد چور کو پکڑا جاتا ہے لیکن یقین کرو اس ہار کی چوری میں ہمیں چور کی تلاش نہیں ہے۔ ہمیں یہ ہار اور ہے۔ صرف ہیروں کی تلاش ہے۔ وہ بھی مل جائیں گے تو ہم اس ہار کو مکمل کر کے شہزادی کے حوالے کر دیں گے۔"

"اور چور کو معاف کر دیں گے؟" جمالی ہنسنے لگا۔ "صفدر صاحب' آپ بچوں کی باتیں کرتے ہیں۔"

"تم کیس کی نوعیت نہیں سمجھ رہے ہو۔ اس لئے یہ بچگانہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھو اگر ہار کی چوری کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہو جائیں تو ملک کی کتنی بدنامی ہوگی۔ ساری دنیا کے اخبارات اس خبر کو اچھالیں گے کہ شہزادی جیسی معزز مہمان کا ہار ہمارے ملک میں لوٹ لیا گیا۔"

"ہاں یہ بدنامی کی بات ہے۔" جمالی نے قائل ہو کر کہا۔

"اسی لئے ہم نے چوری کی اس خبر کو پریس تک جانے سے روک دیا ہے۔ شہزادی شاہینہ بھی ہم سے تعاون کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کا احسان ماننا چاہئے اور احسان مندی کے طور پر کم از کم یہ تو کوشش کرنی چاہئے کہ ان کا ہار انہیں واپس مل جائے۔ تم لاکھ چور سہی لیکن ملک کی عزت اور وقار کے لئے تمہیں بھی یہی کوشش کرنی چاہئے۔ کیا اس سلسلے میں تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟"

"مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ چوری میرا پیشہ ہے اور حب الوطنی میرا فرض ہے۔ بتایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم چاہو تو ثمینہ سے وہ ہیرے بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری آلۂ کار ہے۔ تمہارے حکم سے انکار نہیں کرے گی۔"

"اچھی بات ہے۔ وہ ہیرے آپ کو مل جائیں گے لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ چوری کا مال برآمد کرنے کے بعد بھی آپ مجھے چور ثابت نہیں کر سکیں گے۔ اگر آپ نے مجھے دھوکہ دیا تو آئندہ کوئی چور یا بدمعاش اپنے وطن کی خاطر بھی آپ سے کبھی تعاون نہیں کرے گا۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔ ہار کی چوری میں تمہارا نام تک نہیں آنے دوں گا۔"

وہ دونوں کار سے باہر آ گئے۔ جمالی نے ہسپتال کے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں ثمینہ اور راجر کا نام بھی نہیں آنا چاہئے۔"

"ثمینہ کا نام نہیں آئے گا۔ راجر کا نام آنے دو۔ اس لئے کہ کل رات وہ اور جولی پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ ان کے خلاف تو کوئی کیس بنانا ہی پڑے گا۔"

جمالی نے اپنے ساتھیوں کی موت کی خبر سن کر سر جھکا لیا۔ صفدر اسے بتا رہا تھا کہ راجر نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کی بجائے کس طرح پولیس سے مقابلہ کرنے کی حماقت کی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے کمرہ نمبر دو کے دروازے پر آئے۔ وہاں اس کے نرس نے بتایا کہ کمرہ خالی ہے اور ثمینہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔

صفدر اور جمالی کمرے کے اندر آ گئے۔ صفدر نے پوچھا۔ "کیا وہ ہیرے کسی چیز میں بند کئے گئے ہیں؟"

"جی ہاں وہ پانچ عدد ہیرے ڈیڑھ انچ کے پلاسٹک کے ایک کیپسول میں رکھے گئے ہیں۔"

وہ دونوں کمرے کی ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر اس ڈیڑھ انچ کے کیپسول کو تلاش کرنے لگے۔ آخر مایوس ہو کر صفدر نے کہا۔ "کیپسول یہاں نہیں ہے۔ وہ ثمینہ کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔"

"ہوں۔" جمالی نے تائید کی۔ "وہ اسے اپنے ساتھ آپریشن تھیٹر میں لے گئی ہے۔ اسے واپس آنے دیجئے۔ میں اس سے وصول کر لوں گا۔"

"کیسے وصول کرو گے؟ جب تک ڈاکٹر اجازت نہیں دے گا' ہم اس کے قریب بھی نہیں جا سکیں گے۔"

"آج یا کل ڈاکٹر ضرور اجازت دے دے گا۔ اگر اس کیپسول کو ثمینہ نے چھپایا ہوگا تو میں اس سے حاصل کر لوں گا۔ اگر ڈاکٹر کی نیت خراب ہو گئی یا وہ کیپسول کسی دوسرے کے ہاتھ لگ گیا تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ڈاکٹر اس کے اسسٹنٹ یا نرس وغیرہ اسے آپریشن تھیٹر میں بھی چھپا سکتے ہیں۔"

صفدر نے کہا۔ "میں انہیں اس کا موقع نہیں دوں گا۔ جب ثمینہ باہر آ جائے گی تو میں آپریشن تھیٹر کی بھی تلاشی لوں گا۔ میں نے خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا ہے جس کی رو سے میں ڈاکٹر خاور جیسی معزز ہستی کو بھی تلاشی دینے پر مجبور کر سکتا ہوں۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی جانب چلے گئے۔ وہاں انہیں ایک گ
تک انتظار کرنا پڑا۔ جب ثمینہ کو واپس دو نمبر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو صفدر
ماتحتوں نے آپریشن تھیٹر کی تلاشی شروع کر دی۔ اس نے خصوصی اجازت نامہ
ڈاکٹر خاور کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تلاشی دینے سے انکار نہ کرے۔ کئی گھنٹے تک
کے آدمیوں نے پوری توجہ اور تندہی سے ہر اس جگہ کی تلاشی لی جہاں ایک کیپسول چھپ
جا سکتا تھا اور ہر اس شخص کو سر سے پاؤں تک ٹٹولا جو مشکوک نظر آیا۔ ہسپتال کے ایک
ڈسٹ بن میں ڈیڑھ انچ کا کیپسول پایا گیا لیکن وہ خالی تھا۔ اسے دیکھ کر یہ یقین سے نہ
کہا جا سکتا تھا کہ اس میں پانچ عدد ہیرے چھپا کر رکھے گئے تھے۔ شاکر جمالی بھی یہ نہ
کہہ سکتا تھا کہ راجر وہی کیپسول دانیال جوہری سے لے کر آیا تھا۔ دانیال کو بلا کر پوچھا
تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے نہ تو نولکھا ہار کو دیکھا ہے نہ اس میں سے ہیرے
نکال کر کسی کیپسول میں رکھے ہیں۔ صفدر اور جمالی نے اسے لاکھ یقین دلایا کہ اس کے
خلاف کیس نہیں بنے گا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ مختصر یہ کہ تمام ہسپتال کو کھنگ
ڈالنے کے باوجود وہ ہیرے نہیں ملے۔ ڈاکٹر خاور کی تلاشی لے کر بھی شرمندہ ہونا پڑا
اب صرف ثمینہ ہی ایسی تھی جس کے پاس لازمی وہ ہیرے ہو سکتے تھے۔

ثمینہ اپنے کمرے میں محو خواب تھی۔ وہ خواب میں پانچ عدد ہیرے دیکھ رہی تھی۔
ان ہیروں کی چمک سے اس کا چہرہ بھی جگمگا رہا تھا۔ ڈاکٹر خاور بار بار اس کے کمرے میں
آتا تھا اور گراف کی صورت دل کی حرکات کو نوٹ کرتا رہتا تھا۔ کئی بار ثمینہ کی آنکھ کھلی
تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک سے ڈاکٹر نے بھی یہی محسوس کیا کہ اس کے
چہرے پر ہیرے کی سی آب و تاب ہے اور اس کا دل حیرت انگیز طور پر ایک صحت مند
اور نارمل انسان کے دل کی طرح کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کو اتنی جلدی اتنی زیادہ کامیابی کی
توقع نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ثمینہ! تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور سب سے
دولت مند عورت ہوں۔"

"پنے دل کے متعلق کچھ بتاؤ؟"

"میرا دل بالکل صحیح حالت میں دھڑک رہا ہے۔ مجھے کسی طرح کی گھبراہٹ نہیں
ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ کوئی چور وہ ہیرے نہیں چرا

پولیس والے ہزار تلاشیوں کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے جہاں وہ نایاب ہیرے
محفوظ ہیں۔ اس اطمینان کے بعد نہ کسی طرح کی گھبراہٹ ہوتی ہے نہ پریشانی۔ دیکھئے نا، ہم
اپنی پونجی ایسے لاکر میں چھپا لیں جہاں تک کسی کا خیال بھی نہ جا سکے تو پھر ہماری طرح
مطمئن اور آسودہ اور کون ہوگا۔ اسی لئے میں خود کو سب سے زیادہ دولت مند سمجھتی ہوں
کیونکہ میرا وجود ان پانچ عدد نایاب ہیروں کی تجوری ہے۔"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "واقعی دماغ پُرسکون ہو، کسی قسم کی فکر اور پریشانی نہ ہو تو
دل نارمل حالت میں کام کرتا ہے۔ تمہارا دل بھی میری توقع سے زیادہ اچھی حالت میں
ہے۔"

"خاور۔ ابھی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔
ائرپورٹ پر کسٹم والوں نے ہمیں روک لیا ہے۔ وہ ہمارے ایک ایک سامان کی تلاشی لے
رہے ہیں۔ ایک لیڈی انسپکٹر مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئی ہے اور میرا لباس اتار کر
ہیرے تلاش کر رہی ہے لیکن وہ ہیرے انہیں نہیں ملتے ہیں اور ہمیں سوئٹزر لینڈ جانے
کی اجازت مل جاتی ہے۔ خاور یہ کتنا سچا خواب تھا۔ کسٹم والے تو کیا آسمان کے فرشتے بھی
ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

ڈاکٹر اس اعتماد سے اسے دیکھنے لگا کہ اس کا تجربہ اب بلاشبہ کامیاب ہو رہا تھا۔
انسان خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ ثمینہ بھی اپنی خواہش کے تابع فرمان تھی۔ دل اسی
خواہش کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ اب اس کی دھڑکنوں میں بے اعتدالی نہیں آ سکتی
تھی۔ بیٹری اپنا کام کر رہی تھی۔ خواہش اپنا رنگ دکھا رہی تھی اور اس کی دونوں آنکھیں
ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

اس نے پوچھا۔ "خاور! میں شاکر جمالی اور پولیس والوں کی پروا نہیں کرتی۔ وہ کبھی
ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے لیکن میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ وہ لوگ خواہ مخواہ
الٹے سیدھے سوالات کریں گے۔ میری تلاشی کے لئے کسی عورت کو لے کر آئیں گے
اور میں ذہنی طور پر پریشان ہوتی رہوں گی۔"

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "تم ان کی فکر نہ کرو۔ میں انہیں اتنا موقع
نہیں دوں گا کہ وہ تم سے ملاقات کریں اور تمہیں پریشان کریں۔ تم بھی کوئی ایسی بات نہ
سوچو جس کا غلط اثر تمہارے دماغ اور پھر دل پر پڑے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ وہ تمہاری

تلاشی نہ لیں تو پھر اطمینان رکھو۔ میں کسی کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گا۔"

اس نے جھک کر ثمینہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر مسلح آدمی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ ثمینہ کے کمرے میں ڈاکٹر کے کسی کو نہ جانے دیں۔ ڈاکٹر بھی ثمینہ کی حفاظت کرنا خوب جانتا تھا۔ اس نے باہر دروازے کو لاک کر دیا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کی مریضہ کو پریشان کرنے نہ جا سکے۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ رفتہ رفتہ رات کا اندھیرا مسلط ہو رہا تھا صفدر علی کی کار قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہونے لگی تو شاکر جمالی نے پوچھا۔ "آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟"

"یہ وہی جگہ ہے جہاں سے تم نے ہار اڑایا تھا۔ تمہیں تو اب کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ ادھورا نیکلس شہزادی شاہینہ کو واپس کر دوں۔"

قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی جمالی کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ شہزادی شاہینہ کا نام سن کر تو دل اور بے چین ہو گیا۔ اندھیرے کی آغوش میں سمٹ آنے والا پھول بدن کی نزاکت یاد آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کیا شہزادی اسے پہچان لے گی؟

وہ دونوں کار سے اتر کر قصر سلیمان کے برآمدے میں آئے۔ شہزادی کے سیکرٹری نے صفدر علی کو پہچان کر خوش آمدید کہا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی نے صفدر علی کو طلب کیا۔ وہ جمالی کو ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ تنہائی میں سوچنے لگا کہ صفدر اسے یہاں کیوں لایا ہے؟ کوئی گہری چال تو نہیں ہے؟

"نہیں۔" اس نے پھر سوچا۔ "صفدر وعدہ سے نہیں پھر سکتا۔ وہ دھوکہ نہیں دے گا۔ شاید یہاں شہزادی سے سمجھوتے کے لئے آیا ہے کہ ہار کی چوری کو مشتہر نہ کیا جائے صبح صفدر نے بتایا تھا کہ شہزادی نے بھی مکمل تعاون کا وعدہ کیا ہے۔"

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا۔ سیکرٹری نے آ کر کہا کہ اسے صفدر نے بلایا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر سیکرٹری کے ساتھ چلتا ہوا اسی ہال میں آ گیا جہاں سالگرہ کے مہمان جمع ہوئے تھے اور جہاں بالکونی کے قریب تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس نے شہزادی

رہا تھا اور خود بھی لٹ گیا تھا۔

اس وقت بھی ہال میں نیم تاریکی تھی اور اس آدھی تاریکی اور آدھی میلی میلی روشنی میں بالکونی کے قریب وہ نظر آ رہی تھی۔ جمال کے دل کی دھک دھک اور تیز ہو گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اس کے ساتھ آنے والا سیکرٹری نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں صفدر بھی نہیں تھا۔ صرف وہ تھا اور اندھیرے کی شہزادی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ بھی اس کی طرف آنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے آ رہے تھے۔ بالکل قریب پہنچتے ہی ہال میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید تکلف ہوتا' اگر ایک دوسرے کی صورت نظر آتی تو جھجک ہی ہوتی لیکن وہاں چہرے مٹ گئے تھے۔ ماحول ڈوب گیا تھا' ہچکچاہٹ ختم ہو گئی تھی اور اندھیرے کا چور پھر نڈر اور بے باک ہو گیا تھا۔

شہزادی شاہینہ کی آنکھیں اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر احساسات بتا رہے تھے کہ وہ قد آور ہے۔ اس لئے وہ پنجوں کے بل اٹھ گئی ہے۔ بازو فولاد ہیں اور سینہ چٹان ہے اور اس آغوش میں اس کی سانسیں رکی رکی جا رہی ہیں پھر ہونٹوں کے سنگم پر وہ پھیل گئی۔ ایک بوسے کی تکمیل پر اس نے کہا۔ "تم وہی ہو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ میں نے صفدر صاحب سے کہا تھا کہ میں تمہیں اندھیرے میں پہچان سکتی ہوں۔ انہوں نے آزمائش کے طور پر تین اجنبیوں کو تاریکی میں میرے پاس بھیجا تھا۔ ان کے ہاتھوں کے لمس سے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ تینوں وہ نہیں ہیں جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ صرف تم ہو' تمہاری آغوش میں آتے ہی میں یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ایک ہار چرانے کے بہانے میرے دل کو چرانے والے وہ اندھیرے کے چور تم ہی ہو۔"

"شہزادی صاحبہ آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ ایک معمولی انسان ہوں اور آپ شہزادی ہو کر مجھ سے دل کی باتیں کرتی ہیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' شہزادی کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ جب سے تم ہار لے کر گئے ہو' میں تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ جس کا مال چوری ہوتا ہے' اسے اپنے مال کی فکر ہوتی ہے لیکن اب تک میں ہار کے لئے نہیں' تمہارے پیار کے لئے سوچ رہی تھی۔ یہ بات صفدر صاحب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ میں تمہیں اتنا چاہتی ہوں' اتنا چاہتی ہوں کہ تمہیں دیکھے بغیر تاریکی میں پہچان لیتی ہوں۔ ایسی پہچان اسی کو

ہوتی ہے جو دل سے کسی کو چاہتی ہو۔"

شاکر جمالی نے اسے اپنے بازوؤں میں بلند کرلیا اور اپنے چہرے کے قریب لا کر
"آپ بھی کل سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں لیکن آپ کے بلند مرتبے کا خ
تھا اس لئے زبان چپ تھی۔ میں ایک چور ہو کر آپ کی تمنا نہیں کر سکتا تھا مگر آپ ہاتھ
بڑھا رہی ہیں۔ اس لئے اب میں بھی آپ کی تمنا کرتا ہوں۔"

تاریکی میں کئی چراغ روشن ہو گئے۔ ان جذباتی چراغوں کی روشنی میں وہ ایک
دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن کوئی تیسرا انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہسپتال سے صفدر کے ماتحت کا فون آیا۔ اس نے صفدر کو بتایا
ڈاکٹر خاور اس سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ذرا دیر بعد فون کے دوسری طرف
ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مسٹر صفدر اگر آپ ثمینہ سے ملاقات کرنا چا
ہیں تو شاکر جمالی کے ساتھ آجائیے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں جمالی کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔"

"ایک منٹ۔" ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ "کیا آپ شہزادی شاہینہ کو اپنے ساتھ
سکتے ہیں؟"

"شہزادی صاحبہ کو ان ہیروں کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہسپتال تک
پسند نہیں کریں گی۔"

"کیا فون پر شہزادی سے گفتگو کروا سکتے ہیں؟"

"ہولڈ آن کیجئے میں کوشش کرتا ہوں۔"

صفدر نے یہ بات سیکرٹری سے کہی۔ سیکرٹری نے شہزادی کے پاس جا کر کہا کہ
سرجری کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر خاور آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں
شہزادی اتنی بڑی ہستی سے گفتگو کرنے کے لئے بخوشی تیار ہو گئی۔ چند منٹ بعد دونوں
درمیان رابطہ قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر خاور نے کہا۔ "شہزادی شاہینہ صاحبہ! آپ ہمارے
میں تشریف لائی ہیں۔ آپ نے یہاں عجائب گھر اور تاریخی عمارتیں دیکھی ہوں گی
آپ نے اس ملک کی ایک ایسی عورت کو نہیں دیکھا جو بیٹری سسٹم کے ذریعے زندہ
یہ عورت میرے زیر علاج ہے اور ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں ہے۔ کیا آپ اسے
پسند کریں گی؟"

شہزادی نے خوشی کا اظہار کیا۔ "آہا! میں اسے ضرور دیکھوں گی۔ میں نے اخبارات
میں پڑھا ہے کہ میڈیکل سائنس میں اس قسم کے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ یہ میری خوش
نصیبی ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے ایک ایسی عورت کو دیکھوں گی جس پر یہ تجربہ کیا جا رہا
ہے۔ آپ بتائیں مجھے کس وقت ہسپتال آنا چاہئے اور وہ ہسپتال کہاں ہے؟"

"آپ ابھی آسکتی ہیں۔ مسٹر صفدر اور شاکر جمالی ابھی یہاں آرہے ہیں۔ کیا آپ
ان کے ساتھ تشریف لائیں گی؟"

"جی ہاں۔ میں ابھی آرہی ہوں۔"

فون پر گفتگو ہونے کے ایک گھنٹہ بعد شہزادی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس
کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر جمالی بیٹھا ہوا تھا۔ صفدر علی اپنی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب
وہ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر خاور ان کا منتظر تھا۔ اس نے شہزادی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ فی الحال آپ اسے دور سے دیکھیں۔ پہلے میں آپ لوگوں سے ضروری
باتیں کروں گا۔ اس کے بعد آپ مناسب سمجھیں تو اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ میں
انکار نہیں کروں گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے کمرہ نمبر دو کے پاس آئے۔ ڈاکٹر نے ایک کھڑکی کے پاس
انہیں کھڑا کر دیا۔ وہاں سے ثمینہ کمرے کے اندر نظر آرہی تھی۔ اس وقت وہ بستر پر بیٹھی
ہوئی چمچے سے سوپ پی رہی تھی۔ شہزادی نے دیکھا' اس مریضہ کی پشت نیچے سے کوہان کی
طرح ابھری ہوئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا یہ عورت کبڑی ہے؟"

"نہیں!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ جسمانی اعتبار سے بے عیب ہے۔ سر سے پاؤں
تک اس کے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ بظاہر کبڑی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ
ہے کہ اس کی پشت سے پلاسٹک کا ایک کیس منسلک ہے جس میں بیٹریاں نصب ہیں۔ ان
بیٹریوں کے ذریعے اس کے دل تک قوت اور حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ آئیے' میں آپ
کو اس کا ایکسرے دکھاتا ہوں۔"

وہ ان کے ساتھ اپنے دفتر والے کمرے کی طرف جانے لگا۔ شہزادی بڑی دلچسپی سے
دل اور بیٹری کے کنکشن کے متعلق سوالات کر رہی تھی اور ڈاکٹر اسے تمام باتیں تفصیل
سے سمجھا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے ایک ایکسرے اٹھا
کر دکھایا۔ "دیکھئے انسان کا دل بائیں طرف ہوتا ہے۔ یہ بائیں طرف کی پشت کا ایکسرے

ہے۔ میں نے اس پر قلم سے یہ چوکور حاشیہ دیا ہے۔ یہ حاشیہ پلاسٹک کا کیس ہے۔ دیکھئے یہ دو عدد ننھی سی بیٹریوں میں اتنی قوت ہے کہ یہ چھ ماہ تک دل کے تمام فنکشن اعتدال پر رکھ سکتی ہیں۔

"اتنی قوت کی بیٹریاں ہونے کے باوجود ان میں ایک چیز کی کمی تھی۔ میں نے پورے ایک ماہ کے دوران ثمینہ کے دل کی حرکتوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مادی تجربے میں روحانیت کی اہم ضرورت ہے۔ ثمینہ کو جب تک روحانی خوشی حاصل نہیں ہوگی، اس وقت تک تنہا بیٹریاں اسے صحیح حالت میں زندہ نہیں رکھ سکیں گی۔

"روحانی خوشی سے میری مراد یہ ہے کہ ایسی مسرتیں جنہیں ہم دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں۔ جو اعلیٰ ظرف کے لوگ ہوتے ہیں، وہ رب العزت کے سامنے سجدہ کرکے یا کسی کے ساتھ نیکی کرکے روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں اور جو کم ظرف ہوتے ہیں وہ چوری کا مال حاصل کرکے دل کی گہرائیوں سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

"میں نے ثمینہ کو خوشیاں دینے کے لئے اس سے محبت کی اور اس سے شادی کا وعدہ کیا۔ حالانکہ میں بہت مصروف ڈاکٹر ہوں۔ مجھے اتنی فرصت نہیں ہے کہ میں کسی سے محبت کروں لیکن میں جس تجربے سے گزر رہا ہوں، اس کے لئے ثمینہ کی زندگی بہت اہم ہے۔ اس لئے میں اپنے تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے اس سے محبت کا ناٹک کرنے لگا۔

"کچھ عرصہ تک وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی سمجھتی رہی کیونکہ مجھ جیسا شہرت یافتہ ڈاکٹر اس سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس میں زندہ رہنے کی لگن پیدا ہوگئی۔ لگن اور خوشی کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ثمینہ کا دل ایک طرف دماغ سے ہم آہنگ ہوگیا اور دوسری طرف بیٹریوں کے زیراثر نارمل حالت میں کام کرنے لگا۔

"اس دوران ثمینہ نے بتایا کہ اسے اپنے جسم پر ہیرے جواہرات سجانے کا بڑا شوق ہے۔ اسی لالچ میں وہ شاکر جمالی کی آلہ کار بن گئی۔ ایک روز اس کی زبانی معلوم ہوا کہ جمالی پانچ عدد ہیرے بطور امانت اس کے پاس پہنچانے والا ہے۔ میں اگلے ہفتے ثمینہ کو نئے تجربات کے لئے سوئٹزرلینڈ لے کر جا رہا ہوں۔ ثمینہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ میں وہ ہیرے کسی طرح چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ غیر قانونی کام ہے۔

میرے جیسا معزز ڈاکٹر ایسا کام نہیں کرسکتا۔ ہمیں اپنی عزت اور شہرت عزیز ہوتی ہے۔ میری بات سن کر وہ رونے لگی۔ مرجانے کی دھمکیاں دینے لگی۔ میں یہ کیسے گوارا کرلیتا کہ وہ مرجائے اور میرا تجربہ ادھورا رہ جائے۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ میں وہ ہیرے چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں گا۔

"میرے سامنے بڑی الجھنیں تھیں۔ میں قانون کے خلاف کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور ثمینہ کو اپنے تجربہ سے زندگی بھی دینا چاہتا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں ثمینہ کو ہر حال میں خوش رکھوں گا کیونکہ میرے تجربہ کی کامیابی سے اس دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو فائدہ پہنچنے والا ہے۔"

اس نے دوسرا ایکسرے اٹھا کر کہا۔ "یہ دیکھئے۔ آج دوپہر کو ثمینہ کی بائیں پشت کا دوسرا ایکسرے لیا گیا ہے۔ پلاسٹک کے کیس میں یہ دو عدد بیٹریاں نظر آرہی ہیں اور یہ جو پانچ عدد چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آرہے ہیں۔ یہ وہی پانچ عدد ہیرے ہیں جو شہزادی صاحبہ کے نیکلس سے نکالے گئے ہیں۔"

اس کی بات سنتے ہی سب چونک کر ایکسرے فوٹو کو دیکھنے لگے۔ وہاں پانچ عدد ننھے ننھے سے دھبے ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔

"کیا یہ واقعی میرے نیکلس کے ہیرے ہیں؟" شہزادی نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ وہی ہیرے ہیں جن کے لئے کل سے مسٹر صفدر پریشان ہیں۔"

صفدر نے کہا۔ "ڈاکٹر اگر یہ ہیرے ہیں تو آپ نے انہیں ایک عورت کے اندر چھپا کر جرم کیا ہے۔ آپ چوری کا مال اسمگل کرکے سوئٹزرلینڈ لے جانا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "اگر میں اسمگل کرنا چاہتا تو آپ کے فرشتے بھی کبھی ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیا آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بیٹریوں اور تاروں کے درمیان کس طرح پانچ عدد ہیروں کے لئے گنجائش نکالی گئی ہے۔ کسٹم کا کوئی بھی چیکر اتنی دور تک نہیں سوچ سکتا۔ اگر اسے شبہ ہو بھی جائے تو بھی وہ یہ احمقانہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ ہیرے ثمینہ کے اندر سے نکال کر اسے موت کے منہ میں پہنچایا جائے۔"

صفدر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ یہ جرم ہے۔ آپ شہزادی صاحبہ کی اجازت کے بغیر ان ہیروں کو اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔"

"مجھے شہزادی صاحبہ سے اجازت لینے کا موقع نہیں ملا۔ ثمینہ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ ہیرے کہاں سے چرا کر لائے جائیں گے۔ اس نے صرف شاکر جمالی کا نام لیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ہیرے کس کی ملکیت ہیں تو میں ان کے مالک سے ضرور اجازت لیتا۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنے نایاب ہیرے یونہی آپ کو دے دیئے جاتے؟"

"ہاں، کوئی اپنی قیمتی چیز یونہی نہیں دے دیتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی انسان کی جان بچانے کے لئے اس قیمتی شے کو عطیہ کے طور پر دے دیتے ہیں۔ میں نے شہزادی صاحبہ کو یہاں تک آنے کی زحمت اسی لئے دی ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے مریضہ کو اور میرے تجربے کو دیکھیں اور وہ پانچ عدد ہیرے اس وقت تک عطیہ کے طور پر دے دیں جب تک ثمینہ زندہ ہے۔ جب اس کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے تو وہ ہیرے شہزادی صاحبہ کی خدمت میں لوٹا دیئے جائیں گے۔"

"میں بخوشی یہ پانچ ہیرے عطیہ کے طور پر دیتی ہوں۔ میرے لئے یہ فخر کی بات ہوگی کہ آپ کے تجربے کو آگے بڑھانے میں میری دولت کا کچھ حصہ کام آ رہا ہے۔ ہیرے ہار کی زینت بن کر رہیں گے تو محض چمکتے ہوئے پتھر کہلائیں گے۔ اگر ثمینہ کے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب رہیں گے تو تمام انسانی برادری کے لئے روشنی کا مینار بن جائیں گے۔"

"مجھے آپ جیسی رحم دل شہزادی سے ایسی ہی سخاوت کی توقع تھی۔"

صفدر نے پوچھا۔ "ڈاکٹر! کیا یہ ضروری تھا کہ ثمینہ کو خوش رکھنے کی خاطر آپ سچ مچ وہ ہیرے بیٹریوں کے ساتھ رکھ دیتے۔ اس سے جھوٹ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ہیرے اس کے اندر چھپا دیئے گئے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ثمینہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سوئٹزر لینڈ پہنچنے کے بعد جب بھی بیٹری بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو میں وہ ہیرے نکال کر اس کے حوالے کر دوں۔

"ثمینہ کے اس مطالبے کے پیش نظر میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت کسی بیٹری میں کوئی نقص پیدا ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسری بیٹری رکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسی صورت میں آپ خود سوچئے کہ بیٹری بدلنے کے بعد

ہیروں کا مطالبہ کرے اور ہیرے موجود نہ ہوں تو اسے کتنا صدمہ پہنچے گا اور ساتھ ہی میرے تجربے کو بھی کتنا نقصان پہنچے گا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسے خوش اور مطمئن رکھنے کے لئے ان ہیروں کی موجودگی ضروری ہے۔

"اس کی مثال یوں بھی دی جا سکتی ہے کہ گھڑی کی ٹک ٹک جوئیل کے بغیر قائم نہیں رہتی۔ جوئیل ہیرے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہیرے کے بغیر ثمینہ کے دل کی دھک دھک برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس وقت ثمینہ پانچ جوئیل کی عورت ہے۔

"عورت کو اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کے زیورات چھین لئے جائیں گے تو وہ انہیں لاکرز میں چھپا کر رکھ دیتی ہے۔ ثمینہ بھی عام عورتوں کی طرح ہے۔ وہ ہیرے اس کے بدن پر سجے رہیں یا نہ رہیں۔ اس کے بدن کے اندر تو محفوظ ہیں۔ اسی لئے وہ مطمئن ہے اور زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا حوصلہ کرتی رہتی ہے۔

"مسٹر صفدر! آپ فرض شناس آفیسر ہیں۔ آپ قانون شکنی پسند نہیں کرتے ہیں لیکن افسوس کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو قانون کے خلاف ہوتے ہوئے بھی قانون میں لچک پیدا کرتا ہے کہ مجھے مجرم نہ سمجھا جائے کیونکہ میں تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے ایک اہم تجربہ سے گزر رہا ہوں۔

"دیکھئے۔ چوری کا مال جہاں بھی ہو، آپ وہاں سے نکال کر لے آتے ہیں۔ جو مال ثمینہ نے چھپا رکھا ہے، اسے آپ نکال کر نہیں لا سکتے۔ یہاں قانون آپ کو اجازت نہیں دے گا کہ آپ ایک مریضہ کی جان لے کر وہ ہیرے برآمد کریں۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے آپ کو اور آپ کے قانون کو ثمینہ کی طبعی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

صفدر مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ شہزادی شاہینہ اور شاکر جمالی بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ ڈاکٹر خاور ان کے پیچھے تھا۔ وہ سب پھر اسی کھڑکی کے پاس آ گئے جہاں سے ثمینہ نظر آ رہی تھی۔ وہ بستر پر چپ چاپ دائیں کروٹ لئے ہوئے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

شہزادی شاہینہ نے اسے دیکھ کر سوچا۔ "یہ عورت میرے پانچ جوئیل کی بدولت زندہ ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ ہیرے مجھے واپس مل جائیں گے اور میری شہرت یہی ہوگی کہ ڈاکٹر کے تجربے کو کامیاب بنانے میں میری سخاوت اور رحمدلی نے زیادہ کام کیا ہے۔"

شاکر جمالی نے ثمینہ کو حسرت سے دیکھ کر سوچا۔ ''میں نے اس کم بخت کو امانت
طور پر رکھنے کو دیئے تھے۔ وہ پانچوں ہیرے نگل گئی۔ اب میں اس کے اندر سے
کیسے نکالوں۔ اس کے اطراف میں سخت پہرہ ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں
شہزادی مجھے اپنے ملک لے جا رہی ہے۔ شاید وہاں ان سے بھی قیمتی ہیرے
جائیں۔''

صفدر علی نے بے بسی سے سوچا۔ ''ڈاکٹر ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے
اور ثمینہ نے چوری کا مال اپنے بدن کے مکان میں چھپا رکھا ہے لیکن دنیا کا کوئی
اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میں اس مکان سے مال برآمد کروں۔ ڈاکٹر
جرم کیا ہے کہ قانون اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔''

اس وقت تک ڈاکٹر خاور کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا اور اسٹیتھو سکوپ سے
دل کی دھڑکنوں کو سمجھ رہا تھا۔

دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں۔ ''دھک دھک۔ دھک دھک پانچ جوئیلا
عورت'' اور اس عورت کی آنکھیں مسرتوں کے ہجوم میں ہیرے کی طرح چمک
تھیں۔

☆------☆------☆

خواب مسلسل

ان بے وسیلہ لوگوں کی حسرت ناک کہانی جو اس دنیا کی کوئی نعمت اپنی مرضی سے حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ صرف خوابوں کے ذریعے اپنی مرضی، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کر لیتے ہیں...... اگر وہ ایسے خواب بھی نہ دیکھیں تو پھڑ پھڑا کر مر جائیں۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر زبیری جس قدر حیران تھا اسی قدر دوسرے ڈاکٹروں کو حیران اور پریشان کر رہا تھا۔ دوسرے ڈاکٹر یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس دنیا کا کوئی بھی انسان قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں سے ہٹ کر ایک نئے انداز سے خواب دیکھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر قربان علی نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔ خواب تو ہم سب دیکھتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا اور دادا کے دادا بھی خواب دیکھتے آئے ہیں لیکن ایسا خواب کسی نے نہیں دیکھا۔ جیسا کہ تمہارا مریض دیکھتا ہے۔"

ڈاکٹر زبیری نے جواباً میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"اب وہ مریض نہیں ہے۔ بالکل ایک نارمل انسان ہے اس کا نام قیس محمد ہے اور وہ علی بھائی ولی بھائی کمپنی کے برانچ آفس میں ایک کلرک ہے۔"

"کلرک.........؟" کتنے ہی ڈاکٹروں نے ناگواری سے منہ بنایا۔ کیونکہ وہ سب اونچے ڈاکٹر تھے اور اپنے ملک کے صرف لکھ پتی اور کروڑ پتی دماغی مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ وہ ایک معمولی کلرک کے لئے اپنا قیمتی وقت کبھی ضائع نہ کرتے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ کلرک ان دنوں ایک نئے اور انوکھے انداز میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب کا تعلق انسان کی روز مرہ زندگی سے' اس کی سوچ سے اور اس کے دماغ سے ہوتا ہے اور وہ سب دماغی امراض کے ڈاکٹر تھے۔ لہٰذا ایک معمولی کلرک سے دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایک ڈاکٹر نے ناگواری سے کہا۔

"انسان جب الجھے ہوئے حالات کا شکار ہوتا ہے تو اس کا دماغ الجھ کر بیمار ہو جاتا ہے۔ غریبوں کی زندگی میں نہ زیادہ مسائل ہوتے ہیں' نہ زیادہ الجھنیں ہوتی ہیں۔ انہیں صرف دال روٹی کی فکر ہوتی ہے۔ اور روٹی تو کتے کو بھی مل جاتی ہے۔"

دوسرے ڈاکٹر نے تائید کی۔

"بے شک' دراصل یہ بے چارے دولت مند' مظلوم اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ انکم ٹیکس کا محکمہ انہیں سب سے زیادہ بیمار بناتا ہے وہ کسی طرح اس بیماری سے کترا کر نکلتے ہیں تو سرکار سے چھپائی ہوئی کالی دولت کو خرچ کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ یہ غریب لوگ نہیں جانتے کہ وہ دولت کمانے اور اسے چھپا کر خرچ کرنے کے دوران کتنے ذہنی عذابوں سے گزرتے ہیں اور دماغی مریض بن کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ نان سنس یہ دو ٹکے کا کلرک خواب دیکھنے والی عجیب سی الجھن کہاں سے لے آیا ہے؟ وہ کب تک یہاں آئے گا؟"

ڈاکٹر زبیری نے کہا۔ "بس اب آتا ہی ہوگا۔"

وہ سب دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے کے دونوں پٹ ان کی منتظر آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ انتظار کی سزا اکثر طویل ہوتی ہے اور وہ تمام دولت مند ڈاکٹر زندگی میں پہلی بار ایک غریب کلرک کے ہاتھوں سزا پا رہے تھے۔

ایک بوڑھا ڈاکٹر' جو اونچا سنتا تھا۔ وہ اپنی کرسی ذرا کھسکا کر ڈاکٹر زبیری کے پاس آگیا۔ پھر اپنے ایک کان میں سننے والے آلے کو لگا کر پوچھا۔

"ڈاکٹر! آپ نے کیا کہا تھا۔ میں اچھی طرح سن نہ سکا۔"

"میں نے کہا ہے کہ قیس نامی ایک شخص بالکل انوکھے انداز میں خواب دیکھتا ہے۔"

بوڑھا ڈاکٹر ہاں کے انداز میں گردن نہ ہلاتا تب بھی اس کی بوڑھی گردن ہلتی رہتی۔ اس نے پوچھا۔

"وہ کس قسم کے خواب دیکھتا ہے؟"

"رومانی خواب! ہر رات اس کے سپنے میں ایک حسینہ آتی ہے۔"

"ہوں........." اس کی گردن اثبات میں ہلتی رہی۔ "کیا وہ خواب میں آنے والی حسینہ کا نام بھی بتاتا ہے۔"

"جی ہاں.......... اس کا نام لیلیٰ ہے۔"

"ہی ہی ہی.........." بوڑھے ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تعجب ہے۔ تم سب ماہر نفسیات ہو کر قیس کی دماغی الجھن کو نہ سمجھ سکے۔"

ایک ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا آپ سمجھ گئے ہیں؟"

"بالکل۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ پہلے آپ بتائیں کہ کیا قیس نوجوان ہے؟"

"ہاں۔ وہ نوجوان ہے اور کنوارہ بھی ہے۔ اور غریب بھی ہے۔"

"پھر تو بالکل ہی سیدھی سی بات ہے۔ غریب نوجوان ایک بیوی کے اخراجات پورے نہیں کرسکتے اور آج کل کی لڑکیاں محبوبہ بننے کے لئے ایسے نوجوان کو لفٹ نہیں دیتیں۔ اس لئے وہ اپنی محرومیوں کو یا اپنی نوجوانی کی اس خوبصورت سی کمی کو خوابوں میں پورا کرتے ہیں۔ اس نے یقیناً لیلیٰ مجنوں کی داستان پڑھی یا سنی ہو گی۔ مجنوں کا اصل نام قیس تھا اور اس نوجوان کا نام بھی قیس ہے اور اسی کی مناسبت سے وہ خواب میں لیلیٰ نام کی محبوبہ کو دیکھتا ہے۔"

تمام ڈاکٹر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ ایک ڈاکٹر نے بوڑھے سے کہا۔

"محترم بزرگ! ہم گھاس کاٹ کر ماہر نفسیات نہیں کہلاتے ہیں۔ جو بات آپ نے سمجھائی' وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر زبیری نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ قیس کیے خواب دیکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ بالکل انوکھے انداز میں دیکھتا ہے۔"

"وہ انوکھا انداز کیا ہے؟" بوڑھے نے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

ڈاکٹر زبیری نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"وہ ایک خواب ہر رات قسط وار دیکھتا ہے۔"

"کیا؟" بوڑھے ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا؟ قسط وار خواب؟ یعنی تھوڑا ابھی' تھوڑا بعد میں؟"

"جی ہاں۔ قیس نے پہلی رات ایک خواب دیکھا۔ صبح آنکھ کھلی تو وہ خواب ادھورا رہ گیا۔ دوسری رات جب اس کی آنکھ لگی تو پچھلی رات جہاں سے خواب کا سلسلہ ٹوٹا تھا ٹھیک اسی جگہ سے دوسری رات اس کا تسلسل قائم ہوگیا۔ دوسری رات اس خواب کی دوسری قسط جہاں ختم ہوئی' تیسری رات اس خواب کی تیسری قسط پھر اپنے تسلسل سے شروع ہوگئی.........."

"ٹھہرو ٹھہرو.........." بوڑھے ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔

"تم تو کہتے ہی چلے جارہے ہو کچھ سمجھنے کا موقع تو دو.........."

پھر وہ دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا۔ "گزرا ہوا وقت اور دیکھا ہوا خواب' یہ دونوں کبھی واپس نہیں آتیں اور قیس اپنے رومانی خواب کی ایک قسط کے بعد دوسری اور تیسری قسطیں دیکھتا چلا جاتا ہے۔ نہیں' یہ کیسے ممکن ہے۔"

"واقعی یہ ممکن نہیں ہے.........." ایک ڈاکٹر نے تائید کی۔

ڈاکٹر زبیری نے پھر ایک بار میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے اپنے خواب کی چار قسطیں سنا چکا ہے اور آج وہ پانچویں قسط سنانے آئے گا۔"

"مگر وہ کہاں ہے؟"

"بس اب آتا ہی ہو گا۔"

تمام ڈاکٹر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

آہٹ پہ کان' دَر پہ نظر تھی کہ ناگہاں
آئی خبر کہ پاؤں میں مہندی لگی وہاں

وہاں سے بہت دور ایک فٹ پاتھ پر قیس کا پاؤں مہندی کی لالی کی طرح سرخ تھا۔ پیدل چلتے چلتے کہیں ایک لانبی سی کیل پرانے جوتے کو چھید کر ایڑی میں گھس گئی تھی۔ شام کو کراچی کی بسوں میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ لوگ بسوں کے باہر لٹک کر جمناسٹک کے کرتب دکھاتے ہوئے اپنے گھروں تک پہنچتے ہیں۔

پاؤں زخمی ہونے کے بعد وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ کسی بس میں سوار ہو کر کرتب دکھاتا۔ اپائنٹ منٹ کے مطابق ڈاکٹر زبیری کے پاس پہنچنا بھی ضروری تھا اور جیب میں رکشہ ٹیکسی کے پیسے بھی نہیں تھے۔ اس لئے وہ کسی ایسی بس کا انتظار کرنے لگا جس میں نسبتاً کم بھیڑ ہو۔

انتظار کرنے کے لئے وہ فٹ پاتھ کی ایک ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ انسان کو فرصت نہیں ملتی کیونکہ فرصت کے وقت سوچیں فرصت نہیں دیتیں' اس لئے وہ پانچ سال پہلے کی زندگی کے اوراق کھولنے لگا۔

☆------☆------☆

پانچ برس پہلے گوجرانوالہ میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر زبیری سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ کنوارہ ہے۔ اس ایک جھوٹ کے پیچھے بہت سی تلخ یادیں تھیں

جنہیں وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ جو آدمی کا دماغ ہے' یہ آدمی کی مرضی کے خلاف بھولا ہوا سبق گاہے بگاہے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ تین ماہ کے بعد قیس کے ماں باپ نے کہا

"اب تم ایک سے دو ہو گئے ہو۔ کہیں ملازمت کرو اور اپنی بیوی کا خرچ برداشت کرو۔"

بوڑھے ماں باپ نے یہ سوچ کر بیٹے کی شادی کی تھی کہ بیٹا دس جماعت پاس کرنے کے بعد بھی کہیں ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ شاید بہو کی قسمت سے اسے نوکری مل جائے۔ ہمارے ملک کے اکثر گھرانوں میں ایسے ہی عقیدوں کے تحت بیٹوں کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ قیس اپنی تین ماہ کی نئی دلہن کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ وہاں چھ ماہ تک سڑکوں کی دھول اڑاتا رہا' لیکن کسی نے اس کی بیوی کا خرچ پورا کرنے والی ملازمت نہیں دی۔ عارضی کام دھندوں سے اتنے ہی پیسے ملے کہ وہ تین وقت کھائے اور ہفتہ میں دو بار گوجرانوالہ جا کر اپنی بیوی سے مل سکے۔ ایک دن باپ نے بگڑ کر کہا۔

"تم گوجرانوالہ کے رہے نہ لاہور کے۔ نہ بیوی کے رہے نہ ملازمت کے۔ ایسے تو تمہیں کہیں بھی پکی ملازمت نہیں ملے گی۔ تم کہیں ایک جگہ ٹھکانے سے تب ہی رہ سکتے ہو' جب بیوی ساتھ رہے۔ تو برخوردار اپنا بوریا بستر باندھو اور بیوی کو لے کر یہاں سے جاؤ۔"

قیس کی ماں نے چاہا کہ بیٹے پر بہو کا بوجھ نہ پڑے مگر باپ نے کہا۔

"میں نے دنیا دیکھی ہے۔ جب مرد کے کاندھوں پر بوجھ پڑتا ہے تو اسے مردانہ وار اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ دو پیٹ کی فکر اسے کمانے پر مجبور کر دے گی۔ اسے بہو کے ساتھ جانے دو۔"

مختصر [illegible] بیوی کو لے کر کراچی آ گیا۔ بیوی کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر ایک نئے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ بشریٰ صرف حسین ہی نہیں تھی بلکہ بڑے [illegible]ب نظر کھینچتے ہوئے بدن کی مالکہ تھی۔ چادر لپیٹنے کے باوجود اسے دیکھنے والے پلک جھپکنا بھول جاتے تھے۔ قیس کراچی پہنچ کر ملازمت حاصل کرنے سے زیادہ اپنی بشریٰ کو چھپا کر [illegible]ی فکر میں مبتلا ہو گیا۔

اتنے بڑے شہر میں کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر وہ بشریٰ کی قد آور جوانی کو کہاں چھپاتا؟ پہلی رات ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانہ میں اس طرح گزری کہ

گزرتے ہوئے مسافر اسے نظر لگاتے رہے۔ چوروں سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا کہ سپاہیوں سے لگتا ہے۔ ایک سپاہی' جو حوالدار کہنے سے خوش ہو جاتا تھا' وہ ڈیوٹی دینے کے بہانے بشریٰ کے اطراف چکر لگاتا تھا اور بار بار مونچھوں پر تاؤ دیتا تھا۔ قیس کو بڑا تاؤ آیا' مگر قانون کے محافظ سے الجھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس نے بشریٰ کی چوکیداری کرتے ہوئے صبح کر دی۔ اس کی جیب میں سو روپے تھے اور بشریٰ کے جسم پر شادی کے زیورات تھے۔ حسین عورت اگر سونے کے زیورات سے لدی ہو تو پھر عیاش طبع حضرات کے علاوہ دو ٹکے کے چور بھی پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ تمام دن کتنے ہی اجنبی چہروں کو اپنے تعاقب میں دیکھتا رہا۔ دوسری رات انہوں نے منگھو پیر کی ایک جھگی میں گزاری۔ جھگی میں ایک میاں بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے۔ قیس نے ایک گوشے میں بشریٰ کا بستر لگا دیا مگر خود نہ سو سکا کیونکہ جھگی والا تمام رات ایک آنکھ سے ایک کروٹ سوتا رہا اور اس کروٹ کا رخ بشریٰ کی طرف تھا۔ دوسری صبح بشریٰ نے پریشان ہو کر کہا۔

"قیس! تم دو راتوں سے جاگ رہے ہو۔ اس طرح بیمار ہو جاؤ گے۔"

قیس نے کہا۔ "میں جب تک تمہیں ایک مضبوط دروازے کے پکے مکان میں نہیں رکھوں گا۔ اسی طرح جاگتا رہوں گا اور جاگتے جاگتے مر جاؤں گا۔"

"مریں تمہارے دشمن۔ یہ میرے گہنے لو اور انہیں بیچ کر کرایہ کا مکان تلاش کرو۔"

قیس نے اس کے زیورات بیچنے سے انکار کیا۔ وہ اصرار کرتی رہی۔ آخر ان کی بحث اس نتیجہ پر پہنچی کہ زیورات نہ بیچے گئے تو چھیننے اور جھپٹنے والے قدم قدم پر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زیورات والی کو بھی چھین کر لے جائیں' لہٰذا اسی دن وہ گہنے فروخت کر دیئے گئے۔ اس طرح قیس کی جیب میں تین ہزار روپے آ گئے۔

جیب میں پیسے ہوں تو انسان کیا نہیں خرید سکتا۔ شام تک بہار کالونی میں ایک کمرے کا مکان کرایہ پر مل گیا۔ کھانے پکانے کا ضروری سامان بھی خرید لیا گیا۔ بشریٰ کو فلمی گانے سننے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنے زیورات دیتے وقت یہ شرط بھی لگائی تھی کہ ایک چھوٹا سا ریڈیو اور سنگار کا سامان بھی آنا چاہیے۔ اس نے اپنی حسین بیوی کا یہ شوق بھی پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تاکید بھی کی۔

"دیکھ بشریٰ! یہ نیا شہر ہے۔ پتہ نہیں اس محلے کے لوگ کیسے ہیں۔ تُو سنگھار کرکے دروازے پر کبھی نہ جانا' نہیں تو چھوکرے اس گلی میں صبح و شام سیٹیاں بجاتے گزریں گے۔ میں کتنوں کے منہ پر ہاتھ رکھوں گا۔"

وہ دو راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ شام ہی کو اس نے گھر کے دروازے پر اندر سے تالا لگایا پھر فرش پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر چاروں شانے چت سو گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک وہ کبھی سو رہا کبھی جاگتا رہا۔ ابھی جیب میں آٹھ سو روپے تھے۔ کھانے پینے کی فکر نہیں تھی۔ ابھی زندگی کی زلفیں سلجھی ہوئی تھیں اس لئے وہ بشریٰ کی زلفوں میں الجھتا رہا۔ ایک ہفتہ بعد بشریٰ نے کہا۔

"اس طرح بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تمہیں کوئی کام دھندا کرنا چاہئے۔ ایک ہفتہ سے تم باہر نہیں نکلے۔ کبھی سودا لانے' پانی بھرنے یا سگریٹ لانے جاتے ہو۔ پھر آکر دروازہ اندر سے بند کر لیتے ہو۔"

وہ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں باہر جا کر کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر باہر جاتے ہی تیری فکر شروع ہو جاتی ہے۔ تُو یہاں اکیلی رہ جاتی ہے۔"

"تم میری فکر کیوں کرتے ہو' میں کوئی بچی تو نہیں ہوں۔"

"یہی تو مشکل ہے کہ تو بچی نہیں ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر بڑی اداسی سے بولی۔

"میں تمہارے لئے مصیبت نہیں بننا چاہتی۔ تم میرا گلا گھونٹ دو۔"

"ایسی باتیں نہ کر۔ تُو گلا گھونٹنے کے لئے نہیں گلے لگانے کے لئے ہے۔ تجھے اس قدر حسین بنانے سے پہلے اللہ میاں کو سوچنا چاہئے تھا کہ یہ دولت غریب کے گھر میں محفوظ نہیں رہ سکے گی۔"

"کیوں نہیں؟" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ کل سے میں کام کی تلاش میں جاؤں گا۔ مگر دروازے پر تالا لگا کر جاؤں گا۔"

"بشریٰ یوں چونک گئی جیسے اعتماد کے منہ پر زور کا طمانچہ پڑا ہو۔

"نہیں قیس! اس طرح محلے کی عورتیں مجھ پر ہنسیں گی۔ محلے کے نوجوان سمجھیں

گے کہ میں تمہارے بس کی نہیں ہوں' اس لئے تالا ڈال کر گئے ہو۔ تم لوگوں کو وہ سمجھانا چاہتے ہو جو وہ سمجھتے نہیں ہیں۔"

یوں اس بحث میں ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران قیس کام کی تلاش میں کئی بار گھر سے نکلا لیکن اس طرح کہ محلے کے ہی چکر لگاتا رہا۔ دور سے اپنے گھر کو دیکھتا رہا کہ بشریٰ دروازہ کھول کر تاک جھانک کرتی ہے یا نہیں؟ محلے کی ہر عورت کسی نہ کسی کام سے باہر نکلتی تھی اس مشینی شہر میں مرد اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کے لئے عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا ہے۔ صرف ایک بشریٰ ایسی تھی جو شوہر کی عدم موجودگی میں کبھی گھر کے دروازے پر بھی نہیں آئی۔

قیس کو جب کچھ اطمینان ہوا تو وہ محلے سے باہر جا کر کام تلاش کرنے لگا۔ وہ صبح جاتا تھا۔ پھر دو چار گھنٹے میں واپس آجاتا تھا۔ بشریٰ سب کچھ سمجھتی تھی۔ مگر چپ رہتی تھی۔ ایک ماہ بعد اس نے کہا۔

"سب پیسے ختم ہو گئے۔ آخری سو کا نوٹ رکھا تھا۔ وہ اگلے ماہ کا کرایہ دے دیا۔ اب کیسے گزارہ ہو گا؟"

"کیسے گزارہ ہو گا؟" اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے دو دن اور گزر گئے۔ جو راشن تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ آخر مجبور ہو کر اسے صبح سے شام تک کے لئے گھر سے باہر جانا پڑا۔ شام کو بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو کر واپس آیا تو بشریٰ نے اس کے آگے گرما گرم سالن اور روٹیاں رکھ دیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہارے پاس پیسے نہیں تھے' پھر یہ کھانا کیسے پک گیا؟"

"میں نے پڑوسن سے پچیس روپے ادھار لئے ہیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی کہ بھوکے پیاسے آؤ گے۔"

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بشریٰ محلے کی عورتوں سے میل ملاپ رکھے۔ اس طرح بے پردگی کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن مفلسی اور تنگدستی نے بشریٰ کے لئے پڑوسن کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نے مجبوراً قرض لیا لیکن بازار سے سودا کیسے آیا؟"

"پڑوسن کے لڑکے نے لاکر دیا۔"

"آں۔ مگر وہ تو نوجوان ہے؟"

"ہے تو سہی مگر وہ ہمارے دروازے پر نہیں آیا۔ اس نے سودا لاکر اپنی ماں دیا۔ اس کی ماں نے یہاں پہنچا دیا۔"

قیس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "اچھا۔" پھر بھوک سے مجبور ہو کر کھانے لگا۔

انسان رفتہ رفتہ حالات کے مطابق زندگی گزارنا سیکھ لیتا ہے۔ اس کی سمجھ آ گیا کہ وہ اپنی حسین بیوی کا پہریدار بن کر کبھی ملازمت حاصل نہیں کر سکے گا۔ جب ملازمت ملے گی تو صبح سے شام تک بشریٰ کو صرف اعتماد کے سہارے چھوڑ کر جانا ہو اس دنیا میں جہاں جہاں کراچی جیسے شہر ہیں' وہاں کے مرد اپنی عورتوں کے سلسلے پردے سے زیادہ اعتماد کو اہمیت دیتے ہیں۔

لاہور کی طرح اس شہر میں بھی اسے مستقل ملازمت نہ ملی۔ عارضی طور پر یہاں' کبھی وہاں کام کرتا رہا۔ وہ کبھی دو وقت اور کبھی ایک وقت کا کھانا کھا کر گزا کر رہے تھے۔ اتنی تنگدستی میں بشریٰ کا شوق نہیں بدلا تھا۔ وہ فلمی گانے سنتی تھی دوپہر کو قیس کھانے کے لئے نہیں آتا تھا اس لئے وہ بھی بھوکی رہ کر پیسے بچاتی تھی جب دس روپے تک جمع ہو جاتے تو وہ فلم دیکھنے کی ضد کرنے لگتی تھی۔

قیس کو اس کی یہ عادتیں پسند نہیں تھیں۔ پھر وہ سمجھوتے کے انداز میں سوچتا اتنی خشک زندگی گزارنے کے دوران کبھی کبھی تفریح کا بھی موقع نکالنا چاہئے۔ بشریٰ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے نہیں پہن سکتی تھی لیکن فلم کی ہیروئن کو رنگا رنگ لباس میں ناچتے گاتے دیکھ کر وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ قیس کو دکھانے کے سنگھار کرتی تھی مگر اسے داد نہیں ملتی تھی کیونکہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ کی ہیروئن سنگھار کرتی ہے تو ساری دنیا واہ واہ اور ہائے ہائے کرتی ہے۔ ایسے وقت وہ فلم دیکھتے دیکھتے ہیروئن کی جگہ پہنچ جاتی تھی۔ وہاں کم از کم اس کے سنگھار خوفزدہ ہونے والا شوہر نہیں ہوتا تھا۔

ہم اپنی زندگی میں جو کچھ نہیں پا سکتے' انہیں جاگتی آنکھوں کے خوابوں میں حاصل کر لیتے ہیں۔ انسان احمق ہے کہ دوسرے انسان سے اس کے حصے کی روٹی چھین اسے مارنا چاہتا ہے۔ ارے وہ تو روٹی کے بغیر بھی کچھ روز جی لیتا ہے۔ اسے مارنا ہے اس کے خوابوں کو اس سے چھین لو۔ عجیب ہے کہ انسانی معیشت میں خوابوں کا کیوں نہیں آتا۔"

قیس ایک برس تک محنت مزدوری کرتا رہا۔ اپنی عمر کو گنواتا رہا۔ بشریٰ کی جوانی کو خوابوں سے بہلاتا رہا۔ ایک روز وہ سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک نئے ماڈل کی کار سے ٹکرا گیا۔ ٹکرانے کے دوران اس نے صرف ایک چمکتی ہوئی کار دیکھی تھی۔ اس کے بعد نگاہوں کے سامنے کوئی نظارہ نہ رہا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنے سر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی دیکھیں۔ اس کا سینہ دکھ رہا تھا۔ ہاتھ بھی زخمی تھے' اور پٹیوں سے بندھی ہوئی اس کی ایک ٹانگ ہینگر سے اٹھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کا نام اور پتہ پوچھا۔ اس نے بڑی نقاہت سے بتایا' پھر بے ہوش ہو گیا۔ بستر کے دوسری طرف ایک پولیس انسپکٹر اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"ڈاکٹر! یہ تو پھر بے ہوش ہو گیا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں' یہ خطرے سے باہر ہے۔ آپ اس پتہ پر اس کے عزیزوں کو مطلع کر دیں۔"

وہ نام اور پتہ یاد کر کے انسپکٹر کے ساتھ باہر آیا۔ انسپکٹر نے اس کی کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"برکت صاحب! آپ کو نشہ کی حالت میں کار ڈرائیو نہیں کرنا چاہئے تھی۔"

برکت نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس غلطی ہو گئی۔ میں قیس سے اور اس کے رشتہ داروں سے نمٹ لوں گا۔ آپ مجھے تھانے کچہری کی مصیبتوں سے بچا لیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے انسپکٹر کے سامنے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول دیا۔ اس خانہ میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"برکت صاحب! آپ جیسی معزز ہستی کو کون نہیں جانتا ہے اس لئے میں نے جائے حادثہ میں آپ کا ڈرائیونگ لائسنس طلب نہیں کیا۔ وہاں جو لوگ تھے وہ آپ کے خلاف گواہی دینے نہیں آئیں گے۔ کیونکہ تھانے کچہری کے چکر لگانے سے سب ہی گھبراتے ہیں۔ ہسپتال والوں کی رپورٹ میں میرا بیان یہ ہو گا کہ ایک تیز رفتار کار قیس کو کچلتی ہوئی چلی گئی۔ اس کا تعاقب کرنے کے لئے مجھے وقت پر کوئی گاڑی نہ ملی۔

اس لئے میرا بھی فائدہ ہو گا۔ مجھے محکمہ سے ایک موٹر سائیکل مل جائے گی۔ میری گھر والی ڈرائیو اِن میں فلم دیکھنے کی بہت ضد کرتی ہے۔ کار نہ سہی' وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فلمیں دیکھ لیا کرے گی۔"

سیٹھ برکت نے سو سو کے دس نوٹ اس کی جیب میں رکھ دیئے۔ جب وہ کالونی پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ بشریٰ سنگھار کر کے اپنے قیس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دستک ہوتے ہی اس نے دروازہ کھولا تو سیٹھ برکت کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ عورتیں اس کی زندگی میں بہت آئی تھیں لیکن ایسا دمکتا ہوا حسن اور دہکتا ہوا شباب پہلی بار اس کی نظروں میں آیا تھا۔ پھر وہ ہوشربا نظارہ دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔

"کون ہو تم؟ میرے دروازے پر کیا لینے آئے ہو؟"

"میں قیس صاحب کے عزیزوں سے ملنے آیا ہوں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کی ہویا اے؟" وہ ایکسیڈنٹ کے معنی نہ سمجھ سکی۔

اس وقت تک محلے کے لوگ ایک دولت مند اور ایک پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے دروازے کے قریب جا کر بشریٰ سے کہا۔

"یہ کہتے ہیں کہ تمہارے میاں کو کہیں حادثہ پیش آیا ہے۔"

"اللہ خیر..........." بشریٰ کا کلیجہ کانپنے لگا۔

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "قیس کو ٹکر مارنے والا اپنی گاڑی میں فرار ہو گیا۔ یہ سیٹھ برکت صاحب ہیں۔ نہایت ہی نیک اور شریف انسان ہیں۔ انہوں نے قیس کو ہسپتال پہنچا دیا ہے۔"

دروازے کے پیچھے سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہسپتال کہاں ہے؟ مجھے وہاں لے چلو۔ میں یہاں کے راستے بھی نہیں جانتی..........."

یہ کہتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ایک سال کے عرصہ میں محلے والوں نے پہلی بار اس دروازے سے بشریٰ کو نکلتے دیکھا تھا۔ پڑوسن نے کہا۔

"بیٹی! تم پریشانی میں یونہی نکل آئی ہو۔ اچھا کوئی بات نہیں تم جاؤ۔ ہم

دروازے پر تالا لگا دوں گی۔"

قیس اسے صرف تالے کے پیچھے ہی نہیں' چادر کے پیچھے بھی چھپانا چاہتا تھا لیکن سہاگ اجڑ رہا ہو تو چادر کا خیال کسے رہتا ہے۔ گلی سے دور سڑک پر کار کھڑی ہوئی تھی۔ محلے والے کار تک اسے چھوڑنے آئے۔ جب وہ چلے گئے اور کار آگے بڑھ گئی تو اسے گھبراہٹ کے باوجود احساس ہوا کہ وہ دو اجنبیوں کے درمیان تنہا رہ گئی ہے۔

آگے جا کر تھانے کے سامنے انسپکٹر رخصت ہونے لگا۔ بشریٰ نے گھبرا کر پوچھا۔

"حوالدار صاحب! آپ جا رہے ہیں مگر ہسپتال ابھی تک نہیں آیا۔"

"گھبراؤ نہیں' برکت صاحب بہت شریف آدمی ہیں تمہیں ابھی ہسپتال پہنچا دیں گے۔"

سیٹھ برکت نے کہا۔ "انسپکٹر! اگر یہ پیچھے بیٹھی رہیں گی تو میری نیک نامی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آگے کہیں پولیس والے مجھ پر شبہ کریں گے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے وقت عیاش گاڑی والے کرائے کی عورتوں کو پچھلی سیٹ پر خریدے ہوئے سامان کی طرح رکھ کر لے جاتے ہیں۔ عورت اگلی سیٹ پر بیٹھے تو شبہ نہیں ہوتا کیونکہ ساتھ بیٹھنے والی بیوی' بیٹی یا بہن ہوتی ہے۔ کچھ نہ ہو تو کزن ضرور ہوتی ہے۔

انسپکٹر نے بشریٰ کو آگے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ کبھی یہ بات نہ مانتی مگر پولیس والا کہہ رہا تھا' اس لئے وہ انکار نہ کر سکی۔ کبھی قانون کے محافظ مجبور کرتے ہیں کبھی حادثے گھر کے باحیا دروازے کو کھول دیتے ہیں' کبھی غریبی ایک اجنبی کی کار میں ایک اجنبی کے پہلو میں بٹھا دیتی ہے۔

سیٹھ برکت نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ کیسی گلابی گلابی سی تھی۔ معلوم ہوا تھا انار دانوں کو دودھ کی سفیدی میں گھول کر ایک بھرے ہوئے جام کی طرح سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے ڈرائیونگ کے دوران اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ وہ سہم کر دروازے کی جانب کھسک گئی۔

"گھبراؤ نہیں' میں سگریٹ نکال رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی بشریٰ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس خانے میں سو سو کے نوٹوں کی بے شمار گڈیاں تھیں۔ بے شمار اس

لئے کہ بشریٰ کو سو سے زیادہ گنتی نہیں آتی تھی۔ وہ ان نوٹوں کو گنتے گنتے اپنی ساری جوانی گزار دیتی۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جلد ہی دروازہ بند ہو جائے لیکن سنہرے خوابوں کی تجوری کھلتی ہے تو خواب دیکھنے والوں کی مرضی سے بند نہیں ہوتی۔

سیٹھ برکت نے گاڑی کو ایک جگہ روکتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ اس خانہ میں سگریٹ ہے۔ پتہ نہیں میں نے کب وہاں سگریٹ کے بدلے روپے رکھ دیئے تھے۔ مجھے یاد ہی نہ رہا۔ بہرحال تم ذرا بیٹھی رہو میں سگریٹ لے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ کار کا دروازہ کھول کر چلا گیا۔ ڈیش بورڈ کا خانہ بھی کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ بشریٰ ایک دم سے متاثر ہو کر سوچنے لگی۔

"یہ کتنا دولت مند ہے۔ اتنے سارے روپے یوں چھوڑ گیا۔ جیسے دو چار پیسے ہوں۔ پتہ نہیں وہ یہاں کب سے روپے رکھ کر بھول گیا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ یہاں سگریٹ رکھے ہوئے ہیں۔ عجیب بے فکرا ہے۔ ایسے تو نہ جانے اس کے کتنے روپے چوری ہو جاتے ہوں گے۔ اگر اس میں سے میں کچھ نکال کر چھپا لوں تو اسے پتہ بھی نہیں چلے گا.......... توبہ توبہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں نے تو آج تک کبھی چوری نہیں کی.........."

کوئی چور ہو یا نہ ہو' ایسے وقت چوری کا خیال ضرور آتا ہے۔ کیونکہ اس کا قیس ہسپتال میں تھا۔ ہسپتال کے اخراجات تو ایک طرف رہے۔ کل صبح چولہا جلانے کے لئے ایک پیسہ نہیں تھا۔ پہلے پہل چوری کرتے ہوئے کسی طرح کی بے ایمانی کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔ وہ ڈرتی رہی۔ اتنے میں اس نے واپس آ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں میری برانڈ کا سگریٹ نہیں ملا۔ آگے دیکھا جائے گا۔"

"ہسپتال کتنی دور ہے؟"

ہسپتال تو قریب ہی تھا۔ مگر وہ راستے بڑھا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہم جلد ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ویسے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ وہ جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔"

وہ چپ رہی' اس نے کہا۔

"تم کہہ رہی تھیں کہ یہاں کے راستے نہیں جانتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی گھر سے نہیں نکلتی ہو۔ یا اس شہر میں پہلی بار آئی ہو۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ سیٹھ برکت نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔

"انسان چپ رہتا ہے تو اس کی تقدیر بھی ہمیشہ کے لئے چپ ہو جاتی ہے۔ کچھ لو۔ میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔ میری دولت یونہی اِدھر اُدھر پڑی رہتی ہے۔ ہاں جتنے نوٹ رکھے ہیں وہ سب اپنے دوپٹے میں سمیٹ لو۔ اب یہ تمہارے ہیں۔"

بشریٰ کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"کک.......... کوئی اپنے سگوں کو بھی ایک روپیہ نہیں دیتا' آپ مجھے اتنے روپے کیوں دینا چاہتے ہیں۔ میں تو آپ کی کوئی نہیں ہوں۔"

"انسان محبت سے ایک دوسرے کے کام آ کر سگوں سے بھی بڑھ کر اپنا بن سکتا ہے۔ تم غریب ہو تمہیں دولت کی ضرورت ہے۔ میں امیر ہوں' مجھے محبت کی ضرورت ہے۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں اب تک تمہارے ہی لئے بھٹکتا رہا ہوں.........."

"آ.......... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"تمہیں شاید میری باتیں بری لگیں گی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے آج تک تمہارے جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ تمہیں اس بات پر حیرانی ہوگی کہ میں یہ دولت کیوں ضائع کرتا ہوں۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہے کہ تم اپنے حسن و شباب کو غریبی اور محتاجی کے ہاتھوں کیوں لٹا رہی ہو۔ ہم دونوں احمق ہیں۔ تم چاہو تو میری کار' کوٹھی اور تمام دولت کو سنبھال کر رکھ سکتی ہو۔"

"آپ.......... آ.......... آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں کسی کی بیوی ہوں۔"

"تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟"

"کام دھندے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اچھی طرح گزارے کے لئے اچھا کام نہیں ملتا۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو برس ہوگئے۔"

"ان دو برسوں میں کبھی تم نے ایک شاندار کار میں بیٹھ کر گارڈن' ہل پارک' کلفٹن اور ہاکس بے وغیرہ کی سیر کی ہے؟"

بشریٰ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسے سبکی محسوس ہوئی کہ وہ شادی کے بعد بھی دنیا یہاں سے وہاں تک نہ دیکھ سکی۔

"کبھی تم نے دل کی گہرائیوں سے قہقہہ لگایا ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی مسرتیں آئی تھیں لیکن کوئی ایسی خوشی نہیں آئی تھی جو بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور کرتی۔ اگر کوئی ایسا وقت آتا تو اس قہقہہ کو شوہر یہ کہہ کر کچل دیتا کہ عورت کی ہنسی گھر سے باہر نہیں جانی چاہئے۔

سیٹھ برکت نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ غیر مرد کو اپنا نام نہیں بتاتی تھی۔ جانے کیوں وہ غیر نہیں لگا۔ بے اختیار اس نے اپنا نام بتا دیا۔

"کتنا پیارا نام ہے۔ بشریٰ کہتے وقت منہ بھر جاتا ہے۔"

اپنی تعریف سن کر کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی مگر اچھا لگ رہا تھا۔ گھر کی مرغی جو دال برابر تھی' اسے باہر آ کر پتہ چل رہا تھا کہ وہ مرغی نہیں' ایک عورت ہے اور اسے اتنا حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی زبان سے بھی اپنے متعلق کوئی صحیح رائے سن سکے۔ سیٹھ برکت نے کہا۔

"بشریٰ! یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ کھانے کو مل گیا تو کھا لیا ورنہ بھوکے رہ گئے۔ ایسے تو جانور زندگی گزارتے ہیں۔ تم انسان ہو' تمہیں زندگی کی تمام خوشیوں کو حاصل کرنا چاہئے' اور اپنی ہر آرزو کی تکمیل کرنی چاہئے۔"

"مم.........مگر کیسے؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھ رہی تھی۔

"تم میرے کام آؤ' میں تمہارے کام آؤں گا۔"

وہ ہسپتال کے احاطہ میں داخل ہوگئے۔ بات وہیں پر ختم ہوگئی لیکن ایسی باتیں اتنی آسانی سے کب ختم ہوتی ہیں۔ یہ خیال بشریٰ کے دماغ میں پک رہا تھا کہ وہ کس طرح سیٹھ برکت کے کام آسکتی ہے۔ ہسپتال کے کمرے میں پہنچ کر قیس کو دیکھتے ہی سیٹھ

برکت کی باتیں بھول گئی۔ اپنے سہاگ کو جگہ جگہ پٹیوں سے بندھا دیکھ کر اسے رونا آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"یہاں آپ ذرا بھی آواز نہ کریں۔ مریض گہری نیند سو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ صبح آکر ملاقات کریں۔"

اسے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی دوبارہ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ سیٹھ برکت نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ رونے سے کبھی مشکل آسان نہیں ہوتی۔"

"میں کیا کروں۔ قیس کو کچھ ہوگیا تو میرا کیا ہوگا؟ اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

"میں تمہارا ہوں۔ کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گی؟ مجھے اپنا نہیں سمجھو گی؟"

"آں؟" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا پھر آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"آپ مہربان ہیں۔ ایسے وقت جبکہ میرا کوئی نہیں ہے آپ اپنوں سے بڑھ کر سہارا دے رہے ہیں' مگر میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں گی؟"

"میں تمہیں جس اونچے مقام پر لے جاؤں گا' اتنی اونچائی تک لوگ پتھر نہیں پھینک سکیں گے۔"

"میں کبھی اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی۔"

وہ اسے ہورس شوز ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ وہاں مغربی موسیقی کی دھن میں مرد عورتیں رقص کر رہے تھے۔ رومانی جوڑے اپنی میزوں پر ایک دوسرے کے قریب جھکے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ بشریٰ نے ایسے مناظر فلموں میں دیکھے تھے۔ ایسے مناظر میں وہ سپنوں کی ڈور تھام کر ہیروئن کے روپ میں پہنچ جاتی تھی۔ پھر اس ڈور کو قیس فوراً ہی لگام کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

آج وہ بے لگام ہو کر سچ مچ اس رومانی ماحول میں پہنچ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر دنیا اتنی خوبصورت ہے تو پھر وہ پہلی بار اس دنیا میں جنم لے رہی ہے۔ وہ بھوکی تھی مگر پیٹ کی بھوک نہیں تھی۔ سیٹھ برکت نے اسے زبردستی کھانے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔

"شوہر کے اعتماد کو دھوکہ دینا ایک جذباتی فعل ہے۔ محبت صرف جذبات کے

سہارے نہیں ہوتی۔ اگر تم واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہو تو اس کی بھلائی کے لئے سوچو' اور سوچو کہ میرے مشوروں پر عمل کر کے ہی اس کے مستقبل کو خوشگوار بنا ہو۔ آئندہ وہ ملازمت کے لئے ٹھوکریں نہیں کھائے گا۔"

وہ سوچنے لگی۔ جب وہ رومانی ماحول سے نکل کر کار میں آئے تو آدھی رات گزرنے کو تھی۔ راستے میں سیٹھ برکت نے کہا۔

"اتنی رات کو تم اپنے محلے میں تنہا واپس نہیں جاسکتیں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا تو بدنامی بھی ساتھ جائے گی۔"

"ہاں' یہ میں بہت دیر سے سوچ رہی ہوں۔"

"کل صبح میں تمہیں ہسپتال لے جانے آؤں گا تب بھی لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"ہاں' میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ کل صبح ہسپتال کیسے پہنچوں گی۔"

سیٹھ برکت نے اسے ایک کوٹھی میں پہنچا دیا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"یہ آپ کہاں لے آئے؟"

"بشریٰ جو دولت میں تمہیں دے رہا ہوں' اسے حفاظت سے رکھنے کے لئے ایسی ہی مضبوط کوٹھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اسے اندر سے دیکھو' آج سے یہ تمہاری ہے۔"

کوٹھی ایک شاہی محل کی طرح آراستہ تھی۔ وہاں آرام و آسائش کا اتنا سامان تھا کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایرانی قالین' فوم کے آرام دہ صوفے' رنگین ٹیلیویژن' ہفت رنگ فانوس' ریشمی پردے اور ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ جہاں ہلکی ہلکی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہو جاتے تھے۔ اس نے تو مرنے کے بعد جنت کی توقع کی تھی۔ اب جیتے جی جنت میں پہنچتے ہی وہ خوشی سے چکرا کر برکت دینے والے برکت کے قدموں میں گر پڑی۔

دوسری صبح وہ ہسپتال پہنچی تو قیس نے سب سے پہلے دور کھڑے ہوئے سیٹھ برکت کو دیکھا پھر بشریٰ سے سوال کیا۔

"تجھے ہسپتال کا راستہ کیسے معلوم ہوا؟ یہ تیرے ساتھ کون ہے؟"

"یہ بہت شریف آدمی ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے ان کے ساتھ یہاں بھیجا ہے۔"

"مگر تو اس کے ساتھ اکیلی کیوں آئی؟"

"ہمارا کون ہے' جنہیں میں ساتھ لاتی؟ کیا تم چاہتے ہو میں یہاں نہ آؤں؟"

وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اگر بشریٰ ہسپتال میں اکیلی نہ آتی تو محلے میں اکیلی رہتی۔ اگر تنہا رہ بھی جاتی تو محلے کے نلکے سے گھر کے دروازے تک پانی لا کر کون دیتا؟ کپڑے دھونے کے لئے صابن اور کھانے کے لئے راشن کہاں سے آتا؟

قیس نے پریشان ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ بشریٰ نے کہا۔

"تمہیں فضول باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ حالات ایسے ہیں کہ مجھے تنہا گھر سے نکلنا ہی ہوگا۔"

اس نے مجبور ہو کر ایک گہری سانس لی۔

"میں ہاتھ پاؤں سے لاچار ہوں' تیرا گزارا کیسے ہوگا؟"

"میں نے تیرے علاج کے لئے اور اپنے گزارے کے لئے سیٹھ صاحب سے کچھ روپے ادھار لئے ہیں۔"

قیس کو یہ بات بری لگی مگر یہ بھی سوچنا پڑا کہ وہ سیٹھ صاحب سے نہ مانگتی تو محلے والوں سے مانگتی' اور کہیں بھی دینے والے کچھ تول اور مول کے بعد ہی دیتے ہیں اور بشریٰ کے پاس تول مول کے لئے کیا ہے؟

یہ سوچتے ہی اس کا سر چکرانے لگا۔ سیٹھ برکت نے آگے بڑھ کر کہا۔

"قیس! تم فکر نہ کرو۔ ہسپتال سے اچھے ہو کر آؤ گے تو میں تمہیں سات سو روپے کی ملازمت دوں گا۔ تمہاری بیوی نے جو قرض لیا ہے اسے تم تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دینا۔"

قیس کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ سیٹھ برکت کا احسان ماننے لگا کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی اسے ملازمت مل جائے گی۔ دوسرے دن بشریٰ پھر ملنے آئی تو قیس نے کچھ تبدیلی محسوس کی۔ قیس نے کہا۔

"تیرے لباس سے بہت اچھی خوشبو آ رہی ہے۔"

پہلے تو وہ گھبرا گئی' پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔

"سیٹھ صاحب کی کار میں اتنی خوشبو ہوتی ہے کہ کپڑوں میں لگ جاتی ہے۔ ان کی گاڑی ایئر کنڈیشنڈ ہے۔"

"اوہ۔" قیس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "تجھے ایئر کنڈیشنڈ بولنا آگیا.........."

"کیا مجھے اس دنیا میں رہ کر سیکھنا نہیں چاہئے۔"

اس نے جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"آج تیرے ساتھ سیٹھ صاحب یہاں نہیں آئے' کیا گاڑی میں بیٹھے ہیں؟"

بات یہی تھی۔ وہ سیٹھ برکت کو گاڑی میں چھوڑ کر آئی تھی' اس نے کہا۔

"سیٹھ صاحب ہمارے نوکر تو نہیں ہیں کہ روز یہاں آئیں ان کا ڈرائیور مجھے لایا ہے۔"

وہ پھر مطمئن ہوگیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ حالات سے مجبور ہو کر انسان اسی طرح مطمئن ہونے کا سبق سیکھتا رہتا ہے۔ وہ روز آتی تھی اور وہ روز طرح طرح کے سوالات کرتا تھا کیونکہ بشریٰ کچھ نہ ظاہر کرنے کے باوجود اپنے اندر کی تبدیلیوں کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک اس میں عجیب نکھار آگیا تھا۔ پہلے وہ گلابی سی تھی' اب رخساروں سے لہو کی سرخی جھلکتی تھی۔ چہرہ ایسا چکنا اور بال ایسے ملائم تھے جیسے بہت مہنگی کریم اور شیمپو استعمال کرتی ہو۔ آنکھوں میں خوشحالی کی ایسی چمک تھی کہ قیس کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

بائیس دن کے بعد وہ ڈسچارج ہو کر بشریٰ کے ساتھ ہسپتال سے باہر آیا۔ جس کار نے اسے ہسپتال پہنچایا تھا وہی کار اسے لینے آئی تھی۔ دھکا مارنے والے کی جگہ ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب گاڑی ایک کوٹھی کے دروازے پر رکی تو قیس نے پوچھا۔

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟"

بشریٰ نے کہا۔ "سیٹھ صاحب نے تجھے ملازمت کے سلسلے میں بلایا ہے۔"

وہ اپنی حسین بیوی کے ساتھ کوٹھی کے اندر آیا۔ اس کا سر آہستہ آہستہ چکرا رہا تھا۔ بشریٰ نے اسے فوم کے ملائم صوفہ پر بٹھایا تو وہ یوں دھنس گیا جیسے دلدل میں پھنس گیا ہو۔ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اس قدر حیران اور پریشان تھا کہ ایک شوہر بن کر کوئی سوال نہ کرسکا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد وہ واپس آئی تو قیس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے سامنے بشریٰ تھی یا اس بڑی کوٹھی کی بڑی بیگم صاحبہ تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اس کے بدن کا جو لباس تھا اس کا کپڑا کسی بیرونی ملک سے منگوایا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جو مہنگا میک اپ تھا وہ انتہائی بدصورت لڑکی کو بھی انتہائی خوبصورت بنا دیتا تھا جبکہ بشریٰ کا حسن کسی بناؤ سنگھار کا محتاج نہیں تھا۔ اس نے تو میک اپ کا سامان تیار کرنے والوں پر احسان کیا تھا اس کی ریشمی زلفوں کے خم بتا رہے تھے کہ وہ بائیس دن کی قلیل مدت میں زندگی کے کتنے ہی خم سے گزر چکی ہے۔ جیسے ساون کا جھولا امبوا کی ڈالی پر لچکتا ہے' ویسے ہی اس کی چال میں لچک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ ایک ادائے ناز سے صوفہ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری بشریٰ مر چکی ہے۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "ہاں' مر چکی ہے۔ تم مجھے یہی بے غیرتی دکھانے کے لئے یہاں لائی ہو؟"

"نہیں' یہ سمجھانے لائی ہوں کہ حالات سے کس طرح سمجھوتہ کیا جاتا ہے۔"

"سمجھوتہ میں نے نہیں تم نے کیا ہے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ تم بازاری عورتوں سے بھی بدتر ہو۔"

"بدتر تو بننا ہی تھا۔ محلے کے کتنے ہی لوگوں سے تم قرض لے چکے تھے جن کی ادائیگی باقی ہے۔ میں جوان ہوں اور مرد کہتے ہیں کہ خوبصورت بھی ہوں۔ میں جس کے آگے قرض کے لئے ہاتھ پھیلاتی وہ سود کے طور پر میری جوانی کا مطالبہ کرتا۔ کوئی شریف آدمی کہاں تک شرافت سے میری مدد کرتا۔ ہسپتال کا بل سولہ سو روپے تھا۔ اگر تم نے اس دنیا کو ذرا سا بھی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے تو ایمان سے بتاؤ کہ ایک جوان عورت کو سولہ سو روپے کی رقم کوئی یونہی دے دیتا ہے؟"

ایسے سوالات کے معقول جواب کبھی نہیں ملتے۔ اس نے غصے سے کہا۔

"تم مجھے مرنے کے لئے ہسپتال میں چھوڑ دیتیں اور خود عزت کی موت مر جاتیں۔"

"احتجاج کئے بغیر اور اپنے زندہ رہنے کا حق مانگے بغیر صرف جانور مرتے ہیں۔ ان بائیس دنوں میں میں نے سوچ سوچ کر راتیں گزاری ہیں۔ تب یہ بات میری سمجھ میں آئی ہے کہ غیرت کی بنیاد پر خاندانی منصوبہ بندی کی جائے اور پیدا ہونے والوں کو مارنے کی بجائے بے غیرتوں کو مارا جائے تو یکلخت دنیا کی آبادی کم ہو جائے گی۔ صرف

چند ہی غیرت مند زندہ رہیں گے۔"

"اپنی بے حیائی پر پردہ ڈالنے کے لئے فلسفیانہ باتیں نہ کرو۔"

"نہیں کروں گی۔ ایسے مرحلوں پر ایک انسان کو دوسرے انسان کی مجبوریاں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر تمہیں صرف اپنی مجبوریاں سمجھ میں آتی ہیں تو اپنے ہی اوپر غور کرو کہ میری بے غیرتی نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔"

وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے یہ زندگی نہیں مانگی تھی مگر بے غیرتی سے مل گئی تو اب وہ کیا کرے؟ کیا اس زندگی کو ختم کر دے؟ ایسے تو صرف گنتی کے چند لوگ ہوتے ہیں جو غیرت کے جوش میں جان دے دیتے ہیں۔ ورنہ زندگی میں کوئی حسن نہ ہو، کوئی مسرت نہ ہو، تب بھی روتے پیٹتے زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔

وہ اپنی زندگی کو ختم نہیں کر سکتا تھا' اس نے کہا۔

"میں جب تک بے غیرتی کے سولہ سو روپے ادا نہیں کروں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

وہ اٹھ کر جانا چاہتا تھا مگر ابھی نقاہت باقی تھی۔ اچانک اٹھنے کے باعث اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ آپ ہی آپ دوبارہ صوفے میں دھنس گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بشریٰ کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔

"جب تم اچھی طرح تندرست ہو جاؤ گے تو ہو سکتا ہے کہ محنت مزدوری کر کے سولہ سو روپے ادا کر دو۔ مگر تم میرے اس جذبہ کی قیمت ادا نہیں کر سکو گے جس کے تحت میں نے عورت کے مقام سے گر کر تمہارے لئے یہ رقم حاصل کی۔"

وہ صوفہ کی پشت سے سر ٹیک کر بڑی کمزور سی آواز میں بولا۔

"تم ز...ہ دولت' یہ کار' یہ کوٹھی اور عیش و عشرت کی خاطر خود کو گرایا ہے اور نام میرا لے رہی ہو کہ یہ سب کچھ میری خاطر کیا ہے تم کیوں مکاری سے باتیں کر رہی ہو؟"

"اگر میں مکار ہوتی تو تمہیں ہسپتال میں تمہارے حال پر چھوڑ کر اس ایئر کنڈیشنڈ ...گاہ میں آرام فرماتی رہتی۔ کسی کی قربانیوں کو اپنے نظریات کے ترازو میں تولو۔ قیس! جب میں تمہاری دلہن بن کر آئی تھی تو میں مکار نہیں تھی۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے تمہیں اپنی محبت دی۔ تمہیں اپنا جان کر اپنا سب کچھ تمہارے حوالے

...کر دیا۔ عورت زیورات کی بھوکی ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے مسائل حل کرنے کی خاطر اپنے تمام زیورات بھی بیچ دیئے اور جب میرے پاس زیورات نہ رہے اور جب بیچنے کے لئے صرف جوانی رہ گئی تو تم مجھے مکار کہہ رہے ہو۔"

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"واقعی تم مجبور تھیں مگر اب میں آ گیا ہوں۔ چلو یہاں سے واپس چلو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ میں بائیس دن سے اس محلے میں نہیں ہوں۔ اب وہاں جا کر لوگوں سے کیا کہو گے کہ میں اتنے دنوں کہاں رہی؟ پھر تم اس حالت میں کماؤ گے کیا' کھلاؤ گے کیا؟ جنت میں آ کر جہنم کی طرف واپس جانا محض نادانی ہے۔ میں نے عزت کا سب سے بڑا سرمایہ داؤ پر لگا کر صرف دولت ہی نہیں تجربات بھی حاصل کئے ہیں۔ ہوس کے بازار میں عزت کا سرمایہ واپس تو نہیں ملتا مگر اس کا منافع حاصل ہوتا رہتا ہے۔ یہ منافع تمہارے سامنے ہے۔ میں ایسی جگہ داشتہ بن کر رہتی ہوں' جہاں سے تمہاری ملازمت اور تمہاری رہائش وغیرہ کے انتظامات کر سکتی ہوں۔"

"مجھے ایسی ملازمت نہیں چاہئے۔"

اس بار اس کا سر نہیں چکرا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ بشریٰ نے دروازے پر آ کر پوچھا۔

"تم اس حالت میں کہاں جاؤ گے؟"

"جہنم میں.......... میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم غیرت مند ہو۔ سولہ سو کا قرض ادا کرنے کے لئے تمہیں زندہ رہنے کی ضرورت ہے اور زندہ رہنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ اپنا پرس ٹٹولنے لگی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"میں تمہارا ایک پیسہ نہیں لوں گا۔"

ایسا کہتے وقت اسے خیال آیا کہ ابھی اپنے گھر جا کر ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ ...نے کے لئے دواؤں کے لئے' ملازمت تلاش کرنے کے لئے' محلے والوں کا اور ...کا قرض اتارنے کے لئے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ بشریٰ نے کہا۔

"قرض اتارے بغیر بھوکے مرو گے تو بے غیرتی تمہاری قبر تک جائے گی۔ اگر ... سے تھوڑا قرض اور لے کر اپنی جان بناؤ گے اور محنت مزدوری سے قرض ادا کرو گے تو تمہارا ضمیر تمہیں کبھی بے غیرت نہیں کہے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ہزار روپے اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ پھر ... اعتراض سننے سے پہلے ہی دروازہ بند کر دیا۔ وہ سہاگن جو ہر شام اپنے شوہر کے لیے دروازہ کھولتی تھی اس نے ایک داشتہ بن کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہمارے ہاں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جو شوہر کی زندگی میں اپنے سہاگ کا ماتم کرتی ہیں۔

قیس نے مکان کا کرایہ اور محلے والوں کا قرض ادا کر دیا۔ پڑوسیوں سے کہہ ... کہ اس نے بیوی کو میکے بھیج دیا ہے۔ اس رات فرش پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر سونے ... پہلے اس نے خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ کیونکہ کرایہ اور تمام قرض ادا کرنے کے ... محلے میں اس کی عزت رہ گئی تھی۔ اب بشریٰ کی پہریداری کرنے کی فکر نہیں تھ... صرف بشریٰ کا قرض ادا کرنے کی فکر تھی۔ اس نے ایک نئے عزم سے سوچا کہ ... تندرست ہوتے ہی یہ قرض بھی ادا ہو جائے گا۔

دو روز بعد وہ اپنے گھر سے نکل کر کام دھندے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ ... وقت ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی اس کا تعاقب کرنے لگا۔ قیس مین روڈ پر پہنچ ... صدر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جب بس چلنے لگی تو وہ شخص اس کے پاس آ کر ... گیا۔ اس نے جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا ... دوسرا سگریٹ قیس کو آفر کیا۔

"شکریہ! میں سگریٹ نہیں پیتا۔" قیس نے انکار کیا۔

وہ اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"بڑی مشکل ہے۔ ہم اچھی سے اچھی تنخواہ دیتے ہیں مگر کوئی کام کا آدمی ... ملتا۔"

قیس نے چونک کر پوچھا۔

"کیسا کام؟ جناب! میں میٹرک پاس ہوں محنت سے کبھی جی نہیں چرا... لائق کوئی خدمت ہو تو آپ مجھے آزما کر دیکھ لیں۔"

اس شخص نے قیس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تم محنتی نظر آتے ہو۔ میں سیٹھ علی بھائی ولی بھائی کی کمپنی کا برانچ منیجر ہوں۔ کل صبح تم اپنا سرٹیفکیٹ لے کر آ جانا' کلرک کا جاب ہے۔ پانچ سو روپے ماہوار ... کریں گے۔"

بات طے ہو گئی۔ دوسرے دن برانچ منیجر نے اپنی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے بشریٰ کی آواز سنائی دی۔ منیجر نے کہا۔

"بیگم صاحبہ! قیس صاحب کی ملازمت ہو چکی ہے.........."

☆------☆------☆

تمام ڈاکٹر بے زار ہوکر اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ قیس لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ڈاکٹر زبیری نے غصہ سے کہا۔

"ہم تمہارے نوکر تو نہیں ہیں کہ انتظار میں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔ کہاں مر گئے تھے؟"

قیس نے لنگڑاتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

"جناب! آپ کی گاڑیوں کا ایک پہیہ پنکچر ہوجائے تو آپ لوگ ایک قدم نہ چل سکیں۔ میری ایک ٹانگ پنکچر ہوگئی میں پھر بھی لنگڑاتا ہوا دیر سے سہی مگر یہاں تک پہنچ گیا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" ڈاکٹر قربان علی نے حکم دیا۔

وہ بڑی سی میز کے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ تمام ڈاکٹر اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔

"تم قسط وار خواب دیکھتے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہ میں ڈاکٹر زبیری صاحب کو بتا چکا ہوں۔"

"ہم تم سے پوچھتے ہیں۔ تم براہ راست جواب دو کتنے دنوں سے یہ خواب دیکھ رہے ہو؟"

"پانچ دنوں سے.......... میں ڈاکٹر صاحب کو چار قسطیں سنا چکا ہوں۔"

"کیا تم کسی فرم میں ملازمت کرتے ہو؟"

"کرتا تھا' گیارہ ماہ پہلے مجھے اس ملازمت سے نکال دیا گیا۔"

"ادھوری باتیں نہ کرو۔ تفصیل سے بتاؤ تاکہ ہم تمہارے خواب کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔"

وہ میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کہنے لگا۔

"پانچ برس پہلے میری زندگی میں ایک حسین عورت آئی تھی۔ میں اسے صرف عورت کہوں گا۔ اس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ میں اسے گالیاں بھی دیتا ہوں اور اس کی عزت بھی کرتا ہوں۔"

تمام ڈاکٹر اسے حیرانی سے دیکھنے لگے' ایک نے پوچھا۔

"یہ کیا بات ہوئی' گالیاں بھی دیتے ہو اور عزت بھی کرتے ہو۔"

"اس نے مجھ سے بے وفائی کی' اس لئے منہ سے گالیاں نکلتی ہیں۔ جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس نے صرف اپنی خوشی کے لئے نہیں' میری بھی بھلائی کے لئے بے وفائی کی ہے تو دل میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ میری اس دوغلی کیفیت کو یوں سمجھیں کہ کبھی ہم سب ناکام ہوکر اپنی زندگی کو گالیاں دیتے ہیں اور کبھی کامیاب ہوکر اسی زندگی پر فخر کرتے ہیں۔ دراصل ہم پیدائشی دوغلے ہیں۔"

وہ لوگ بوکھلا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ایک نے بگڑ کر کہا۔

"بکواس مت کرو' آگے بتاؤ کیا ہوا؟"

"آگے یہ ہوا کہ وہ ایک دولت مند کا ہاتھ تھام کر مجھ سے بہت آگے نکل گئی۔ اس نے میرا علاج کرانے کے لئے سولہ سو روپے قرض دیئے۔ جب میں ہسپتال سے آیا تو اس نے ایک ہزار روپے اور دیئے تاکہ میں زندہ رہ کر قرض ادا کرسکوں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد میں اس کی طرف سے مزید امداد قبول نہیں کروں گا لہٰذا اس نے دوسروں کے ذریعے مجھے ایک جگہ ملازمت دلادی۔

پہلے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ملازمت بھی اسی کے طفیل ملی ہے۔ میں نے سوچا ہر ماہ سو روپے بچا کر اس بے وفا عورت کا قرض ادا کرتا رہوں گا۔ جب پہلی تنخواہ لے کر میں اس کی کوٹھی میں گیا تو وہ وہاں سے کسی دوسری کوٹھی میں منتقل ہوچکی تھی۔ کوٹھی کے موجودہ مکین اس کا پتہ نہیں جانتے تھے۔ میں ہر ماہ اپنی تنخواہ سے سو روپے الگ نکال کر رکھتا تھا اور اسے تلاش کرتا رہتا تھا مگر وہ مجھے آج تک نظر نہیں آئی۔

گیارہ ماہ پہلے مجھے اچانک ہی ملازمت سے نکال دیا گیا۔ میں نے برانچ منیجر سے فریاد کی۔ اس نے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ اوپر سے یہی حکم آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ اوپر والا کسی کی روزی چھیننے کا حکم نہیں دیتا۔"

"مسٹر قیس! تم کس اوپر والے کی بات کر رہے ہو؟ ہمارے اوپر تو صرف ایک بڑا صاحب ہوتا ہے۔ اس کے نیچے کرائے کی ایک بیگم صاحبہ ہوتی ہے۔ جس بیگم صاحبہ نے تمہاری سفارش کی تھی۔ اب اس کی جگہ دوسری کرائے کی بیگم صاحبہ آگئی ہے' اس لئے تمہاری بھی چھٹی!"

کرائے کی بیگم کا ذکر آیا تو میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ وہی بے وفا عورت ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے اس بیگم صاحبہ کا نام پتہ بتائیں جس نے میری سفارش کی تھی۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں نے کسی بیگم کو آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ صرف فون پر گفتگو ہوتی ہے۔ مجھے اس کا نام اور موجودہ پتہ معلوم نہیں ہے۔"

بہرحال میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا گیا۔ وہ سفارش کرنے والی عورت بھی جہاں تھی وہاں سے سیٹھ صاحب نے اسے باہر تھوک دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ تھوک کس کی ہتھیلی پر گیا ہوگا اور کون اسے چاٹ رہا ہوگا' مجھے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ میں ملازمت کے فریب میں آکر تقریباً تین برس تک اسی عورت کی کمائی کھاتا رہا۔ تب......... تب میں نے غصہ کی حالت میں اسے قتل کر دیا.........."

"قتل کر دیا؟" وہ سب چونک کر بلکہ سہم کر اسے دیکھنے لگے۔

"تت......... تم قاتل ہو؟" ایک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' ایک رات مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں ایک چوڑے پھل کا چاقو جیب میں رکھ کر اسے ہلاک کرنے کے لئے گھر سے نکل گیا حالانکہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ میں بس غصہ میں نکل آیا تھا۔ اگر وہ اور زندہ رہتی تو آئندہ بھی اسی طرح میرا پیٹ بھرتی رہتی۔ اس لئے میں اس قصہ کو تمام کر دینا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے میں اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں ایک بار وہ عورت مجھے ہسپتال سے لے گئی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا! باہر تاریکی تھی مگر اندر روشنی نظر آرہی تھی۔ کوٹھی کے دروازے رات کو احتیاطاً اندر سے بند کر دیئے جاتے ہیں لیکن وہاں کے دروازے میرے لئے کھلے ہوئے تھے۔ میں مختلف کمروں اور کاریڈور سے گزرتا ہوا اس کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔

خواب گاہ میں ہلکی نیلی خواب آور سی روشنی تھی۔ اس دھیمی دھیمی سی رومان پرور روشنی میں وہ بستر پر نظر آرہی تھی۔ اس کے بدن پر برائے نام لباس تھا۔ ایک باریک سا ریشمی کپڑا اس کی جوانی کو چھپانے کے بجائے اشاروں میں اور اجاگر کر رہا تھا۔ وہ اس طرح ہزاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی جیسے کھلے ہوئے سینے پر چاقو کی دھار آزمانے کی دعوت دے رہی ہو۔

پلنگ کے سرہانے والی میز پر ایک شخص کی تصویر تھی۔ میں نے اسے ہسپتال میں بھی دیکھا تھا۔ وہ سیٹھ برکت تھا۔ اس عورت کے سرہانے میری تصویر ہونی چاہئے تھی۔ اس کے یار کی تصویر نے میرے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ میں نے جیب سے چاقو نکالا۔ پھر اس کے چوڑے پھل کو اس سینے میں اتار دیا جو کبھی میرے سینے سے لگتا تھا۔

اچانک ہی رات کے سناٹے میں پولیس کی سیٹیاں چیخنے لگیں۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ میں کھڑکی سے کود کر پچھلے برآمدے میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد دو شخص خواب گاہ میں آئے پھر اس کی لاش کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔ ان میں سے ایک پولیس انسپکٹر تھا۔ دوسرا شخص اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ سیٹھ برکت نے پریشان ہو کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب! یہ میری داشتہ تھی لیکن قتل کا کیس عدالت میں جائے گا تو اسے داشتہ کہنے میں میری بدنامی ہوگی۔"

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ وہ عیاش دولت مند بدنام ہونے کے لئے جلد ہی عدالت میں پہنچے گا۔ اچھا ہوا میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کے اعمال خود اسے ماریں گے۔ انسپکٹر نے کہا۔

"قاتل ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا مجھے فوراً ہی اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔"

وہ دروازے کی طرف دوڑتا ہوا گیا۔ میں پچھلے برآمدے سے نکل کر پائیں باغ میں آیا۔ جب وہاں سے احاطہ کی دیوار پھلانگنے لگا تو سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "ہالٹ........." مگر میں نہیں رکا۔ دیوار کے دوسری طرف پہنچتے ہی فائرنگ شروع ہوگئی۔ پھر تو یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف گولیاں چل رہی ہیں۔ میں کس طرح اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا' مجھے خود ہوش نہیں تھا' میرے سامنے پھانسی کا پھندہ لٹک رہا تھا اور میں اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔

بھاگتے بھاگتے میری سانس پھولنے لگی۔ ٹانگیں دکھنے لگیں۔ قانون کے محافظ مجھے نہیں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھاگتے بھاگتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہوں۔ تب ایک ویران سڑک کے کنارے ایک خوبصورت سی کار نظر آئی۔ چھپنے کے لئے بس وہی ایک جگہ تھی۔ میں اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

ہائے، میں جیسے تیز دھوپ میں دوڑتے دوڑتے ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اتنی حسین تھی جیسے چاندنی ایک دوشیزہ کے روپ میں مجسم ہوگئی ہو۔ وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ہیلو!"

میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! میرا نام قیس ہے۔ وہ لوگ مجھ پر گولیاں برسا رہے ہیں۔ جلدی گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گیئر بدلے پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی بولی۔

"پہلے لوگ قیس پر پتھر برساتے تھے، اب گولیاں برساتے ہیں۔ اسی لئے میں اس محمل میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میرا نام لیلیٰ ہے۔"

اتنا کہہ کر قیس خاموش ہوگیا۔ تمام ڈاکٹر بھی خاموشی سے اس کا منہ تک رہے تھے۔ جب وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولا تو ایک نے پوچھا۔

"آگے کہو۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر میری آنکھ کھل گئی۔"

"کیا؟" تمام ڈاکٹر چیخ پڑے۔ ایک نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا تم اپنا خواب سنا رہے تھے؟"

"جی ہاں! پہلی رات میں نے یہی خواب دیکھا تھا۔ میں نے سلسلہ دار خواب کی قسط سنائی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قتل خواب میں ہوا تھا؟"

قیس کوئی جواب دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی ڈاکٹر زبیری نے کہا۔

"نہیں سیٹھ برکت کی کوٹھی میں وہ سچ مچ قتل کی گئی ہے۔"

قیس بوکھلا کر ڈاکٹر زبیری کا منہ تکنے لگا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے خواب میں اسے قتل کیا ہے۔ اس نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ سیٹھ برکت کو جانتے ہیں؟"

"میں اسے نہیں جانتا۔ تم نے آج سے چار دن پہلے مجھے اپنے خواب کی پہلی قسط سنائی تھی۔ اس میں سیٹھ برکت کا ذکر تھا۔ دوسرے دن میں نے اخبار میں اس قتل کی روئیداد پڑھی۔ اس میں سیٹھ برکت اور اس کی مقتول داشتہ کی پوری ہسٹری بیان کی گئی تھی۔ پہلے میں نے یہی سمجھا کہ تمہیں نیند میں چلنے پھرنے کی عادت ہے۔ تم نیند کی حالت میں اس کی خواب گاہ تک گئے اور اسے قتل کر دیا۔ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس مفرور قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔"

قیس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ ڈاکٹر زبیری نے مسکرا کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں، تمہیں نیند میں چلنے کی عادت نہیں ہے۔ تیسرے دن کے اخبار میں لکھا ہوا تھا کہ سیٹھ برکت کے جوان بیٹے نے خود کو قانون کے حوالے کرتے ہوئے بیان دیا کہ اس کا باپ سیٹھ برکت اس کی ماں کے حقوق چھین کر ایک داشتہ کو دے رہا تھا۔ بیٹا اپنی ماں سے ہونے والی اس ناانصافی کو برداشت نہ کرسکا۔ اس نے اس داشتہ کو قتل کر دیا۔"

قیس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لینے کے بعد سوچا۔ خواب انسان کو الجھا دیتے ہیں۔ میں خواب میں بشریٰ کو قتل کرنے گیا تھا حالانکہ وہ گیارہ ماہ پہلے داشتہ کے عہدے سے برخاست کر دی گئی تھی اور میں کلرک کے عہدے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اخبارات کے مطابق جو عورت قتل کی گئی ہے وہ بشریٰ کے بعد آنے والی داشتہ تھی۔

ایک ڈاکٹر نے بیزار ہو کر کہا۔

"ہم خواہ مخواہ قتل کے کیس پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ہمارا موضوع سلسلہ دار خواب ہے۔"

دوسرے ڈاکٹر نے قیس کو مخاطب کیا۔

"تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی سے بتاؤ کہ دوسری رات تم نے خواب میں کیا دیکھا؟"

قیس کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا' پھر اس نے کہا۔

"پہلی صبح جہاں سے خواب کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ دوسری رات ٹھیک وہیں سے خواب کا تسلسل قائم ہوگیا تھا۔ میں اس کی کار میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"پہلے لوگ قیس پر پتھر برساتے تھے اب گولیاں برساتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنے ا محمل میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میرا نام لیلیٰ ہے.........."

اس کا نام سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں زندگی کے صحرا میں ایک مدت سے لیلیٰ کے لئے بھٹک رہا تھا اور اب اپنی منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ اس کے لباس سے بہت ہی ہلکی ہلکی سی میٹھی میٹھی سی خوشبو انگڑائی لے رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے بدن کی خوشبو کیسی ہ انگیز ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم اب تک کہاں تھیں؟"

"میں اب تک تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی۔ قدرت کے ان دیکھے ہاتھ میرے بدن کے سانچے میں پھولوں کا رس نچوڑ رہے تھے' میرے لبوں پر کلیوں کا پہلا تبسم اور آنکھوں میں حیا کا ابدی کاجل رچا رہے تھے۔ دھنک کے سارے رنگ لے کر میری اداؤں میں بھرے گئے۔ میرے قد کو انگڑائی کی اٹھان تک لایا گیا۔ میری آرزوؤں کو ساون کے جھولے میں بٹھایا گیا۔ پھر میرے دل کو قیس کے نام کی دھڑکنیں دی گئیں۔ اس کے بعد مجھے آسمان سے اتار اگیا تو میں سیدھی تم سے ملنے چلی آئی.........."

میں نے آسودگی کی ایک طویل سانس کھینچی۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ کوئی میرے لئے آسمان سے اتر کر آئے۔ زمین کی عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔ بے وفا نہ ہوں تو ہمارے گھر کے کمزور دروازے سے چرالی جاتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟"

"میں تمہارے ساتھ جینے اور تمہارے ساتھ مرنے آئی ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہمارے ہاں دوسروں کی عورتوں کو چرانے کا دستور ہے۔"

"تم فکر نہ کرو' مجھے کوئی نہیں چرائے گا۔"

"یہ بات تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ایسے کہ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ کوئی مجھے روٹی کا لالچ نہیں دے گا۔ میرا یہ لبا

بھی پرانا یا میلا نہیں ہوتا۔ یہ ہر فیشن کے ساتھ بدلتا جائے گا۔ اس لباس کو کوئی ہوس کی انگلیوں سے نہیں اتار سکے گا۔ روٹی اور کپڑے کے بعد مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اس کی بھی فکر نہیں ہے۔ میرے چھپنے کے لئے تیری آغوش ہے۔ سونے کے لئے گل پوش وادیاں ہیں اور اوڑھنے کے لئے آسمان ہے۔"

میں خوش ہوگیا۔ اس لئے کہ اب میں خوش نصیب ہوگیا تھا۔ اب میرے پاس جو دولت آئی تھی' اسے کوئی چرا نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس کا پہرے دار بن کر رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے کہیں ملازمت تلاش کرنا بھی ضروری نہ تھا۔ یوں بھی عشق کے صحرا میں قیس کو ملازمت تلاش کرنے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔"

ایک ڈاکٹر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"تم خواب کا ذکر کم کر رہے ہو اور باتیں زیادہ بنا رہے ہو۔ کام کی باتیں کرو۔"

"عشق میں یہی کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ زلف و رخسار کی باتیں کرتے کرتے ہمارے شاعروں نے عمریں گزار دیں۔ میرا وہ دوسرا خواب بھی انہی باتوں میں گزر گیا۔ میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اتنا حسین خواب گزر جائے۔ مگر مجبوری تھی۔ زندہ رہ کر تیسری قسط دیکھنے کے لئے محنت مزدوری کرنا ضروری تھا' اس لئے میں کام دھندے کی تلاش میں چلا گیا۔"

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمیں تمہارے اس رومانی خواب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم صرف اس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں کہ تم سلسلہ وار خواب کیسے دیکھتے ہو؟ بہتر ہے کہ جلد از جلد اس خواب کی قسطیں سنا ڈالو۔"

قیس نے تیسری قسط کا آغاز کیا۔

"میں نے تیسری بار پھر خود کو لیلیٰ کی ایئرکنڈیشنڈ محمل میں پایا وہ کار تھی مگر لیلیٰ اسے محمل کہتی تھی۔ اس خواب میں ہم نے ایک ساتھ کئی دن گزارے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گل پوش وادیوں اور مرغزاروں میں لے گئی۔ میں اسے شہر کی تفریح گاہوں کی سیر کراتا رہا۔ پھر میں اسے ایسی جگہ لے گیا جہاں مقابلہ حسن کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ وہاں لیلیٰ کو دیکھتے ہی سب کی آنکھیں اس پر لگ گئیں۔ میں اسے تماشا دکھانے لے گیا تھا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود تماشا بنے' میں نے کہا۔

"لیلیٰ! یہاں سے چلو' میں تمہارے حسن کی نمائش نہیں کرانا چاہتا"

"ٹھیک ہے۔ میرا حسن صرف تمہارے لئے ہے۔ یہاں سے چلو۔"

ہم وہاں سے پلٹ کر جانے لگے۔ لوگوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ فوٹو گرافرز لیلیٰ کی تصویریں اتارنے لگے۔ شہر کے بڑے بڑے دولت مند اس کے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ انہوں نے مقابلہ حسن میں شریک ہونے کے لئے لیلیٰ سے التجائیں کیں لیکن میری لیلیٰ نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ یہی کہ اس کا حسن صرف قیس کے لئے ہے۔

کتنے ہی دولت مندوں نے ہیرے جواہرات کا تحفہ پیش کیا۔ سادے چیک پر دستخط کرکے اس کے آگے رکھ دیئے کہ وہ جتنی رقم چاہے ان پر لکھ لے لیکن وہ تمام دولت کو ٹھکرا کر میرے ساتھ چلی آئی۔ میں واقعی دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تھا۔ دنیا کے تمام دولت مند اپنی تمام دولت کا زور لگا کر بھی میری محبوبہ کو نہیں خرید سکتے تھے۔

وہاں سے ہم ایک بہت ہی شاندار ریسٹورنٹ میں آئے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور لیلیٰ کو کبھی بھوک نہیں لگتی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں کھانے کے دوران تنہا رہ جاتا ہوں' اس لئے کہ تم ساتھ نہیں دیتیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کیا کروں مجھے بھوک نہیں لگتی۔ ویسے ان کھانوں سے اتنی اچھی مہک آتی ہے کہ چکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو پھر میرا ساتھ دینے کے لئے ذرا چکھ لیا کرو' بشرطیکہ تمہارا معدہ ان کھانوں کو قبول کر سکے۔"

"میرے جسم کے باہر اور اندر کوئی خرابی یا کمزوری نہیں ہے اس دنیا کی کوئی بیماری مجھے چھو نہیں سکتی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ آؤ بسم اللہ کرو۔"

وہ پہلی بار میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئی۔ اسے کھانا بہت پسند آیا۔ وہ میرے آخری لقمہ تک میرا ساتھ دیتی رہی۔ جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو اس پر عجیب سا نشہ طاری تھا۔ وہ میرا سہارا لئے مستی میں لڑکھڑاتی ہوئی ہنستی بولتی جارہی تھی۔ پتہ نہیں ہماری کار کہاں رہ گئی تھی۔ خوابوں میں اکثر اس بات کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچ گئے؟

ہم اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ اب سے پہلے ہم کسی خواب گاہ میں نہیں رہے تھے۔ ہمارے دل ایک تھے مگر جسموں کے درمیان فاصلہ تھا۔ یعنی ہم ایک دوسرے

لگ پڑتے تھے لیکن پہنچے تک نہیں پہنچتے تھے۔ اس رات وہ بے اختیار میری طرف کھنچی چلی آئی۔ میری گردن میں اپنی مرمریں بانہیں ڈال کر کہا۔ "پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں ایک سرور سا چھایا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم سے چپک جاؤں۔ تمہارے وجود میں سما جاؤں۔ تم نے مجھے کیا کھلا دیا ہے؟"

تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے گندم کی روٹیاں کھلائی تھیں..........."

تمام ڈاکٹر گم صم بیٹھے ہوئے تھے۔ نگران کے اندر چھپی چھپی سی بے چینی تھی۔ وہ گندم کے نتائج معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میری آنکھ کھل گئی۔"

تمام لوگ اسے جھلا کر دیکھنے لگے۔ قیس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اکثر قسطیں ایسے مقام پر ختم ہوتی ہیں جہاں سے ایک نئے سسپنس کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے بڑے تحمل سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ خواب کا سلسلہ جہاں ختم ہوا ہے' چوتھی قسط میں ٹھیک وہیں سے شروع ہوگا۔ ہاں تو قیس چوتھی قسط سناؤ۔"

قیس نے کہا۔ "چوتھی قسط میں واقعات نے چھلانگ لگائی۔ اب ہم خواب گاہ میں نہیں تھے۔ یعنی بعض اوقات خوابوں میں پتہ نہیں چلتا کہ ہم کہاں وقت گزار رہے ہیں۔ بہرحال اب لیلیٰ کے بدن پر آسمانی لباس نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے دامن پر گندم کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ اب وہ موجودہ فیشن کی تراش کے مطابق چست لباس پہنے ہوئے تھی اور تمام اردو اور انگریزی رسالے دیکھ رہی تھی' جن کے سرورق پر اس کی رنگین تصویریں شائع کی گئی تھیں۔

وہ رنگین تصویروں میں پہلی بار خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی تعریف میں جو کالم لکھے گئے تھے' انہیں پڑھ کر خوشی سے جھوم رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف ٹیلیفون کی گھنٹیاں چیخ رہی ہیں۔ لیلیٰ باری باری ہر فون کا ریسیور اٹھا کر باتیں کرتی تھی۔ تمام ٹیلی فون اس کے حسن کے قصیدے گنگنا رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ آوازیں نہ سنو، یہ سب تمہیں بہکا رہے ہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تم ناحق پریشان ہوجاتے ہو۔ اگر میں تھوڑا سا کھا لیتی ہوں لباس بدل لیتی ہوں اور اپنی تعریفیں سن کر ذرا خوش ہوجاتی ہوں تو اس میں برا کیا ہے؟"

میں جواب نہ دے سکا اس لئے کہ ہر انسان کو خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ پھر خواب کا منظر بدل گیا۔ میں نے دیکھا لیلیٰ کو نت نئے فیشن کے لباس اور نئے نئے ڈیزائن کے زیورات پہننے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ بڑی بڑی تقریبات میں جاتی تھی۔ اسٹل اور مووی کیمرے اس کے آگے پیچھے گھومتے رہتے تھے۔ روشنیوں کے سیلاب میں اس کا حسن نئے نئے روپ میں اجاگر ہو رہا تھا۔

میں نے اسے آواز دی۔ "لیلیٰ! تم گرداب میں پھنس رہی ہو۔ واپس آجاؤ۔"

آرکسٹرا کے شور اور رقص کی مستی میں وہ میری آواز سن نہ سکی۔ میں نے زور سے چیخ کر آواز دی تو میری آنکھ کھل گئی۔"

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "رکنے کی ضرورت نہیں ہے فوراً ہی پانچویں قسط سناؤ۔"

"پانچویں قسط یہ ہے کہ تعریفوں کے ہجوم میں لیلیٰ نظر نہیں آئی۔ میں نے اسے تلاش کیا تو پتہ چلا کہ پیرس کی ایک بہت بڑی پرفیومری کمپنی نے اسے عصرانہ دیا ہے۔ دوسری بار خبر ملی کہ لندن کے ایک بہت بڑے نائٹ کلب میں اس کے لئے ڈنر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ ہالی ووڈ کے تمام کیمرے اس کے لئے آنکھ کھولنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ کیا ہوگیا؟ میری لیلیٰ میرے ہاتھ سے کیسے نکل گئی؟ وہ دوسری عورتوں کی طرح روٹی، کپڑے اور مکان کی محتاج نہیں تھی وہ دنیا کی ساری دولت کو ٹھکرا دیتی تھی۔ پھر اس دنیا کے بازار میں کیسے بک گئی؟

کافی سوچ بچار کے بعد یہ گیان حاصل ہوا کہ عورت مال و زر کی بھوکی نہیں ہوتی وہ محض تعریف کے ایک فقرے سے پگھل جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے اور اپنی اولاد سے بلا شبہ محبت کرتی ہے۔ مگر اس کے اندر جو سب سے مضبوط اور مستحکم محبت ہوتی ہے اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ اپنی تصویروں سے ہوتی ہے اور اپنے گھر کے آئینے سے ہوتی ہے۔

مرد ایک آئینہ ہے جس کی آنکھوں میں عورت اپنے حسن کا عکس دیکھتی ہے

چاہت کا سراغ لگاتی ہے۔ جو مرد آئینہ بن کر تعریف نہیں کرتا، اسے گھر کی مرغی دال برابر سمجھتا ہے، اس کی عورت بے خبری میں آہستہ آہستہ دوسرے آئینوں میں اپنی ذات کا پتہ پوچھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے جو عورت میرے پاس تھی، میں بڑی کنجوسی سے کبھی کبھی اس کی تعریف کرتا تھا۔ دوسری لیلیٰ تھی وہ غریب نہیں تھی، مجبور نہیں تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتی اگر میں تعریف کے کرنسی نوٹ اس پر لٹاتا رہتا۔

بہت کچھ لٹانے کے بعد عقل آتی ہے۔ مجھے بھی عقل آگئی ہے۔ اب میں ایک حسین لیلیٰ کا خواب نہیں دیکھوں گا۔ یوں بھی لیلیٰ کالی تھی۔ اب میرے خواب میں ایک کالی کلوٹی اور بدصورت محبوبہ آیا کرے گی۔ وہ دبلی پتلی بیمار ہوگی۔ اسے کوئی مجھ سے چھین کر نہیں لے جائے گا..........."

"ٹھہرو۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ اپنی مرضی سے کسی تیسری محبوبہ کو خواب میں دیکھو گے جبکہ یہ ناممکن ہے۔ خواب اپنے حالات اور ماحول کے مطابق خود بخود آتے ہیں۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنی مرضی کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔"

"ضرور دیکھ سکتا ہے۔" قیس نے کہا۔ "جیسا کہ میں دیکھتا ہوں۔"

"تم پاگل ہو، ہمارا وقت ضائع کرنے آئے ہو۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ جیسے تمام ماہر نفسیات کو سمجھانے اور سکھانے آیا ہوں۔ آپ انسانی نفسیات کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ جو لوگ اپنی مرضی سے روٹی حاصل نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے اپنی آمدنی نہیں بڑھا سکتے وہ اپنی مرضی سے خوابوں میں آمدنی بڑھا لیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کے لئے شیش محل بنوا لیتے ہیں اور اس دنیا کے مہنگے بازار سے اپنی ضروریات کی ہر چیز خرید لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر زبیری نے ڈانٹ کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ تم سلسلہ وار خواب قسطوں میں نہیں دیکھتے ہو۔ تم جھوٹ کہہ رہے تھے۔"

قیس نے کہا۔ "وہ خدا جو واحد ہے، لاشریک ہے اور ہماری طرح خوابوں کا محتاج نہیں ہے، میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا ہے۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں اور مجھ جیسے دنیا کے تمام غریب [illegible] دن

رات قسطوں میں خوشحالی کے خواب دیکھتے ہیں۔

جب زندگی کی ضرورتیں ڈانٹنے لگتی ہیں تو خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک قسط ختم ہوجاتی ہے اور جب محنت مزدوری سے فرصت ملتی ہے تو پھر اسی خواب کی دوسری قسط شروع ہوجاتی ہے۔

آپ لوگوں نے انسانوں کو سمجھنے کا علم حاصل کیا ہے تو آپ کو یہ علم ہوگا کہ ہماری زندگی میں کوئی خوشی تسلسل سے نہیں آتی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے آتی ہے اور زیادہ دیر کے لئے جاتی ہے۔ یہ امید لگا کر کہ وہ آئندہ قسطوں میں آیا کرے گی۔

اس دنیا کی کوئی نعمت ہم اپنی مرضی سے حاصل نہیں کرسکتے۔ صرف یہ کہ خواب ہی ایسے ہیں جنہیں ہم اپنی مرضی سے اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق دیکھتے ہیں۔ اگر نہ دیکھیں تو دوسرے ہی لمحے پھڑپھڑا کر مرجائیں۔"

تمام ڈاکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے' دوسرے جھٹکے سے وہ اس کے قریب آئے' پھر اس کی پٹائی کرنے لگے۔

"اُلو کا پٹھا! نچلے طبقے کا فلسفی ہے' اسے مارو اور دھکے دے کر نکال دو.........."

اسے دھکے دے کر عمارت سے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سڑک کے کنارے کچرے کی طرح پڑا رہا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ناک سے اور باچھوں سے لہو رس رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ بہت غور سے دیکھنے پر وہ تھوڑا تھوڑا سا انسان نظر آتا تھا۔

رات تاریک تھی۔ رات تو تاریک ہوتی ہی ہے مگر حالات کے جوتے کھانے کے بعد آنکھوں کے سامنے اندھیرا کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب اپنا خواب کسی کو نہیں سنائے گا۔ اپنے خواب کا حسن صرف اپنے آپ کو ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کراہتا ہوا جارہا تھا۔ اس کی جیب میں رکشہ ٹیکسی کے پیسے نہیں تھے مگر وہ بالکل خالی نہیں تھا۔ بس میں بیٹھ کر آرام سے بہار کالونی پہنچ سکتا تھا لیکن، بہار کالونی کے مکان میں وہی قید تنہائی ہوتی اور بشریٰ یاد آتی رہتی۔ اسے بھلانے کے لئے ہی وہ کسی لیلیٰ کو پکارتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ارادہ تھا کہ سڑک کے کنارے چلتا رہے گا اور ایک نئے خواب کی پہلی قسط دیکھتا رہے گا۔ چلتے چلتے وہ ناظم آباد کے پل پر آگیا۔ پل پر کہیں لیمپ پوسٹ روشن تھے اور کہیں اندھے ہوگئے تھے۔

بلندی پر پہنچ کر نشیب میں دور دور تک روشن قمقمے نظر آتے تھے۔ رات کے بدن پر کوڑھ کے دھبوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس نے سوچا۔

"میں کہاں جاؤں؟ میرے خوابوں کا سلسلہ اور زندگی کی کہانی کہاں جاکر ختم ہوگی۔ جب تک اختتام نہیں ہوتا تب تک اپنے دکھ درد کو سننے اور سمجھنے والا کوئی ساتھی تو ہو.......... کہاں ہو میرے ساتھی مجھے آواز تو دو.........."

اسے آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز پل کی ڈھلان سے آرہی تھی۔ وہ ریلنگ کو تھام کر نشیب کی طرف جانے لگا۔ آواز اس کی طرف آنے لگی۔ "آہ.......... ہائے.......... ہائے میں مرگئی.......... ربا مینو موت دے دے.........."

وہ ٹھٹک گیا کیونکہ وہ جانی پہچانی آواز تھی۔ وہ اس کی سرگوشیوں کو بھی پہچانتا تھا۔ اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ وہ دور ہوگئی تھی تو کیا ہوا۔ دماغ سے کبھی نہیں گئی تھی۔

"بشریٰ..........!" اس کی زبان بے اختیار اس کا نام آیا۔ وہ دور نیم تاریکی میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ آگے پل کے نیچے ایک عورت کا سایہ نظر آرہا تھا۔ وہ ریلوے لائن سے تقریباً تین گز کے فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر تاریکی مین پہچانی نہیں جارہی تھی۔ اس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک تیلی روشن کی پھر اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا پہنچا۔

وہ بشریٰ تھی اور نہیں بھی تھی۔ اس کے چہرے اور بدن پر چیچک کے داغ تھے۔ گوری گوری' گلابی گلابی سی حسینہ کا رنگ جل گیا تھا۔ آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ وہ ریشمی زلفیں' جن کے سائے میں نیند آجاتی تھی' اب وہ گرد سے اٹی ہوئی تھیں اور اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ وہ درد زہ سے بے حال ہوکر کراہ رہی تھی۔

دیا سلائی کی تیلی بجھ گئی۔ سب کچھ اندھیرے میں چھپ گیا۔ قیس کو یوں لگا جیسے وہ بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ حقیقت سے انکار کرنے لگا۔ "نہیں' نہیں۔ یہ بشریٰ نہیں ہے۔ یہ بشریٰ نہیں ہے۔ حالات ایسے حرامی نہیں ہوتے کہ زندگی کا چہرہ یوں بگاڑ کر رکھ دیں۔"

وہ دیکھ نہ سکی کہ اس کے پاس کون آیا ہے۔ تیلی کا شعلہ بھڑکا تھا اور اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

پھر وہی آواز' وہی لہجہ.......... قیس کو تسلیم کرنا پڑا کہ بشریٰ مل گئی ہے۔ تمام زندگی بھاگتے بھاگتے جس طرح انجام کار بڑھاپے کی جھریاں ملتی ہیں' اسی طرح بشریٰ مل گئی ہے۔ اس نے کہا۔

"ہمارے چہرے بگڑ گئے ہیں۔ میں نے تمہیں آواز سے پہچانا ہے۔ تم بھی مجھے آواز سے پہچان سکتی ہو تو پہچان لو۔"

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ آواز سے پہچانتے ہی پھر وہی درد شروع ہو گیا۔ پیٹ کا درد بھی تھا' دل کا درد بھی تھا' ماضی کے تمام زخم ہرے ہو گئے تھے۔

"بشریٰ! تو کہاں کھو گئی تھی۔ میں تجھے گالیاں دیتا تھا اور تیری تلاش میں بھٹکتا بھی رہتا تھا۔ مجھے بتا' یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے؟"

وہ درد سے تڑپتی رہی۔ اس اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے تاریکی ایک زخمی چڑیل کی طرح کراہ رہی ہے اور اپنی کالی زبان سے اپنا فسانہ سنا رہی ہے۔

"میں وقت سے پہلے بوڑھی اور بے کار ہو گئی۔ یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ میں حسین بھی تھی اور جوان بھی۔ پانچ برس پہلے تمہاری دلہن بن کر آئی۔ میں اپنی جوانی کے لمحات کو انگلیوں پر گن سکتی ہوں ایک برس دس ماہ کے بعد میں سہاگن کے بجائے داشتہ بن گئی۔ سیٹھ برکت دو برس دو ماہ تک میرے قدموں میں لوٹتا رہا۔ پھر ایک دن میں بخار میں مبتلا ہو گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چیچک کے آثار ہیں۔ مجھے فوراً ہی شہر سے دور قرنطینہ میں بھیج دیا گیا۔ میں چیختی چلاتی رہی کہ وہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ مگر چھوت کی بیماری ایسی ہی ہوتی ہے۔ ایسے وقت جوانی کے خریدار رشتہ توڑ لیتے ہیں۔

تقریباً بیس دن بعد میں نے صحت یاب ہو کر آئینہ دیکھا تو مارے دہشت کے چیخ پڑی۔ زندگی میں پہلی بار آئینے نے میرے مثالی حسن کا مذاق اڑایا۔ مجھ سے میرے چہرے کو چھپا لیا اور یہ موجودہ چہرہ دکھا کر ڈرانے لگا۔ اس روز میں بہت روئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بشریٰ جیسی حسین عورت کی موت پر مجھے ماتم کرنا پڑے گا۔

دوسرے دن سیٹھ برکت آیا تو وہ بھی مجھے دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے منہ پھیر کر جلدی سے سو سو کے نوٹ نکالے۔ پھر ان نوٹوں کو میری گود میں پھینک کر کہا۔

"مجھے ضروری کام ہے تم ٹیکسی میں چلی آنا.........."

وہ میرا جواب سنے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اسے آواز دی۔ جواب میں مجھے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس رات میں کسی طرح اس شہر میں واپس آئی۔ سیٹھ برکت کی کوٹھی میں گئی۔ وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ کوٹھی کے چوکیدار نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔

"میں اس کوٹھی کی بیگم صاحبہ ہوں۔"

اس نے مجھے دھکا دے کر کہا یہاں صرف دھکے کھانے والی بیگمات آتی ہیں۔ دوسرے دن میں سیٹھ برکت کے دفتر گئی۔ وہاں مجھے کسی نے عمارت میں داخل ہونے نہیں دیا۔ آہ! نہ میں کوٹھی کی رہی' نہ جھگی کی' نہ دین کی رہی' نہ دنیا کی.........."

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ درد پھر کروٹیں بدلنے لگا۔ قیس نے پوچھا۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

"فٹ پاتھ کے رہنے والوں کا ہے۔ کوٹھی سے جو بچا کھچا پھینکا جاتا ہے اسے فٹ پاتھ والے ہی کھاتے ہیں۔ قیس میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ویسے تو میں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میرے بازو مضبوط ہوتے' اگر میں تمہارے تحفظ کا سامان کر سکتا تو تم یہاں تک نہ پہنچتی۔ تم بے وفا بن کر بھی مجھ سے وفا کرتی رہی۔ میں تمہارا قرضدار ہوں۔ اب سارا قرض ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' میں تمہارے ساتھ بدنامی بن کر نہیں جاؤں گی۔"

"بدنامی کیسی؟ تم میری بیوی ہو۔ میکے سے واپس آ گئی ہو۔ دنیا والوں کے سامنے بہت سی باتیں بنائی جا سکتی ہیں' اور جب میں تمہارا شوہر ہوں تو یہ ہونے والا بچہ بھی میرا ہے۔ بشریٰ میری بات مان لو۔ مجھے قرض کا بوجھ اتارنے دو۔"

وہ محبت سے اور ندامت سے ٹوٹ گئی۔ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ قیس نے اسے ذرا دیر رونے کی مہلت دی۔ پھر اچانک ہی قہقہہ لگانے لگا۔ بشریٰ نے چونک کر پوچھا۔

"تم کیوں ہنس رہے ہو؟ کیا مجھ پر ہنس رہے ہو؟"

"تم پر نہیں' دنیا والوں پر ہنس رہا ہوں۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دیا سلائی کی ایک تیلی روشن کی۔ اس روشنی میں
لیلیٰ کو دیکھا۔ پھر مطمئن ہو کر بولا۔
"اب کوئی خریدار تجھے چھیننے کے لئے نہیں آئے گا............"

☆======☆======☆

بوڑھی جوانی

بڑھاپے کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ایک بوڑھے کی دلچسپ کہانی۔
قدرت نے ایک نیکی کے عوض اس کی جوانی واپس کر دی تھی۔
المناک انجام کی فکر انگیز کہانی۔

بڑھاپا ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک جگہ چوٹ لگے تو دس جگہ سے ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ بہو
نے پیچھے دھکا دیا تھا اور بیٹے نے آگے سے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچہ گال پر لگا تھا مگر
بوڑھے باپ کو ایسا لگا تھا جیسے سر سے پاؤں تک اس کے جسم پر ہتھوڑے برسائے گئے
ہوں۔ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

جس زمین پر وہ گرا' وہ زمین اس کی اپنی تھی۔ چاروں شانے چت ہو کر وہ جس
کوٹھی کی چھت کو دیکھ رہا تھا وہ کوٹھی بھی اس کی ملکیت تھی اور جس بیٹے نے اسے
طمانچہ مارا تھا وہ بیٹا بھی اس کے اپنے خون کے ایک قطرے سے تخلیق ہوا تھا۔ اس نے
بڑھاپے کے باعث دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

"تُو نے مجھے نہیں مارا' میرے بڑھاپے نے مجھے مارا ہے۔ اگر میں تیری طرح جوان
ہوتا تو ایک ہی گھونسے میں تجھے ٹھنڈا کر دیتا۔ کیا تُو بھول گیا کہ میں اپنی جوانی میں اپنے
وقت کا ایک ناقابل شکست باکسر تھا؟"

بیٹے نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ "تُو جب تک زندہ رہے گا' اپنی
جوانی کو یاد کر کے بڑبڑاتا رہے گا۔ صبح سے رات گئے تک تیری بکواس سن سن کر ہمارے
کان پک گئے ہیں۔ میرے بے وقوف ڈیڈی! تیری جوانی اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔
تجھے تو اب مرجانا چاہئے۔ مگر تُو ہے کہ مرنے کا نام تک نہیں لیتا ہے۔"

"ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر فنا ہوتی ہے۔ مگر مجھے وقت سے پہلے مارنے کے لئے بہو
نے آج میرے دودھ میں زہر ملا دیا۔" وہ کراہتے ہوئے فرش پر سے اٹھنے لگا۔ "آہ! یہ
بڑھاپا.......... بہو کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ضرور دودھ میں
کچھ کالا ہے۔ جو بہو سوکھی روٹی اور باسی سالن کھلاتی آئی ہے وہ آج دودھ سے بھرا ہوا
گلاس لے کر آئی تھی۔ میں' میں بوڑھا ضرور ہوں' مگر میرا دماغ بوڑھا نہیں ہے۔ یہ دماغ
جوانوں سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔ بہو گلاس رکھ کر گئی تو میں نے وہ دودھ بلی کو

دیا۔ آہ! بے چاری کیسے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ اری او ظالم بہو! تیرے سینے میں دل نہیں
پتھر ہے۔ ارے او شرابی بیٹے! جو عورت دولت اور جائیداد کے لالچ میں تیرے باپ کو زہر
دے سکتی ہے' وہ ایک دن اسی لالچ میں تجھے بھی زہر دے کر ہلاک کر دے گی۔"

وہ پلٹ کر باہر جاتے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ انکار کی صورت میں ہلاتے ہوئے
بولا۔

"نہیں نہیں۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ اس گھر میں گزرنے والا ایک
ایک لمحہ زہریلا ہے۔ کوئی بھی لمحہ میری لاعلمی میں مجھے ڈس لے گا۔"

بیٹے کا ایک طمانچہ کھا کر اس کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ وہ جھکے جھکے ڈگمگاتے
ہوئے قدموں سے کوٹھی سے باہر آگیا۔ باہر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی عالی شان
کوٹھی کو دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا۔ "میں نے باکسنگ میں بڑی بڑی رقمیں جیت کر یہ
عالی شان کوٹھی بنائی تھی اور بڑھاپے میں آرام سے زندگی گزارنے کے لئے بہت سی
دولت جمع کی تھی۔ مگر یہ بھول گیا تھا کہ بیٹا جوان ہو کر مجھے ایک ہی طمانچے میں ناک
آؤٹ کر دے گا۔ اے دولت مند لوگو! میری نصیحت کو غور سے سنو۔ اپنی ساری دولت
اپنی جوانی مین ہی خرچ کر ڈالو۔ ڈاکو تمہیں لوٹنے آئیں تو قانون تمہاری حفاظت کرتا ہے
لیکن اولاد لوٹنے پر آئے تو وہی قانون منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ میرے بیٹے اور بہو نے بھی
یہی کیا۔ پہلے بڑی محبت سے تمام دولت اور جائیداد اپنے نام لکھوائی۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے
بوڑھا خبطی اور پاگل ثابت کرنے لگے۔ اب میں کس سے کہوں گا کہ میری بہو نے مجھے
زہر دینے کی کوشش کی تھی تو لوگ مجھے بوڑھا خبطی کہیں گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا
کہ اتنی خدمت گزار بہو کبھی ایسی ظالمانہ حرکت کر سکتی ہے' اور میں کسی سے طمانچہ
کھانے کا ذکر نہیں کر سکتا۔ اس میں میری ہی توہین ہے' میرا ہی قصور ہے۔ میں نے طمانچہ
مارنے والا بیٹا کیوں پیدا کیا تھا؟"

یہ کہہ کر اس نے سرد آہ بھری اور بڑبڑاتے ہوئے بیچ سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے
لگا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں پھر سے جوان ہو جاؤں اور بیٹے کو طمانچے کا جواب ایک
گھونسے سے دوں۔ میری واپس آنے والی جوانی کا ایک گھونسا اس تندرست اور توانا بیٹے
کو چار دن تک ہسپتال میں سلا کر رکھے گا۔

صد افسوس کہ انسان کے تمام اصول اور قانون بدل سکتے ہیں لیکن قدرت کا قانون نہیں بدل سکتا۔ میں بڑھاپے سے جوانی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔"

وہ سوچتا ہوا اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا اتنی دور تک چلا گیا کہ اس کا بڑھاپا تھک کر ہانپنے لگا۔ وہ ایک پارک کے بنچ پر اپنی سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ پارک میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ حسین عورتیں اور خوبرو مرد ہر سُو ہنستے بولتے نظر آرہے تھے۔ پارک کے مختلف گوشوں میں نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے جوانی کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ ماحول اتنا رنگین اور پُرکیف تھا کہ اسے پھر اپنی جوانی یاد آنے لگی۔

جوانی نے جوان گلابو کی یاد دلائی۔ گلابو ایک گلابی رنگت کی تیز طرار حسین عورت تھی۔ پھلجھڑی جیسی چنگاریاں بکھیرتی جوانی کو جب وہ سجا بنا کر مجرا پیش کرتی تو تماش بین لوٹ پوٹ ہو کر نوٹوں کی بارش کرتے تھے۔ وہ بھی اپنے بڑھاپے کی کمزور لاش کو اٹھائے کوٹھے پر جاتا تھا مجرا ختم ہونے کے بعد وہ گلابو کے جوان گدرائے ہوئے زانو پر سر رکھ کر تمام رات سوتا تھا (صرف سوتا تھا) صبح اٹھ کر سو سو کے پندرہ نوٹ اس کی گود میں رکھ کر چلا جاتا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بوڑھا عیاش تھا۔ نہیں یہ دنیا والے غلط سوچتے ہیں۔ ان دولت مند بوڑھوں کے سلسلے میں سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بڑھاپے کا دکھ بھلانے جاتے ہیں۔ جب ساری دنیا کے نوجوان انہیں بوڑھا' بے کار اور ناکارہ سمجھنے لگتے ہیں تو زمین کے اس سرے سے اس سرے تک صرف طوائف ہی ایک ہستی ہوتی ہے جو چند نوٹوں کے عوض اپنی جوانی کا تھوڑا سا حصہ انہیں سر رکھ کر سونے کے لئے دیتی ہے۔

بوڑھے نے دور' اٹھلا کر چلنے والی حسین عورتوں کو دیکھا۔ پھر بوڑھوں کی عادت کے مطابق بڑبڑانے لگا۔ "اب مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ جب سے میں بوڑھا ہوا ہوں' تب سے جوانی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور ہانپتی ہوئی آواز سے اپنی جوانی کو واپس بلا رہا ہوں۔ میں گلابو کے زانو پر سر رکھتا تھا کہ اس کے شبابی بدن کی حرارت مجھ تک پہنچتی تھی۔ اگرچہ میرا جسم بوڑھا ہی رہتا تھا مگر خیالات ہڑبڑا کر جوان ہوجاتے تھے۔ ارے دنیا والو! ہم بوڑھوں کو اتنا تو جینے کا حق دو کہ ہم خیالوں کی دنیا میں جوان ہو کر زندہ

رہ سکیں۔

کاش! اس وقت میری جیب میں سو سو روپے کے پندرہ نوٹ ہوتے' میں گلابو کے پاس چلا جاتا۔ وہ تمام نوجوانوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ پسند کرتی۔ کیونکہ میں ایسا گاہک ہوں جو اس کی جوانی کو نہیں چھیڑتا۔ اس کے بدن کو میلا نہیں کرتا۔ میں صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر سوتا ہوں اور اس کے عوض ایک بھاری رقم دیتا ہوں۔ دوسرے نوجوان جو گلابو تک نہیں پہنچ سکتے' وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتے ہیں۔ اس طرح میری انانیت کی تسکین ہوتی ہے کہ وہ مجھے بھی جوان سمجھتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنا رقیب کیوں سمجھتے؟"

اس کی بڑبڑاہٹ اچانک ہی تھم گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک قوی ہیکل جوان کھڑا تھا۔ جوان نے بوڑھے سے کہا۔

"میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ کیا تم مشہور زمانہ باکسر نہیں ہو؟ تمہارا نام مراد علی ہے۔"

مراد علی یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا کہ اس کا کوئی قدر دان اس مصیبت کے وقت اس کی مدد کرنے آپہنچا ہے۔ اس نے بوڑھی اور کمزور آواز میں کہا۔

"ہاں بیٹا! میں مراد علی ہوں اور کبھی ایک ناقابل شکست باکسر تھا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی نوجوان پینترا بدل کر اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھ کر باکسنگ لڑنے کے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ پھر اسے للکارتے ہوئے بولا۔

"میرے پرانے دشمن! بی ریڈی! آج میں تجھے ناک آؤٹ کروں گا۔"

مراد علی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ٹھہرو رک جاؤ' تم میرے بچے کے برابر ہو۔ بھلا میری تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "ہماری دشمنی براہ راست نہیں ہے۔ یاد کرو' تمہارے عروج کے زمانے میں ایک اور رستم نامی بہت ہی نامور باکسر تھا۔"

"ہاں مجھے یاد آگیا۔ رستم واقعی ایک زبردست باکسر تھا لیکن میں نے تیسرے ہی راؤنڈ میں اسے زمین دکھادی تھی۔"

"بکواس مت کرو۔" نوجوان نے دھاڑ کر کہا۔ "وہ میرا باپ تھا۔ اپنی شکست اور توہین برداشت نہ کرسکا' چند ہی دنوں بعد مرگیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کی توہین اور اس کی موت کا بدلہ تجھ سے لوں گا' لیکن اس وقت میں بارہ تیرہ برس کا تھا' تیرا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اب میں بھی ہیوی ویٹ باکسر ہوں۔"

"مگر اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ پہلے تو میرے مقابلے کے قابل نہیں تھا۔ اب میں تیرے مقابلے کے قابل نہیں ہوں۔ کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں بظاہر مضبوط نظر آتے ہیں' مگر یہ اندر سے کھوکھلے اور کمزور ہیں۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے کہ وقت نے تجھے کھوکھلا اور کمزور بنا دیا ہے اور فتح میرے نام لکھ دی ہے۔ بی ریڈی۔"

مراد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "یہ جوڑ توڑ کا مقابلہ نہیں ہے۔ میں تجھ سے مقابلہ نہیں کروں گا۔ میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔ اگر انصاف سے انتقام لینا چاہتا ہے تو میرے مقابل کسی بوڑھے کو لاکر کھڑا کردے۔"

"بوڑھے باکسر۔ انتقام کبھی انصاف سے نہیں لیا جاتا۔ لے سنبھال میرا گھونسہ.........."

نوجوان نے بڑی پھرتی سے اس کی ناک پر گھونسہ مارنے کی کوشش کی۔ مراد نے بڑھاپے کے باوجود عادتاً اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اس کا سر آپ ہی آپ اوپر اٹھ گیا اور نوجوان کا گھونسہ اس کی ٹھوری کے نیچے سے گزر گیا۔

نوجوان سمجھ گیا کہ وہ بوڑھا بالکل ہی گیا گزرا نہیں ہے۔ قدرتی طور سے کمزور ہوگیا ہے لیکن ایک باکسر کی عادت کے مطابق ذہنی طور پر اب بھی پھرتیلا پن موجود ہے۔ اس نے سنبھل کر پنچنگ شروع کی۔ مراد اس کے ہر پنچ کو روکتا گیا لیکن نوجوان پر جارحانہ حملے نہ کرسکا۔ اگرچہ وہ دونوں قد کے لحاظ سے برابر تھے مگر مراد کی کمر بڑھاپے سے ایسی جھکی ہوئی تھی کہ اس کا مکا نوجوان کے چہرے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ایک راؤنڈ تین منٹ کا ہوتا ہے۔ تین منٹ ہوچکے ہیں۔ اب ذرا دیر ستانے کا وقفہ دو۔"

وہ یہی سمجھ کر سست پڑ گیا کہ باکسنگ کے قاعدے کے مطابق وقفہ ہوگا کہ نوجوان نے ایک زبردست گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ بوڑھے کی جیسے سانس رک گئی۔ آنکھوں کے سامنے اچانک ہی دنیا تاریک ہوگئی پھر وہ چکرا کر گر پڑا۔

نوجوان ایک سے دس تک گننے لگا۔ دس کے بعد بھی وہ نہ اٹھ سکا تو اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس نے حقارت سے اسے ٹھوکر مار کر کہا۔

"اونہہ۔ سالے نے جی بھر کر انتقام لینے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ ایک ہی گھونسے میں

ٹھنڈا ہوگیا۔ اچھی بات ہے۔ اگر یہ زندہ رہ گیا تو پھر کسی دن اس کی مرمت کروں گا۔ یہ بوڑھا میرے گھونسے کھا کر ہی مرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ بوڑھا تقریباً دس پندرہ منٹ تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کی آدھی موت واقع ہوچکی تھی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا اور تکلیف سے کراہنے لگا۔ ذرا دیر بعد حواس بحال ہوئے تو آنکھیں کھول کر اپنے اطراف دیدے گھما کر دیکھنے لگا۔

اسے یاد آگیا کہ یہ دنیا صرف مغرور نوجوانوں کی ہے اور اس دنیا میں اسے صرف ٹھوکر اور گھونسے مل رہے ہیں۔ اپنے بڑھاپے اور اپنی توہین پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے زمین پر لیٹے ہی لیٹے کھلے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"خدایا! یہ کیسا ظلم ہے؟ تو انسان کو بوڑھا کیوں کر دیتا ہے۔ تیرے پاس انسانوں کے لئے جوانی کا جو خزانہ ہے وہ خالی تو نہیں ہوگیا ہوگا۔ میں تیری رحمت کو پکارتا ہوں۔ اس خزانے سے تھوڑی سی جوانی مجھے دے دے۔ میں بڑھاپے کی ذلیل موت مرنا نہیں چاہتا۔ میری یہ آرزو پوری کردے میرے رحمان و رحیم۔ اس کے بعد میں کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ آہ! ایک جوان بیٹے کا طمانچہ بوڑھے باپ کے گال پر ابھی تک سلگ رہا ہے۔ کہیں میں احساس توہین کی شدت سے مر نہ جاؤں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پارک میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی سسکیوں کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ خاموش آسمان چاند کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت پر ستاروں کے آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ اس نے ایسی خواہش کی تھی جو قانون قدرت کے خلاف تھی صرف ایک خدا ہی تھا جو اپنے قانون کو بدل کر اس کی آرزو پوری کرسکتا تھا مگر اس وقت وہ بھی چپ تھا۔ بوڑھا روتے روتے وہیں سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہسپتال کے بستر پر تھا۔ اسے اپنا بدن بخار میں پھنکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اس ماحول کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ کسی خیراتی ہسپتال میں ہے۔ ایک بوڑھے سے ڈاکٹر نے قریب آکر اس کا معائنہ کیا۔ اسے ایک انجکشن لگایا۔ پھر وارڈ بوائے نے اسے کچھ دوائیں کھلائیں۔ وہ پھر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ بوڑھے ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "بوڑھوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ زندگی ٹھوکر مارتی جاتی ہے اور ہم لڑھکتے جاتے ہیں۔"

بوڑھے ڈاکٹر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو' بڑھاپا انسان کو بہت ذلیل کرتا ہے۔ کاش کہ انسان کبھی بوڑھا نہ ہوتا۔ ہم نے طبی سائنس میں اتنی ترقی کرلی ہے مگر بڑھاپے کو دور کرنے کا اب تک کوئی نسخہ تیار نہ کرسکے۔"

مراد علی نے کہا۔ "یہ ہماری کوتاہی ہے۔ اگر دنیا کے تمام دولت مند بوڑھے ایک ہوکر اور اپنی تمام دولت ایک جگہ جمع کرکے سائنسدانوں کو صرف اسی کام پر بٹھادیں کہ وہ بڑھاپے کو دور کرنے کی زود اثر دوا ایجاد کریں تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ انسان کے ہر مرض کا علاج دریافت کیا جارہا ہے۔ بڑھاپا بھی ایک ازلی مرض ہے۔ پھر اس کا علاج کیوں نہیں دریافت ہوسکے گا؟"

"تمہارا خیال درست ہے۔ مگر یہ خیال ابھی صرف ایک خیال ہے۔ دنیا کے تمام بوڑھے اسی انداز میں سوچتے ہیں اور سوچتے سوچتے مرجاتے ہیں۔"

مراد نے سوچا تھا کہ بوڑھا ڈاکٹر اس تدبیر پر مزید کچھ روشنی ڈالے گا مگر وہ بوڑھی سوچ کا مذاق اڑا کر چلا گیا تھا۔

دو دن کے بعد وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوکر باہر آیا۔ باہر آخر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ یہ رونق ان لوگوں کے دم سے تھی' جو دولت مند تھے یا پھر جوان تھے اور جوان حسیناؤں کو شاپنگ کرا رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں اس نے گلابو کو دیکھا۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ کار سے اتر رہی تھی۔ مراد بوڑھے قدموں سے جلد جلدی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ گلابو اپنے نئے گاہک کے ساتھ شاپنگ کے ارادے سے ایک دکان میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"گلابو!"

وہ ٹھٹک گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بیماری کے بعد ہسپتال سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس لئے پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آرہا تھا۔ زندگی کے طمانچے اور گھونسے کھا کر سڑکوں میں گرتا رہا تھا' اس لئے کپڑے گرد آلود تھے۔ گلابو نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہارے جیسا رئیس اعظم اس حالت میں؟ تعجب ہے۔"

"اب میں رئیس اعظم نہیں ہوں۔ میرے بیٹے اور بہو نے محبت کا فریب دے کر میری دولت اور جائیداد چھین لی ہے۔ دنیا والے مجھے بوڑھا اور کمزور سمجھ کر مجھ سے کنگ لڑتے ہیں اور مجھے ناک آوٹ کر دیتے ہیں ایسی صورت میں صرف تمہاری جیسی عورت ہی مجھے اپنے زانو پر سلا کر میرے دماغ سے بڑھاپے کا دکھ مٹا سکتی ہے۔"

گلابو نے ایک بار پھر اس کے حلیے کو ناگواری سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا تم بالکل ہی کنگال ہوگئے ہو؟"

"ہاں' میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"کیا تمہاری تمام دولت تمہارے بیٹے کے ہاتھ آگئی ہے؟"

"ہاں۔ اب میری تجوری کی چابی میرے بیٹے کے پاس ہے۔"

گلابو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "تو پھر تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اب اپنے بیٹے کو میرا پتہ بتا دو۔ تمہیں دلالی کا کمیشن مل جائے گا۔"

وہ "اونہہ" کہتی ہوئی پلٹ کر دکان میں داخل ہوگئی۔ اس بوڑھے پر چند لمحوں تک سکتہ طاری رہا۔ اتنا زبردست طمانچہ بیٹے نے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اتنی زہریلی پنچنگ اس نوجوان باکسر نے بھی نہیں کی تھی۔ گلابو کی "اونہہ" کا مکا اس کے دماغ پر پڑا تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک جھلا گیا اور وہاں سے بے تحاشہ بھاگنے لگا۔

'جو عورت ہر رات اس سے مفت کے پندرہ سو لیا کرتی تھی' وہ اسے دلال بنا رہی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں اب یہی آرہا تھا کہ مرجائے۔ ایسی ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

وہ جھکی جھکی کمر سے کبھی بھاگتا رہا کبھی چلتا رہا۔ ذلت کے شدید احساس سے وہ تھکنا اور ہانپنا بھول گیا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ شہر کی حدود سے باہر جارہا ہے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ بارش شروع ہوگئی ہے اور بادل گرج گرج کر بجلی کی شمعیں جلا کر اسے پہاڑی راستہ دکھا رہے ہیں۔

"میں کہاں جارہا ہوں؟ میں مرنے جارہا ہوں۔ پہاڑی کی بلندی پر جاکر سمندر میں چھلانگ لگاؤں گا اور بے حس اور مطلبی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رشتہ توڑ دوں گا۔ ایسے بڑھاپے پر لعنت ہے جس کے مقابلے میں موت بہتر نظر آتی ہے۔"

وہ پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ وہاں کسی بزرگ کا مزار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ

مزار کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس بزرگ کے دربار سے بھی اپنی گزری ہوئی جوانی کی بھیک مانگے گا۔ کیا حرج ہے اگر اپنی بے روح دعا کو بزرگ کے روحانی وسیلے سے آزما لیا جائے۔

مزار کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب چھت سے پانی دھار کی صورت میں ٹپک رہا تھا اور وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بوڑھے مراد نے اسے دیکھ کر سوچا' اگر دعا قبول نہ ہوئی تو مجھے خودکشی کرنی ہی ہوگی۔ میرے لئے یہ کوٹ بے کار ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ بڑھیا کے کام آئے تو بہتر ہے۔

اس نے اپنا لانگ کوٹ اتار کر بڑھیا کے اوپر ڈال دیا۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں اسے دعائیں دینے لگی۔

"خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے سردی سے مجھے بچایا ہے۔ خدا تمہیں ہر آفت سے بچائے اور تمہارے دل کی مراد پوری کرے۔"

وہ دعائیں سنتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی ہاتھ اٹھا کر گڑگڑانے لگا۔

"اے بزرگ! میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں لیکن آپ ضرور کرامات والے بزرگ رہے ہوں گے۔ شاید اسی لئے لوگوں نے آپ کو اتنی بلندی پر دفن کیا ہے۔ پہاڑ کی اس بلندی سے آسمان بہت قریب ہے۔ آپ اگر میرے لئے دعا کریں تو وہ دعا جلد آسمان تک پہنچ جائے گی۔

اے بابا کرامات والے! آپ نے بھی اس دنیا میں بڑھاپا گزارا ہوگا۔ آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ بڑھاپا دنیا کا سب سے اذیت ناک اور ذلیل ترین مرض ہے۔ تو حضور عالی میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھے اس مرض سے نجات ملے۔ بڑھاپے سے نجات حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو خدا مجھے موت دے دے یا پھر میری جوانی مجھے لوٹا دے۔"

دعا مانگنے کے دوران بجلی زور سے کڑکڑائی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی دوسری آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"موت کی دعا پوری نہیں ہوگی کیونکہ موت کا ایک دن معین ہے اور تمہارے ابھی پورے نہیں ہوئے۔"

بوڑھے مراد نے حیرانی سے مزار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ آواز اسی مزار سے ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اے بابا کرامات والے! اگر مجھے موت نہیں آسکتی تو مجھ پر جوانی ہی آجائے۔"

پھر وہی آواز مزار سے ابھرنے لگی۔ "کوئی ایسی آرزو نہ کرو' جو قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔"

مراد نے کہا۔ "خدا کی مرضی ہو تو کوئی آرزو قانونِ قدرت کے خلاف نہ ہوگی۔ کریم چاہے تو دریا الٹا بہہ سکتا ہے اور میں بھی پلٹ کر بڑھاپے سے جوانی کی طرف آسکتا ہوں۔"

"بوڑھے! ابھی تو نے ایک نیکی کی ہے ایک غریب بڑھیا کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے بدن کا کپڑا اتار کر دے دیا ہے تیری یہ نیکی ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم تیرے کام آئیں۔ اس نیکی کے عوض کبھی نہ پوری ہونے والی آرزو بھی پوری ہو سکتی ہے ہم تجھے سمجھا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا پریشانیوں کا گھر ہے' جوان ہو کر بھی تو پریشان رہے گا۔ جوانی تجھے سکون نہیں پہنچائے گی۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے جوانی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ مصائب سے لڑتے وقت تکان نہیں ہوتی بلکہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنی آرزو سے باز نہیں آؤں گا۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جوان بن کر زندگی گزاروں گا۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا اور جوانی میں جو حسرتیں باقی رہ گئی تھیں انہیں پورا کروں گا۔ خدا کے لئے میری یہ آرزو اپنی کرامات کے ذریعے پوری کر دیجئے۔"

"ہوں۔ ہم سمجھ گئے۔ تو اپنی ضد سے باز نہیں آئے گا اور ہم تجھے تیری نیکی کا صلہ دینے پر مجبور ہیں۔ یہ لے' تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

مراد کے پیچھے سے ایک ہاتھ آگے بڑھ کر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس اجنبی ہاتھ کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر سرخ رنگ کی ایک گولی تھی۔ گولی اتنی بڑی تھی کہ اسے گولہ کہنا مناسب ہوگا۔ وہی آواز سنائی دی۔

"لے! اسے نگل جا' تیرا بھلا ہوگا۔"

مراد نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ایک سفید پوش بزرگ ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسری میں گولی لئے کھڑے تھے۔ اس کا صاف ستھرا عمامہ اور سفید لمبی داڑھی ۔ سناٹی ہوا کے

جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ انہوں نے تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم بھی بوڑھے ہیں لیکن ہم نے جوانی کی یہ گولی کبھی نہیں کھائی۔ کیونکہ ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ اس نے ہمیں بوڑھا کر دیا ہم اس کی مرضی کے خلاف جوان نہیں بننا چاہتے۔ تو جوان بن کر دیکھ لے تجھے دلی سکون حاصل نہیں ہوگا۔"

بوڑھا مراد ان کی باتیں ایک کان سے سن رہا تھا' دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔ اس کی للچائی ہوئی نظریں سرخ گولی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گولی کو لیا تو بزرگ نے کہا۔

"اس گولی کو نگلنے کے بعد تو سدا جوان رہے گا۔ قدرتی طور سے نہ بھی بوڑھا ہوگا اور نہ ہی طبعی موت مرے گا۔ تیری عمر ایک کوّے کی عمر کی طرح لمبی ہوگی۔ تو نے کسی کوّے کو طبعی موت مرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ یا تو کسی شکاری کی گولی یا غلیل کا نشانہ بنتے ہیں یا بجلی کے تاروں سے الجھ کر مرتے ہیں یا پھر آندھی طوفان کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ تو بھی ان کی طرح قدرتی موت نہیں مرے گا بلکہ کسی حادثے کا شکار ہوگا یا کسی کی سازش کا شکار ہو کر پھر بوڑھا ہو جائے گا۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا میں پھر بوڑھا ہو جاؤں گا۔"

"ہاں اگر کوئی تجھے خنجر یا کسی آتشیں اسلحہ سے ہلاک کرنا چاہے تو تو مرنے کے بجائے پھر بوڑھا ہو جائے گا۔ تیری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ تجھے جوانی میں نہیں بڑھاپے میں موت آئے گی۔ دوبارہ بوڑھا ہونے کے بعد تو پھر اپنی طبعی عمر گزار کر بڑھاپے کی ذلتیں برداشت کرے گا۔ پھر ایک دن اپنے مقررہ وقت پر مر جائے گا۔"

"نہیں' اب میں اس بڑھاپے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جوانی حاصل کرنے کے بعد میں بڑھاپا کبھی پسند نہیں کروں گا۔ میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بناؤں گا۔ نہ کوئی دشمن ہوگا اور نہ ہی کوئی خنجر سے کسی آتشیں اسلحہ سے یا کسی بھی دنیاوی ہتھکنڈے سے مار سکے گا۔ اس طرح کبھی مجھ پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ موت کا مجھے غم نہیں ہے' دوسری بات یہ کہ بڑھاپا نہیں آئے گا تو موت کیسے آئے گی؟"

"نوجوان موت سے ڈرتے ہیں۔ تو جوان ہو کر موت کے بجائے بڑھاپے سے ڈرتا رہے گا۔ یہ درست ہے کہ بڑھاپے سے بچنے کے لئے تجھے سب کو دوست بنانا ہوگا۔ اس دنیا میں تیرا ایک بھی دشمن نہ ہو لیکن کیا پتہ کہ تجھے کیسے حالات پیش

آئیں۔ بعض اوقات دوست بھی بڑے خلوص سے نادانستگی میں دشمنی کرجاتے ہیں۔ جا تیرا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ بزرگ اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔ بوڑھا مراد تنہا رہ گیا۔ مزار پر جلتی لالٹین کی زرد روشنی میں اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا' وہاں سرخ گولی رکھی ہوئی تھی۔ اسی وقت بجلی کڑک دار آواز سے چمکی۔ اس کی لمحاتی روشنی میں اس نے گولی منہ میں ڈال لی اور اسے نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گولی تھی یا گولہ؟ حلق میں جا کر پھنس گیا۔ سانس کی آمدورفت کا راستہ رک گیا۔ وہ بوکھلا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے حلق سے اتارنے کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔ اس نے مزار کی چھت سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر پیا لیکن پانی حلق تک پہنچ کر باہر آگیا۔ کیونکہ جوانی کے گولے نے پانی نگلنے کا راستہ روک رکھا تھا۔

ایسی حالت میں موت سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ جب پانی بھی نہ پی سکے اور سانس نہ لے سکے تو زندگی سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ جہاں وہ گرا وہاں سے دور تک ڈھلان تھی۔ اندھیرے میں اس کی پستی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ پستی کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک میں لڑھکتا ہوا نظر آجاتا تھا۔ اس کے بعد اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔

پستی کے کسی ہموار چٹانی میدان میں اس کا لڑھکتا ہوا جسم تھم گیا۔ موسلادھار بارش اسے بھگو رہی تھی۔ وہ ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ لڑھکنے کے دوران جھٹکے لگنے کے باعث وہ جوانی کا گولہ حلق سے نیچے اتر گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ سانس آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف موسلادھار بارش کے تھپیڑے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے چت لیٹے لیٹے آسمان کی طرف دیکھا۔ تاریکی کے باوجود آسمان مٹا مٹا سا نظر آ رہا تھا۔ دو سیاہ بادل مخالف سمتوں سے آ کر گڑگڑاتے ہوئے ٹکرائے تو ایک قیامت کا شور بلند ہوا۔ ایک بجلی کان پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ چمکی اور سیدھی اس پر آ کر گری۔ مگر نہیں' یہ محض اس کا وہم تھا کہ بجلی اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے ذرا دور ایک چٹان بجلی کی زد میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی لیکن اس کی حرارت بوڑھے مراد کے جسم میں سما گئی تھی۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن میں بجلی

بھر گئی ہے اور وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے۔ اب اس کی کمر جھکی ہوئی نہیں ہے۔ بدن اُچھ
کے لئے ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے انگڑائی لی تو دل مچلنے لگا کہ دنیا کی ہر چیز پر بجلی کی طرح
پڑے۔ کہتے ہیں نوجوانوں کے بدن میں بجلی بھری ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اِدھر سے
لہراتے اور مچلتے رہتے ہیں۔ بجلی تو مراد کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ بے اختیار اِدھر
اُدھر اُچھلنے لگا۔

اچھلنے کے دوران پتہ چلا کہ اس کا وزن کئی گنا بڑھ گیا ہے کیونکہ اس کے قدموں
دھمک سے چٹان لرزتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ کاش کہ وہاں روشنی ہوتی تو وہ اپنے
کو دیکھ سکتا کہ اس کے وجود کے اندر اور باہر کیا انقلاب آگیا ہے۔

وہ تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔ اب اسے روشنی کی تلاش تھی۔ وہ اپنے
کو دیکھنا چاہتا تھا اس خیال سے وہ دوڑنے لگا' دوڑتے ہوئے اسے حیرانی ہوئی کہ اس
سانس نہیں پھول رہی ہے اور تھکن کا دور دور تک نام نہیں ہے۔ اس کے اندر جو
بھری ہوئی تھی وہ ایک انسانی رفتار سے زیادہ' ایک ہارس پاور کی رفتار سے بھگائے
جا رہی تھی۔

مزار سے شہر تک ایک گھوڑے کی رفتار سے پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ جب وہ
منٹ میں شہر پہنچا تو گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا' لیکن اس کے ہانپنے میں بڑھاپا
تھکن نہیں تھی بلکہ سینے میں جوان سانسوں کی دھمک ہو رہی تھی۔ اس نے آگے
ہوئے دیکھا' تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں۔ تمام شہر
تھا۔ وہ اسٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔

پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں' مگر اب ان ہاتھوں
گوشت بھرا ہوا تھا اور رگیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ جلد کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا
اس کی اجلی سرخی مائل رنگت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے بدن میں جوانی کا گرم
رہا ہے۔ اس نے خوشی سے جھوم کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھیں' باکسنگ کا
پھر جوشِ جوانی میں ایک زور دار بڑھک لگا کر بجلی کے کھمبے کو ایک گھونسہ رسید
رات کے سناٹے میں "ٹھن" کی آواز ابھری اور بجلی کا کھمبا ایک طرف سے پچک
اس نے حیرانی سے اپنے مکے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو ہلکی سی تکلیف ہوئی
تھی اور وہ لوہے کی تقریباً سولہ گیج کی موٹی چادر کا کھمبا پچک گیا تھا۔ اس نے

طرف دیکھ کر مسرت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یاخدا! میں نے اپنی پچھلی جوانی مانگی تھی مگر واقعی تُو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔ تُو نے
مجھے ہرکولیس کی جوانی دے دی۔ میں تیری اس مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔"

خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ کمر سیدھی ہو جانے کے باعث اب وہ
ساڑھے چھ فٹ کا قد آور بھوت نظر آ رہا تھا۔ بھوت اس لئے کہ سر سے پاؤں تک کیچڑ سے
آلودہ ہو رہا تھا۔ پہاڑی سے لڑھکنے کے دوران کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا
کہ اس حالت میں اسے گھر نہیں جانا چاہئے۔ بیٹا اور بہوئیں بھی اسے پاگل ثابت کرنا
چاہتے تھے۔ اس حالت میں وہ سچ مچ پاگل نظر آئے گا۔ وہ اچھے حلیے میں بیٹے کے پاس پہنچ
کر اچھی طرح اس کی مرمت کرنا چاہتا تھا۔

یہ سوچ کر وہ ایک ایسی دکان کے سامنے رک گیا' جہاں ضرورت کا سارا سامان
فروخت ہوتا تھا۔ دکان کے دروازے پر آہنی شٹر کی دیوار تھی اور تین مضبوط بڑے بڑے
تالے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک تالے کو پکڑ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ پھر
اسے مٹھی میں بھینچ کر ایک زور کا جھٹکا دیا۔ چشم زدن میں ایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ تالا
کھل گیا۔

اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس نے دوسرے تالے کو بھی
ایک جھٹکے سے کھول لیا۔ اسی وقت سیٹی کی آواز سنائی دی۔ گلی کے ایک موڑ پر نائٹ
چوکیدار اچانک ہی سامنے آگیا۔

"خبردار!" اس نے للکار کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

مراد نے تالے کو ایک طرف پھینک کر جواب دیا۔

"میں ایک ضرورت مند ہوں اور اپنی ضرورت کے لئے اس دکان کے تالے کو توڑ
رہا ہوں۔"

"چور......... بدمعاش!" چوکیدار نے لاٹھی کا ایک بھرپور وار کیا۔ مراد نے لاٹھی کو
ایک ہاتھ سے روک کر اپنی طرف کھینچا۔ لاٹھی کے ساتھ چوکیدار بھی کھنچا چلا آیا۔ اس
نے سوچ سمجھ کر ایک ہلکا سا گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ سوچنے سمجھنے کے باوجود وہ اپنی
جوانی کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ وہ ہلکا سا گھونسہ بھی زبردست ثابت ہوا چوکیدار
آواز نکالے بغیر ہی دروازے کے قریب گر پڑا۔ اس نے جلدی سے تیسرے تالے کو ایک

جھٹکا دے کر الگ کیا۔ شٹر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ چوکیدار کو گھسیٹ کر اندر لایا۔ پھر اندر سے شٹر کو گرادیا۔ چوکیدار کا بے حس جسم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی کمر سے ایک ٹارچ لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ لے کر اسے روشن کیا اور وہاں اپنی ضرورت کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔

اس بڑی سی دکان کے کئی حصے تھے۔ کوئی حصہ ریڈی میڈ ملبوسات کے لئے مخصوص تھا' کوئی ڈرائی فوڈ اور میک اپ کے سامان کے لئے وقف تھا۔ دکان کے ایک دور افتادہ گوشے میں ایک دفتر نما کمرہ تھا۔ مراد نے پہلے اس کمرے کے باتھ روم میں اچھی طرح غسل کیا۔ اس مقصد کے لئے دکان سے صابن کی ٹکیہ اور تولیہ لے کر استعمال کیا۔ اس نے دکان کے اس حصے میں بلب روشن کرلیا تھا کیونکہ وہاں سے روشنی سڑک تک نہیں جاسکتی تھی۔ اس روشنی میں اس نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پہلے خود کو پہچان نہ سکا۔ آئینے میں وہ اس قدر خوبرو نوجوان نظر آرہا تھا کہ آنکھوں سے دیکھ کر بھی اپنی نوجوانی کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایک باڈی بلڈر کی طرح اپنے جسم کو ہر زاویے سے توڑ موڑ کر دیکھا۔ وہ بلاشبہ ہرکولیس کی کاربن کاپی نظر آرہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اپنی اس جوانی کی حفاظت کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔ حفاظت کے خیال سے یاد آیا کہ اسے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ مگر وہ جوان ہوتے ہی دشمنی مول لے رہا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ایک گھونسے میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ دکان کے تالے توڑ کر مالک دکان اور قانون کو اپنا دشمن بنا رہا تھا۔ اس طرح تو وہ ایک دو دن سے زیادہ جوان نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی دشمن نے اگر اسے ہلاک کر دیا یا عدالت سے سزائے موت مل گئی تو وہ مرنے سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے گا۔

اس نے جلدی سے اپنے کان پکڑ لئے اور آئینے کے سامنے اپنے آپ کو گواہ بنا کر وعدہ کیا کہ آئندہ غلط مقاصد کے لئے اپنی بے پناہ قوتوں کو استعمال نہیں کرے گا اور اب اسے فوراً ہی وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جائے۔

وہاں سے نکلنے کے بعد وہ ایک لباس نکال کر پہننے لگا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر اس نے اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لیا تو پھر جوانی کی یہ قوتیں کس کام آئیں گی؟ وہ اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ لینے کے لئے ہی جوانی کی دعائیں مانگتا رہا تھا۔ اب دشمنوں عبرت آموز سبق دیئے بغیر اسے ذہنی سکون نصیب نہیں ہوگا۔ قوتوں کا استعمال ہو

جوانی محض ایک کھوکھلی سی نمائش بن کر رہ جائے گی۔

وہ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہ اپنے دل کو کیسے سمجھائے دشمنوں کو کیسے معاف کرے؟ دل کسی طرح نہیں مانتا تھا کہ دشمنوں کو معاف کیا جائے۔ بدلہ تو لینا ہی ہوگا۔ خواہ چھپ کر خواہ بھیس بدل کر۔ بھیس بدلنے کے خیال سے وہ آئینے کے سامنے ٹھٹک گیا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور وہ میک اپ کا سامان نکال کر اس تدبیر پر عمل کرنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد وہ دکان سے باہر آیا تو اس کا حلیہ اور اس کی عمر بدل چکی تھی۔ اس کے سر کے بال پہلے کی طرح سفید تھے' بدن کی اجلی سرخی مائل رنگت مٹیالی ہوگئی تھی اور اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ سوچتا جارہا تھا۔

"یہ بہروپ ٹھیک ہے۔ میں اپنے دشمنوں سے ایک بوڑھے کے روپ میں انتقام لیا کروں گا۔ پھر میک اپ اتار کر نوجوان کے اصلی روپ میں آجایا کروں گا۔ میرے دشمن بوڑھے مراد کو تلاش کرتے رہیں گے۔ کوئی مجھے دیکھ کر یہ یقین نہیں کرے گا کہ بوڑھا مراد ہرکولیس کی طرح جوان ہوگیا ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔ انسان اسے ناممکن سمجھتے ہیں اور ناممکن سی بات کا وہ کبھی یقین نہیں کریں گے۔ مجھے کوئی دوسری ہستی سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔

اب چونکہ میری شکل بدل چکی ہے لہٰذا میرا نام بھی بدل جانا چاہئے۔ ایک نوجوان کے روپ میں میرا نام کیا ہونا چاہئے میرا نام؟ ہوں اوں ہاں! اب میرا نام یوسف رازی ہوگا۔ یوسف اس لئے کہ جوان ہو کر مجھے حسن یوسف ملا ہے اور رازی اس لئے کہ میرا بڑھاپا اور میری جوانی ایک ایسا راز ہے جس کی تہہ تک کسی انسان کا دماغ نہیں پہنچ سکتا..........."

وہ سوچتا ہوا اپنی اسی شاندار کوٹھی کی طرف جارہا تھا جس پر اب بیٹے اور بہو کا قبضہ تھا

دوسری صبح بیٹا اور بہو ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے سامنے سنٹر ٹیبل پر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس رکھا ہوا تھا اور وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مزید دولت کمانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور بریف کیس کے ان نوٹوں کو کاروبار میں لگانا چاہتے تھے کہ اتنے میں زینے پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ دونوں

نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بوڑھا اپنے بیڈ روم سے نکل کر زینے سے اترتا ہوا ڈرائنگ روم میں آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بہو نے غصے سے کہا۔

"ارے یہ بوڑھا پھر مصیبت بن کر آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی گھر پر رات بسر کی ہے اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔"

"ڈیڈی!" بیٹے نے بھی غصے سے پوچھا۔ "تم کس طرح گھر میں داخل ہوئے تھے دروازے اور کھڑکیاں تو اندر سے بند تھیں۔"

"بیٹے! یہ میرا گھر ہے۔ اس گھر کے درودیوار مجھے پہچانتے ہیں لہٰذا میرے لئے خودبخود کھل جاتے ہیں۔"

بہو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "یہ گھر تمہارا نہیں' ہمارا ہے۔ نکل جاؤ یہاں سے............"

وہ دھکا دینے کے لئے پیچھے آگئی۔ بیٹا آگے آکر کھڑا ہوگیا............ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ بہو پیچھے سے دھکا دیتی تھی اور بیٹا آگے سے مارتا تھا لیکن اس بار بہو نے پوری قوت سے دھکا دیا تو وہ اپنی جگہ بوڑھے برگد کی طرح مضبوطی سے جما رہا۔ بیٹے نے آگے سے مارا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میں ایک شرط پر اس گھر سے جاؤں گا۔ تم اپنے باکسر باپ کو صرف ایک گھونسہ مارنے میں کامیاب ہوجاؤ۔ اگر تم نے ایک پوائنٹ بنالیا تو میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے بیٹے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے باپ کی جھکی ہوئی کمر دیکھی۔ اس کی ضعیفی کو نگاہوں میں تولا۔ پھر اس پر تابڑ توڑ گھونسے مارنے لگا۔ تقریباً تیس سیکنڈ تک مسلسل حملے کرتا رہا۔ مگر ایک پوائنٹ بھی حاصل نہ کرسکا۔ پھر ذرا دیر کے لئے رک کر ہانپنے لگا۔

"برخوردار! بوڑھے باپ کے سامنے جوان ہوکر ہانپ رہے ہو چلو پوائنٹ بناؤ۔"

اس نے بیٹے کے سر پر ایک ہلکی سی چپت ماری۔ اس کی کھوپڑی جھنجھنا کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ بہو دوڑتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس پہنچی اور اس کے سر کو سہلاتی ہوئی بولی۔

"خبیث بوڑھے! کیا تو میرے سہاگ کا دشمن ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "دشمنی کی ابتدا تم دونوں نے کی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بوڑھا باپ جوان بیٹے کا طمانچہ برداشت کرلیتا ہے لیکن جوان بیٹا بوڑھے باپ کی ایک ہلکی سی چپت کھا کر گر جاتا ہے۔ یہ آج کل کے نوجوان ہیں............ افسوس۔"

بیٹا کراہتے ہوئے اٹھنے لگا۔ باپ نے کہا۔ "تم ایک بھی پوائنٹ حاصل نہیں کرسکتے۔ پھر بھی میں اس گھر سے چلا جاؤں گا مگر خالی ہاتھ نہیں' یہ بریف کیس لے کر............"

بریف کیس کی بات آتے ہی بیٹے نے جلدی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مراد نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اس نے بیٹے کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو بریف کیس کے نیچے دبا دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔

"بیٹے! اگر تم اپنی انگلیاں بریف کیس کے نیچے سے نکال لو تو اس کی ساری رقم تمہاری ورنہ میری............"

اس نے دوسرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنی انگلیوں کو آزاد کرانا چاہا جبکہ مراد نے بریف کیس پر صرف ایک انگوٹھے کا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ بہو نے حیرانی سے سوچا۔ "نہیں۔ اس بوڑھے کے انگوٹھے میں اتنی قوت نہیں ہوسکتی کہ اس کا جوان صحت مند خاوند بریف کیس کو اس جگہ سے ہٹا نہ سکے۔"

وہ آگے بڑھ کر سسر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہٹانے لگی۔ مگر وہ انگوٹھا بریف کیس میں جیسے پیوست ہوگیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے نیچے بیٹے کی انگلیاں پسی جارہی تھیں اس نے پھر تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے کہا۔

"اوہ ڈیڈی! خدا کے لئے چھوڑ دو۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ میں نے جوانی کے نشے میں تم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ مجھے معاف کردو۔"

مراد بریف کیس اٹھا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی انگلیاں ایسے نظر آرہی تھیں جیسے ہتھوڑے سے کچل دی گئی ہوں۔ وہ تکلیف سے کراہتا رہا اور روتا رہا۔ بہو بڑبڑاتی رہی اور اس کی مرہم پٹی کرتی رہی۔ پھر وہ بریف کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"لاؤ۔ یہ بریف کیس مجھے دو۔"

"بہو! اگر تم نے اس بریف کیس کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔ اس کمبخت کا حشر دیکھ لو' پھر مطالبہ کرو۔"

وہ سہم کر اپنے خاوند کے پاس چلی گئی۔ پھر اس نے ڈرتے ہوئے دھمکی دی۔ "اس بریف کیس میں پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ اگر تم نے واپس نہ کیا تو میں ابھی تھانے میں فون کروں گی۔"

بیٹے نے اپنی بیوی سے کہا۔ "بیگم! تم خاموش رہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری باتوں میں آکر ڈیڈی کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ جب تک باپ اپنے بچے کے کان پکڑ کر اسے سزا نہیں دیتا اس وقت تک بچے کو عقل نہیں آتی۔ اب مجھے عقل آگئی ہے۔ ڈیڈی! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ ساری دولت اور جائیداد آپ کی ہے۔ آپ واپس لے لیں۔"

مراد نے کہا۔ "شاباش بیٹے! تم نے سعادت مندی کا اظہار کرکے دل خوش کر دیا ہے۔ میں تمہیں صرف یہ سبق سکھانے آیا تھا کہ بوڑھے والدین کو پھٹے پرانے کپڑے سمجھ کر باہر نہ پھینکو۔ ان کا بڑھاپا دولت اور جائیداد کا نہیں' صرف تمہاری محبت اور توجہ کا محتاج رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارا محتاج نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں رہنے کے لئے آیا ہوں۔"

بیٹا ضد کرنے لگا کہ باپ کو اب اسی گھر میں رہنا چاہئے۔ بہو نے بھی رسمی طور پر معافی مانگ کر اسے ساتھ رہنے کے لئے کہا لیکن اس نے جواب دیا۔

"میں یہاں کسی صورت سے رہنا نہیں چاہتا۔ بیٹے! میں تم سے صرف ایک کام لینا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے ڈیڈی! میں ایک نہیں آپ کے ایک ہزار کام کرنے کو تیار ہوں۔"

مراد نے کہا۔ "میری جوانی کے زمانے میں رستم نامی ایک مشہور باکسر تھا۔ وہ مرچکا ہے۔ اب اس کا ایک بیٹا ہیوی ویٹ باکسر ہے۔ تم کسی باکسنگ کلب کے ذریعے اسے چیلنج کرو کہ مراد علی ریٹائرڈ باکسر اس سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جیت جائے گا تو میری طرف سے اسے ایک لاکھ روپے انعام میں دیئے جائیں گے۔ اگر وہ ہار جائے گا تو اس کی طرف سے شرط لگانے والوں کی رقم مجھے ملے گی۔"

"ڈیڈی! اس نوجوان باکسر کی طرف سے کتنے ہی لوگ یہ سوچ کر بڑی بڑی رقمیں لگائیں گے کہ آپ اس کے مقابلے میں بوڑھے ہیں اور کمزور ہیں۔ پہلے ہی راؤنڈ میں شکست کھاجائیں گے۔"

"ہاں۔ انہیں یہی سوچنے دو۔ ان کی لگائی ہوئی تمام رقمیں ہماری جیب میں آئیں گی۔ ان کے اطمینان کے لئے اگر تمہیں ایک لاکھ سے بھی زیادہ رقم بڑھانی پڑے تو تم بلا تامل رقم بڑھا دینا۔ تمہارا بوڑھا باپ اس رقم کو ڈوبنے نہیں دے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ شکست کھائیں گے۔ کیا ابھی میں نے آپ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا ہے؟"

مراد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مقابلہ ہونے تک مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ دس ہزار بھی تمہیں واپس مل جائیں گے۔"

بیٹے نے بریف کیس سے مطلوبہ رقم نکال کر دی۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ جب بھی ضرورت ہوئی تم سے فون پر رابطہ قائم کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمر جھکائے آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس پہاڑی کی طرف جانے لگا جہاں اسے از سر نو جوانی نصیب ہوئی تھی۔ جب ٹیکسی اس دکان سے گزرنے لگی جس کے تالے اس نے توڑے تھے تو ڈرائیور نے اسے بتایا کہ پچھلی رات ایک چور اس دکان میں داخل ہوا تھا اور اس نے ایک چوکیدار کو ہلاک کر دیا ہے۔

یہ سن کر مراد کی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آنے لگا۔ خیریت ہوئی کہ پچھلی رات چوکیدار کے سوا کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا ورنہ اب تک جیل میں ہوتا۔ وہ اپنے آپ پر جھنجھلانے لگا کہ اس نے چوکیدار کو گھونسہ کیوں مارا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت ہی ہلکا سا گھونسہ تھا لیکن خود اسے اپنی بے پناہ قوت کا اندازہ نہیں تھا۔

جوانی کی گولی دینے والے بزرگ نے کہا تھا کہ بڑھاپے سے بچنا چاہتے ہو تو کسی کو اپنا دشمن نہ بناؤ' اور اس نے چوکیدار کو ہلاک کرکے قانون کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اپنے گھر جاکر بیٹے اور بہو کو بھی پریشان کیا تھا اور وہاں بھی ایک انگوٹھے سے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں تو بات بن گئی کہ بیٹے کو عقل آگئی اور وہ باپ کا فرمانبردار بن گیا اگر وہ دونوں بھی قانون کے دروازے پر دستک دینا چاہتے اور وہ انہیں روکتے سے نے بیٹے یا بہو میں سے کسی کو ہلاک کر دیتا تو پھر وہی پھانسی کا پھندا اس کا مقدر بن جاتا۔ وہ پھانسی کے پھندے سے لٹک کر مرتا نہیں۔ جب اسے پھندے سے اتارا جاتا تو زندہ ہی رہتا۔ مگر اس

کی جوانی بڑھاپے میں بدل چکی ہوتی۔ اور وہ موت سے نہیں بڑھاپے سے ڈرتا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ کبھی اپنی طاقت کا مظاہر نہیں کرے گا اور کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ اب رستم کے بیٹے سے بھی باکسنگ کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ مقابلے میں اس نوجوان باکسر کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ اور اس کے ساتھی سب ہی دشمن بن جائیں گے لہٰذا فی الحال اس دشمن سے انتقام لینے کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے یہ سوچ کر اس نے ایک ٹیلیفون بوتھ کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ پھر وہاں سے فون پر بیٹے سے کہہ دیا کہ ابھی وہ کسی باکسنگ کلب سے رابطہ قائم نہ کرے۔ اس نے کچھ عرصے کے لئے مقابلے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔

وہ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پہاڑی کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت وہ مطمئن تھا کہ اب کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن تقدیر کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچتے ہی رستم کے بیٹے سے سامنا ہو گیا وہ اپنی کار سے اتر کر مزار کی طرف پہاڑی کی بلندی پر جانا چاہتا تھا۔ مراد کو ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر وہ رک گیا۔ جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو نوجوان باکسر نے مراد سے کہا۔

”گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف جاتا ہے مگر تم جنگل کی طرف آئے ہو۔ یہ اچھا ہوا۔ میں یہاں تمہاری لاش گرادوں گا تو قانون میرا ہاتھ پکڑنے نہیں آئے گا۔“

مراد نے جھکی ہوئی کمر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ ”میں تم سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم بھی اس مزار پر دعا مانگنے آؤ گے۔“

نوجوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اوپر جو قبر بنی ہوئی ہے۔ وہ میرے باپ کی ہے۔ یہاں سے گزرنے والے اسے کسی بزرگ کا مزار سمجھ کر دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ میرے والد نے اپنی زندگی میں پہاڑی کا وہ حصہ خرید لیا تھا اور وہاں ایک عالیشان کوٹھی بنانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی تم نے انہیں شکست دی۔ یہ ان کے غرور کی شکست تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ ان کی لاش کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے دو باتوں کا عہد کیا تھا کہ اپنے والد کی طرح نامور باکسر بنوں گا۔ باکسنگ کے ذریعے دولت کما کر اس پہاڑی پر اپنے مرحوم والد کی خواہش کے مطابق ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کراؤں گا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ تمہیں گھونسے مار مار کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔

میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری خواہش پوری کرنے کے لئے تم میرے والد کی قبر کے پاس چلے آئے ہو اور آج ہی میں دس ہزار روپے کوٹھی کی بنیاد ڈالنے کے لئے لایا۔ چلو اچھا ہے۔ کوٹھی کی بنیاد میں اب تمہارے لہو کے قطرے بھی ٹپکائے جا سکیں گے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا ہمارے درمیان صلح نہیں ہو سکتی۔ میں لڑائی جھگڑا کرنا اور مزید کسی کو دشمن بنانا نہیں چاہتا۔ تمہارے والد رستم علی باکسر کی یہ خواہش تھی کہ اس پہاڑی پر ایک کوٹھی تعمیر کی جائے۔ میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس کی بنیاد ڈالنے کے لئے دس ہزار روپے ابھی دیتا ہوں اور آئندہ بھی مجھ سے جو کچھ ہو گا‘ اس کی تعمیر کے لئے کچھ نہ کچھ دیتا رہوں گا۔“

”بڈھے! تو اپنی جان بچانے کے لئے مجھے رشوت دینا چاہتا ہے بیوقوف! تیری جیب میں دس ہزار روپے ہیں۔ انہیں تو میں ابھی تجھے ہلاک کر کے حاصل کر لوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسہ مارا۔ مراد نے بائیں ہاتھ سے اس گھونسے کو روک کر کہا۔

”تو اپنی جوانی پر غرور نہ کر۔ تیری جیب میں بھی دس ہزار ہیں۔ کیا پتہ کہ وہ دس ہزار مجھے مل جائیں۔“

نوجوان باکسر نے زور دار قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی جیب سے دس ہزار کے نوٹ نکال کر زمین پر ایک پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔

”یہ لے دس ہزار........ اگر تو نے ایک پوائنٹ بھی بنا لیا تو میں یہ رقم تجھے دے دوں گا۔“

مراد نے اپنی جیب سے رقم نکال کر اسی پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پورے دس ہزار نہیں ہیں۔ پندرہ روپے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیئے تھے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ صرف ایک پوائنٹ بنا لے اور یہ رقم لے جا۔“

وہ جھک کر پتھر کے نیچے روپے رکھ رہا تھا۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر اسے لات ماری۔ مراد نے اس کے پاؤں کے تلوے کو اپنی ہتھیلی پر روک کر اسے پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ نوجوان باکسر فضا میں ایسے بلند ہوا جیسے سکے کی طرح ٹاس کیا گیا ہو۔ پھر وہ اچھل کر کار کی چھت پر گرا اور وہاں سے پھسلتا ہوا دوسری طرف پتھریلی زمین پر دھپ

سے آپڑا۔ تھوڑی دیر تک وہ زمین پر پڑا سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کس طرح فضا میں اڑتا ہوا اتنی دور آپڑا ہے۔ پتھریلی زمین کے باعث جو چوٹیں آئی تھیں وہ بھی حیرانی کی شدت سے یاد نہ رہیں۔ پھر وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کمزور بوڑھے میں اس طرح اچھال پھینکنے کی قوت ہے۔

وہ کار سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔ چند لمحات تک اس بوڑھے کو حیرانی سے دیکھا پھر دل ہی دل میں کہا۔ "یہ ناممکن سی بات ہے کہ ایک بوڑھا مجھ جیسے قوی ہیکل جوان کو سکے کی طرح اچھال دے۔ مجھے ذرا سنبھل کر گھونسوں سے اس کی مرمت کرنا چاہئے۔"

یہ سوچ کر وہ باقاعدگی سے اس پر گھونسے برسانے لگا۔ مراد نے بڑی سہولت سے اس کے حملوں کو روکتے ہوئے نصیحت کی۔ "برخوردار اتنی فاسٹ بلونگ نہ کرو تم لائٹ پنچنگ سے بھی پوائنٹ حاصل کرسکتے ہو۔"

اس نے جھلا کر کہا۔ "بوڑھے خبیث! تُو پوائنٹ حاصل کرنے کی بات کرتا ہے' میں تجھے موت کی نیند سلا کر ہی دم لوں گا۔"

"نوجوان! تُو اپنی ضد سے باز نہیں آئے گا۔ لے میرا ایک پنچ سنبھال.........."

یہ کہہ کر اس نے بائیں مکے سے پنچ کیا۔ نوجوان نے اسے ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ مکا ہاتھ کی ڈھال سے گزرتا ہوا اس کے منہ پر آیا اور اس کا منہ گھوم گیا۔ اس نے دوسرا گھونسہ رسید کیا۔ اس بار گردن گھوم کر پھر سیدھی ہوگئی۔ مگر وہ سیدھا زمین پر ہمیشہ کے لئے لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ ایسے پچک گیا تھا کہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔

مراد نے اس کی جیب ٹٹول کر شناختی کارڈ نکال لیا تاکہ اس کی لاش پہچانی نہ جاسکے۔ پھر اس نے پتھر کے نیچے سے وہ تمام روپے نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ اس کے بعد نوجوان باکسر کی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

وہاں سے دس میل دور اس نے سمندر کے ساحل پر کار روکی۔ وہ ساحل ویران تھا۔ دور دور تک ایک بھی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر غسل کرنے اور بڑھاپے کا میک اپ اتارنے لگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی طرف جارہا تھا تو اس کی کمر سیدھی ہوگئی تھی سر کے بال سیاہ ہوگئے تھے اور اب اس نوجوان کا نام یوسف رازی تھا۔

شہر کی ایک ویران سڑک پر اس نے کار چھوڑ دی اور پیدل چلنے لگا۔ اس نے سب پہلے ایک پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں ایک خوبصورت کوٹھی کرائے پر حاصل کی۔ پھر اس کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر اس نوجوان باکسر کی پچھتانے لگا۔ ہر انسان غلطی کے بعد ہی پچھتاتا ہے۔ اس نے پھر ایک قتل کر کے ت پر ...نوں کو اپنا دشمن بنانے کی غلطی کی تھی۔

وہ بہت دیر تک اپنے جرم کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ ر کسی نے اسے نوجوان باکسر سے لڑتے دیکھا ہوگا تب بھی اس کی شناخت نہیں کرسکے گا یونکہ اس وقت وہ بوڑھا مراد علی تھا.......... اب جوان یوسف رازی بن گیا ہے۔"

پھر بھی اس نے سوچا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن اسے قصائی کی چھری تلے آنا ہی پڑتا ہے۔ لہٰذا اب اسے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔ یوسف رازی کے روپ میں کسی انسان کے بچے کو بھی اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ سوچنے کو تو وہ بہت کچھ محتاط ہو کر سوچ لیتا تھا لیکن بعد میں یہ بھی سوچنے لگا کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اگر بھولے سے بھی جوانی کے غرور میں کسی ایک سے لڑ بیٹھا تو ایک کے پیچھے ایک سو دشمن پیدا ہوجائیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغرور نہ بنے اور مغرور نہ بننے کے لئے لازمی ہے کہ جس طرح انسان زندہ رہ کر موت کو یاد رکھتا ہے' اسی طرح وہ جوان ہو کر بڑھاپے کو یاد رکھے۔ اگر اس کا گزرا ہوا بڑھاپا پیشِ نظر رہے گا تو اس کی جوانی کبھی ٹھوکر نہیں کھائے گی۔

اس رات وہ نیند آنے تک اسی ایک نکتے پر غور کرتا رہا کہ کس طرح ہمیشہ بڑھاپے کو یاد رکھ کر خوف کھاتا رہے۔ کمبخت ایسی جوانی ملی تھی کہ وہ موت سے نہیں ڈراتی تھی' صرف بوڑھا کردینے کی دھمکی دیتی رہتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کھانے کے سامنے بھوک کو اور جوانی کی موجودگی میں بڑھاپے کو بھول جاتا ہے۔ لہٰذا ہر دم بڑھاپے کو اپنے سامنے رکھ کر اسے یاد کرتے رہنا ضروری تھا۔

دوسری صبح جب وہ بہترین سوٹ پہن کر اور رنگین شیشوں کی عینک لگا کر سپر مارکیٹ میں پہنچا تو کتنی ہی لڑکیوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی جانب اٹھتی رہیں۔ وہ اتنا خوبرو اور اسمارٹ تھا کہ اسے ایک بار دیکھنے والے بار بار دیکھنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ وہ ایک دکان میں داخل ہوا تو اس کا بیٹا اور بہو وہاں شاپنگ میں مصروف تھے۔ بہو کی نظر

اس پر پڑی تو اس نے اپنے خاوند کو کہنی سے ٹھوکا مار کر آہستگی سے کہا۔

"ذرا اس نوجوان کو دیکھئے۔ اس کی شکل آپ کے ڈیڈی سے کتنی ملتی ہے۔"

بیٹے نے اسے دیکھا پھر حیرانی سے کہا۔ "واقعی بالکل ڈیڈی کی جوانی کی تصویر ہے۔"

دوسرے کاؤنٹر کے پیچھے بہت سی گڑیاں اور گڈے نظر آرہے تھے۔ یوسف رازی سیلز مین سے پوچھ رہا تھا۔

"یہاں صرف جوان گڈے اور گڑیا ہیں۔ کیا کسی بوڑھے آدمی کا پتلا نہیں ہے؟"

سیلز مین نے ایک بوڑھے کا پتلا نکال کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس بوڑھے کا ایک ہاتھ جھکی ہوئی کمر پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے جھکے جھکے سلام کر رہا تھا۔ یوسف رازی نے پوچھا۔

"یہ بوڑھا کسے سلام کر رہا ہے؟"

سیلز مین نے جواب دیا۔ "یہ بوڑھا اپنی خاموش ادا سے کہہ رہا ہے کہ بڑھاپے کو دور سے سات سلام......... اور اس سلام کی قیمت ہے پچیس روپے........."

"مجھے ایسے ہی ایک بوڑھے کی ضرورت تھی جو بڑھاپے کو دور سے سلام کرتا ہو۔ آپ اسے پیک کر دیں۔"

اس نے جیب سے قیمت نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ بیٹے نے قریب آکر اسے مخاطب کیا۔

"مسٹر! میرا نام شمشاد علی ہے۔ میں مشہور و معروف باکسر مراد علی کا لڑکا ہوں اور یہ میری وائف ہیں۔"

اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرا نام یوسف رازی ہے۔"

اس کے بیٹے شمشاد علی نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر اس لئے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ میرے والد کے ہم شکل ہیں۔ میرے والد اپنی جوانی میں ہوبہو آپ کی تصویر تھے۔"

"اچھا آپ کے والد کہاں ہیں؟ میں ان سے ضرور ملوں گا۔"

"میرے ڈیڈی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے کبھی ان کا جی چاہتا ہے تو وہ آکر ہم سے ملاقات کر لیتے ہیں۔ وہ کچھ عجیب قسم کے انسان ہیں۔ نہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور نہ ہی اپنا پتہ

بتاتے ہیں۔"

"پھر تو واقعی عجیب قسم کے انسان ہیں۔ اگر میں بوڑھا ہوتا تو آپ سے کہتا کہ آپ مجھے ڈیڈی کہہ کر ان کی کمی پوری کر لیں۔"

اس بات پر وہ سب ہنسنے لگے۔ بہو نے مراد علی عرف یوسف رازی کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے کہ آپ بوڑھے ہوں۔ آپ اتنے ہینڈسم ہیں کہ آپ کے بڑھاپے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ ہمارے ہاں آنا پسند کریں گے؟"

شمشاد علی نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "بیگم! یہ ہمارے ہاں کیسے آسکتے ہیں؟ ہم آج شام کی ٹرین سے احمد آباد جا رہے ہیں۔ ایک ماہ کے بعد واپس آئیں گے۔ اس کے بعد ہم انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیں گے۔"

یہ کہتے ہی وہ اپنی جوان بیوی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ذرا ٹھہر تو جائیے۔ ہمیں ایک دوسرے کا ایڈریس معلوم کرنا چاہئے۔ ورنہ اتنے بڑے شہر میں ہم انہیں کہاں تلاش کریں گے۔ مسٹر یوسف رازی۔ میرا نام شہناز ہے۔ میرا فون نمبر دو پانچ سات صفر سات سات ہے۔"

شمشاد علی اپنی حسین بیوی کو کھینچ کر لے جانے لگا۔ مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شہناز صاحبہ! فون نمبر کافی ہے۔ میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔"

شمشاد نے گھور کر مراد علی کو دیکھا لیکن اس کے ڈیل ڈول اور کسرتی بدن کو دیکھ کر اس سے الجھنے کی جرات نہ ہوسکی۔ وہ شہناز کو جبراً دکان سے باہر لاتے ہوئے بولا۔

"مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تمہیں اس سے بے تکلف ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی بولی۔ "میں اپنی ضرورت کو تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ میں تمہارے جیسے بے حس اور بے ضرر مرد کے ساتھ کب تک زندگی گزارتی رہوں گی؟"

شمشاد نے گھبرا کر چاروں طرف [illegible] "آہستہ بولو! کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟ کیا تم بھول گئی ہو کہ تم نے میرے ساتھ تحریری معاہدہ کیا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے تم کسی بھی مرد سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھو گی۔ ورنہ میری دولت اور جائیداد

سے محروم ہو جاؤ گی۔ میں جیسا بھی ہوں تمہیں میری عزت کی خاطر ساری زندگی میرے ساتھ گزارنی ہو گی۔ اب فیصلہ کرو۔ میری لاکھوں کی جائیداد چاہتی ہو یا اس نوجوان یوسف رازی کو؟"

شہناز نے بڑی حسرت سے دکان کی طرف دیکھا اسے یوسف رازی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر سر جھکا کر شمشاد کے ساتھ جانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد مراد علی ایک پیکٹ ہاتھوں میں لئے دکان سے باہر آیا اور ایک طرف آگے بڑھنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے مرد ہوں یا عورت سب ہی ایک بار حُسن یوسف کو دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں۔ وہ ایک بس اسٹاپ پر آکر رک گیا اور کسی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر سے اس کے دماغ کی اسکرین پر شہناز کا حسین سراپا ابھر رہا تھا اور وہ بار بار اسے اپنے دماغ سے دور جھٹک رہا تھا۔ کیونکہ وہ رشتے میں اس کی بہو تھی' بیٹے کی عزت تھی۔ مگر وہ جو منہ زور جوانی اسے نصیب ہوئی تھی' وہ اس کا دماغ خراب کر رہی تھی۔ جب کوئی بہت ہی خوبصورت کھلونا نہیں ملتا تو پھر کسی معمولی یا سستے کھلونے سے دل بہلا لیا جاتا ہے۔ وہ بھی دل بہلانے کے لئے اپنے آس پاس نظر دوڑانے لگا۔ فٹ پاتھ سے کتنی ہی نوجوان عورتیں اور نوخیز لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ گزرنے والی گھڑیوں کو کون پکڑ سکتا ہے۔ وہ ٹھہرنے والی کو دیکھنے لگا۔ وہ بس کا انتظار کرنے کے لئے قریب ہی آکر رک گئی تھی۔ وہ سانولے رنگ کی تھی اور اس کی سہیلی کا رنگ اجلا اور خوب نکھرا نکھرا تھا لیکن سانولی لڑکی کے چہرے کے نقوش اور بدن کی تراش اتنی عمدہ تھی کہ نگاہیں اس پر ہی ٹھہرتی تھیں۔

اور مراد اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔

"آج بھی ناکامی ہوئی۔ انہوں نے دوسری ملازمہ رکھ لی ہے۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میں سب تک تم سے قرض لے کر زندگی گزارتی رہوں گی۔"

"تمہیں ملازمت نہیں مل رہی ہے تو تم کیا کرو گی؟ آج میں تمہارے مشکل وقت میں کام آ رہی ہوں۔ کبھی تم میرے کام آجانا.......... یہ لو' میری بس آگئی میں چلتی ہوں۔ اب کل ملاقات ہو گی۔"

ایک بس قریب آکر رک گئی۔ اس کی سہیلی نے بس پر چڑھتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ پھر بس آگے بڑھ گئی۔ وہ سانولی لڑکی تنہا رہ گئی۔ مراد کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔

"بیٹے! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو چند لمحوں تک بے اختیار اسے دیکھتی رہ گئی۔ اب سے پہلے کبھی ایسا مردانہ حسن اور پُرکشش شخصیت اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی نگاہیں جھکا لیں اور کسی نامعلوم جذبے سے اندر ہی اندر کانپنے لگی۔ وہ سیدھی سادی سی لڑکی تھی اور یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ ایک خوبرو نوجوان کو دیکھ کر اس کا دل آپ ہی آپ کیوں دھڑکنے لگا ہے۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا آپ کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے؟"

وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "جی.......... جی ہاں۔"

"آپ کیا کام کر سکتی ہیں؟"

"میں.......... میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ میں کسی کے گھر میں جھاڑو دے سکتی ہوں' برتن مانجھ سکتی ہوں کھانا پکا سکتی ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ کل صبح آپ گلبرگ کی کوٹھی نمبر سات بی' میں چلی جائیں' وہاں آپ کو اچھی تنخواہ پر نوکری مل جائے گی۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ میں کل صبح ضرور وہاں جاؤں گی۔"

"ابھی آپ اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں آپ دونوں کے پیچھے کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ اگر آپ کو کچھ روپے کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لیجئے۔ مجھے آپ کے کام آکر خوشی ہو گی۔"

"آپ کی اتنی ہی مدد کافی ہے کہ آپ کے ذریعے مجھے ملازمت مل جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ روپے پیسے سے مدد کریں اور میری غربت کا مذاق اڑائیں۔"

مراد کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ بس آکر رک گئی تھی۔ لڑکی آگے بڑھ گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو اس نے بس کے پائیدان پر کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔ مراد سے نگاہیں ملتے ہی پھر اس نے پلکیں جھکا لیں۔ وہ ذرا دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد بس اسے لے کر چلی گئی۔

وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ اس نے شہناز کی طرف

سے اپنے خیالات موڑ لئے تھے۔ اب وہ سانولی سلونی دوشیزہ اس کی سوچ پر حاوی ہو رہی تھی۔ جوانی بھی کیا چیز ہوتی ہے آپ ہی آپ حوا کی بیٹیوں پر مائل ہوتی رہتی ہے بڑھاپے میں اس نے صرف دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے جوانی کی تمنا کی تھی۔ جوانی کے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ جوان ہوتے ہی حسینوں کے لئے دل مچلنے لگے گا۔ اس نے بیڈ روم میں آکر پیکٹ کو کھولا اور اس میں سے بوڑھے آدمی کا مجسمہ نکال کر آتش دان میں رکھ دیا۔ اس آتش دان میں آگ نہیں جلائی جاتی تھی۔ وہ محض ڈیکوریشن کے طور پر بنایا گیا تھا۔ وہ پتلے کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھے، دوسرے ہاتھ سے سلام کر رہا تھا۔ مراد نے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے پتلے سے کہا۔

"بابا جی! بڑھاپے کو سات سلام......... میں روزانہ صبح و شام تمہارے پاس آکر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھ کر اپنے اس بڑھاپے کو یاد کروں گا جو میری کسی غلطی سے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں گا اور موت سے بھی زیادہ بھیانک بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔ اس جوانی میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بناؤں گا۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہوگا تو پھر کوئی بھی مجھے خنجر سے یا کسی آتشیں اسلحے سے یا زہر دے کر ہلاک نہیں کرے گا۔ اس طرح میں سدا جوان رہوں گا۔ اس لئے اے بڑھاپے! تجھے سات سلام........."

وہ دیر تک بوڑھے پتلے کے سامنے بیٹھا بڑھاپے سے ڈرتا رہا اور موجودہ جوانی میں کوئی غلطی نہ کرنے کا عہد کرتا رہا۔ پھر اس کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا حسین عورتوں سے دوستی کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہاں، حسین عورتیں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ وہ اگر کسی حسینہ کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرلے گا یا اسے نقصان پہنچائے گا تب وہ اس کی دشمن بن جائے گی اور اگر دونوں طرف سے نکاح کے بغیر ہی "قبول ہے" کی رضامندی ہوگی تو پھر دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

سوچتے وقت وہ سانولی سلونی لڑکی خیالوں میں آگئی۔ اس نے اپنی ہی کوٹھی کا پتہ اسے دیا تھا۔ ارادہ تھا کہ اسے اپنے گھر کی دیکھ بھال اور کھانے پکانے کے لئے ملازمہ رکھ لے گا۔ ملازمت کے دوران اگر وہ اس کی طرف مائل ہوگئی تو اچھی بات ہے۔ ورنہ وہ

اس کمزور سی لڑکی کو بھی دشمن نہیں بنائے گا۔ بڑی شرافت سے اس کے کام آتا رہے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس لڑکی کی موجودگی میں بوڑھے پتلے کے سامنے بیٹھ کر کس طرح بڑھاپے کو یاد کرے گا؟ یاد نہیں کرے گا تو پھر جوانی کے غرور میں مبتلا ہو جائے گا اور اگر لڑکی نے اسے دیکھ لیا تو اسے پتلے کے سامنے بیٹھنے اور بڑبڑانے والا پاگل سمجھے گی لہٰذا اس پتلے اور اپنی یادداشت تازہ رکھنے کے اس عمل کو اس لڑکی سے چھپانا ہوگا لیکن کس طرح؟

وہ تدبیر سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد یہی سمجھ میں آیا کہ لڑکی کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دے گا جہاں بوڑھے کا پتلا رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف کھانا پکائے گی اور دوسرے کمروں کو صاف ستھرا رکھے گی مگر اس کمرے میں نہیں جائے گی۔ وہ کمرے کے دروازے کو ہمیشہ مقفل رکھے گا۔

لیکن ایک قباحت تھی۔ انسان کو کہیں جانے سے روکا جائے یا اس سے کچھ چھپایا جائے تو اس کے دل میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ وہ لڑکی بھی پوچھے گی کہ کمرہ بند کیوں رہتا ہے۔ اگر نہیں پوچھے گی تو اس کے دماغ میں یہ سوال پکتا رہے گا۔ وہ اپنی سہیلی سے تذکرہ کرے گی پھر اس کی سہیلی اپنے ملنے والوں سے اس کا ذکر کرے گی۔ بات پھیلتی جائے گی اور وہ بند کمرہ دنیا والوں کے لئے پُراسرار بن جائے گا۔

بڑی مشکل آپڑی تھی۔ اس کی نئی جوانی کا تقاضا تھا کہ وہ سانولی تیکھے نقوش والی دوشیزہ آغوش میں آئے اور بڑھاپا کہتا تھا "اے نادان! جوانی کی مستیوں میں بڑھاپے کو نہ بھول......... اس بوڑھے پتلے کو صبح و شام سامنے رکھا کر اور یہ سوچتا رہ کہ تو بند کمرے میں عبادت کر رہا ہے۔ ایک ایسی عبادت کر رہا ہے جو تجھے بڑھاپے سے ڈراتی ہے اور جوانی کی لغزشوں سے بچاتی ہے۔ اپنی موجودہ جوانی کو پائیدار بنانے کے لئے بند کمرے کی عبادت دنیا کے تمام کاموں سے زیادہ ضروری ہے۔

"ہاں، یہ عبادت اتنی ضروری ہے کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر دنیا کی تمام لڑکیوں کو ٹھکرایا جاسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ لڑکی میرے ہاں کام کرنے نہ آئے بلکہ کوئی اس کوٹھی تک قدم نہ رکھے۔ تب ہی میں اطمینان سے اپنے بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔"

اس نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی کوٹھی میں کسی کو نہیں آنے دے گا۔ اس نے مطمئن ہو کر ایک سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ اس کے کش لگانے لگا۔ کوٹھی کے احاطے کے باہر

لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان میں جوان اور حسین عورتیں بھی تھیں۔ ان کے چلتے پھرتے اور مچلتے بدن دیکھ کر اس کے اندر پھر انگڑائی ابھرنے لگی۔ جوانی کے تقاضے سر اٹھانے لگے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے لگی کہ وقت اور جوانی کے تقاضے پورے کئے بغیر زندگی سکون سے نہیں گزر سکتی لیکن ان کی تکمیل اس طرح ہو کہ اس نئی جوانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ایسی حسین عورت کا ساتھ ہو کہ وہ وقتی طور پر آئے اور پھر کوئی احسان جتائے بغیر اس کی زندگی سے نکل جائے۔ محبت کا لمبا کھیل نہ کھیلے۔ ایسی عورت تو وہی ہوتی ہے جو اپنی قیمت وصول کرتی اور صبح چلی جاتی ہے.......... تب اسے گلابو یاد آگئی۔

وہ تمام دن سوچنے سمجھنے.......... اور بڑھاپے کے اندیشوں میں گزر گیا۔

رات آئی تو گناہ کا بازار سجنے لگا۔ گھنگھروؤں کی جھنکار سے تمام کوٹھوں کے در و دیوار گونجنے لگے۔ تماش بین اپنی اپنی جیب کا وزن دیکھ کر سستی اور مہنگی طوائفوں کے در تک پہنچ رہے تھے۔ وہ بوڑھا اپنی کمر جھکائے اس بازار کی رونق دیکھتا ہوا گلابو کے کوٹھے کی طرف جا رہا تھا۔

آدھی رات کے بعد جب نوٹ اچھالنے والے تماش بینوں کی جیبیں خالی ہوگئیں تو گلابو نے پاؤں کے گھنگھرو کھول دیئے۔ تماش بین ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ صرف ایک گاہک رہ گیا۔ وہ گلابو کی ماں کے سامنے ایک ہزار روپیہ پیش کرتے ہوئے اس کی بیٹی کی ایک رات خریدنا چاہتا تھا۔ اسی وقت گلابو کی نظر دروازے پر گئی۔ وہاں وہ بوڑھا کمر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ جو صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر سونے کی قیمت پندرہ سو روپے دیا کرتا تھا۔ چند روز پہلے گلابو نے اسے بھیک منگوں کی حالت میں دیکھا تھا اور اسے دھتکار کر آگے بڑھ گئی تھی لیکن اس وقت وہ بوڑھا نہایت ہی قیمتی سوٹ میں نظر آرہا تھا۔ گلابو کو اس لئے چپ لگ گئی کہ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک بھاری گڈی بھی نظر آرہی تھی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"گلابو! اگر تمہاری یادداشت اچھی ہے تو مجھے پہچانو۔ میں تمہارا وہی پرانا عاشق ہوں جس نے تمہاری جوانی کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔ صرف تمہارے زانو پر سر رکھ کر اپنی جوانی کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔"

گلابو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک قاتل ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آیئے مراد صاحب! آپ تو ایسے مہربان ہیں کہ میں آپ کو کبھی بھلا نہیں سکتی۔ میں آپ کی کنیز ہوں

آیئے تشریف لایئے۔"

گلابو کی ماں نے کہا۔ "بیٹی! تم مراد صاحب کو خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ میں نے تو خان صاحب سے ہزار روپے لے لئے ہیں۔"

"آپ خان صاحب کے پیسے واپس کر دیں۔" گلابو نے جواب دیا۔ "میں مراد صاحب کی خاطر ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔"

دبلے پتلے سے خان صاحب نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "گلابو! تم میری توہین کر رہی ہو۔ اس بوڑھے کے ہاتھوں میں نوٹوں کی بھاری گڈی دیکھ کر تم میری رقم واپس کر رہی ہو۔ میں اس سے دوگنی رقم تمہیں دوں گا۔"

گلابو نے اشارے سے ماں کو ایک طرف بلایا اور سرگوشی میں کہا۔

"ماں جی! کیا تجھے یاد نہیں رہتا۔ میں بتا چکی ہوں کہ یہ بوڑھا واقعی بوڑھا ہے یہ صرف میرے زانو پر سر رکھ کر سوتا ہے اور اس کے بدلے پندرہ سو دیا کرتا ہے۔ اب تم ہی سوچو جب بھی یہ آتا ہے میری جوانی خرچ نہیں ہوتی اور مفت میں اتنی بڑی رقم ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی جوان گاہک دوگنی رقم ادا کرے، تب بھی میں اس بوڑھے سے سودا کروں گی۔"

بیٹی کی بات ماں کی سمجھ میں آگئی۔ وہ خاں صاحب کے پاس آکر بولی۔ "معاف کیجئے گا خان صاحب! میری بیٹی مراد صاحب کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ میری بات ہی نہیں مانتی اور میں اس سودے پر زبردستی اسے راضی نہیں کرسکتی۔ میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔"

تھوڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد خاں صاحب کو واپس جانا پڑا۔ اس کے جانے کے بعد گلابو نے مر مٹنے والے انداز میں مسکراتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اس کی مرمریں بانہیں فضا میں بلند ہو کر کمان بن گئیں۔ بدن ایسے کھنچ گیا کہ تمام نشیب و فراز نگاہوں کو پکارنے لگے۔ مراد کے سامنے قیامت انگڑائی لے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ خواب گاہ میں پہنچ کر تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گرتی ہوئی بولی۔

"ہائے میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اگر آپ جیسے صرف سونے والے عاشق ملتے رہیں تو میں یہ گھنگھرو باندھ کر ناچنے والا دھندہ کبھی نہ کروں۔"

وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے بدن کو توڑنے موڑنے لگی۔ مراد کی نگاہوں کے سامنے ناگن بل کھا رہی تھی۔ شباب کی چڑھتی ہوئی ندی لہرلہرا ابھر رہی تھی اور لہرلہر ڈوب رہی تھی۔ اس نے بوڑھے مراد کو دیکھ کر ہنستے اور کھکھلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ آپ جب بھی آتے ہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جو میری جوانی ہے اور جوانی کی حرکتیں ہیں' یہ سب ہاتھی کے دانت ہیں۔ آپ کو دکھانے کے لئے ہیں' کھانے کے لئے نہیں۔ آج میں بہت تھک گئی ہوں آپ میرے زانو پر سر رکھیں۔ یہاں آکر میرے بازو پر سر رکھ کے لیٹ جائیں میں آپ کو تھپک تھپک کر سلادوں گی۔"

وہ جھکی جھکی کمر سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پاس آکر اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ تب گلابو کو احساس ہوا کہ بوڑھے میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ پہلے اس کا بوڑھا بدن سرد ہوتا تھا مگر اب اس کے جسم سے ایسی حرارت پھوٹ رہی تھی جو جوان لہو میں دوڑتی ہے اور سردی کی راتوں میں دوسروں کو بھی گرما دیتی ہے۔

چونکہ وہ موسم سرما کی رات تھی لہٰذا گلابو کو پہلی بار ایک بوڑھے کی قربت ناگوار نہیں گزری۔ اس نے بالکل قریب ہو کر مذاق اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

"کیا آج کل آپ معجون وغیرہ کھاتے ہیں یا انگارے چباتے ہیں؟"

مراد نے جواب دیا۔ "اگر مردہ گوشت کو برابر آگ پر رکھا جائے تو وہ پک جاتا ہے۔ میرا بڑھاپا بھی تمہارے زانو پر سر رکھتے رکھتے پک گیا ہے۔ یہ تمہارا ہی پکا ہوا پھل ہے' تم ہی کھاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے پہلی بار اس دہکتے ہوئے شباب کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ گلابو ایک دم سے بوکھلا گئی۔ لوگ تو زمانہ شناس ہوتے ہیں' وہ مرد شناس تھی لیکن ایسی مردانہ اور مضبوط گرفت میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ میں سمجھ نہ سکی کہ اس بوڑھے میں کیسا انقلاب آیا ہے اور وہ تھا کہ انقلاب لائے جا رہا تھا۔ ایک زبردست باکسر کی طرح لڑنے کا انداز بدل کر ہونٹوں پر ہونٹوں سے پنچنگ کر رہا تھا۔ جذبات کے لطیف مکے برسا رہا تھا۔ گلابو بھی آپ ہی آپ فارم میں آگئی۔ وہ بے اختیار مقابلے پر ڈٹ گئی۔ پہلے راؤنڈ میں بڑی ثابت قدمی سے جمی رہی۔ دوسرے راؤنڈ میں وہ گھبرا کر بولی۔

"آپ تو صرف زانو پر سر رکھ کر سونے کے لئے آئے ہیں؟"

"وہ زانو پر سر رکھ کر سونے والا بوڑھا اسی دن مر گیا تھا جس دن تم نے اسے دلال لہا تھا۔ وہ دلال بن کر تمہارے کہنے کے مطابق اپنے بیٹے کو تو نہ لا سکا مگر اس کی جوانی لے آیا ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے اور مجھے اس دلالی کا کمیشن ملنا چاہئے۔"

تیسرا راؤنڈ ختم ہوتے ہی وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ مراد نے کہا۔

"چند روز پہلے میں ایک خستہ حال بوڑھا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ ں نے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر صرف ایک بار تمہارے زانو پر سر رکھ کر سونے کی تجا کی تھی۔ کیا میرے ہاتھ جوڑنے سے تمہیں رحم آگیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیسے رحم سکتا ہے۔ میں نے پورے پندرہ سو روپے دیئے ہیں' کم از کم پندرہ راؤنڈ تو ہونے ہائیں۔"

وہ پندرہ کی گنتی سنتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ وہ بڑی بہانے باز تھی۔ ے ہوش ہونے کی بڑی کامیاب ایکٹنگ کی تھی کیونکہ اسی میں اس کی سلامتی تھی۔ اس کا تجربہ تھا کہ یہ دنیا کی واحد باکسنگ ہے جس میں مرد لڑتے لڑتے خود ہی ناک آؤٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بوڑھے باکسر کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کبھی ناک آؤٹ نہیں ہوگا خواہ کتنے ہی راؤنڈ ہو جائیں لہٰذا اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر پیچھا چھڑا لیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی چیخ سن کر اس کے دلال اور غنڈے خواب گاہ کے دروازے پر آکر دستک دینے لگے۔

مراد چاہتا تو ایک ایک غنڈے کو مار کر وہاں سلا دیتا مگر اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ نئے دشمن پیدا ہونے کے آثار نظر آگئے تھے۔ اسے اپنی جوانی عزیز تھی۔ ڑھاپے کو دور سے سات سلام کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے پرہیز رے۔ اس نے گلابو کو جھنجھوڑ کر کہا۔

"اٹھو' میں جانتا ہوں کہ تم بے ہوش نہیں ہو۔ چلو اب اٹھ جاؤ اپنے غنڈوں کو مجھاؤ میں خاموشی سے چلا جاؤں گا اور آئندہ کبھی اِدھر کا رخ نہیں کروں گا۔"

گلابو اٹھ گئی۔ اس نے لباس پہن کر دروازہ کھولا اور اپنے غنڈوں کو سمجھا دیا کہ ں بوڑھے سے کچھ نہ کہیں۔ اسے چپ چاپ جانے کی اجازت دے دیں۔ بڑی آسانی ے اس کا راستہ صاف ہو گیا۔ وہاں سے سر جھکا کر آتے وقت اسے اپنی توہین کا احساس ونے لگا کہ ایسی جوانی کا کیا فائدہ؟ ہرکولیس جیسی قوت رکھنے کے باوجود وہ دو کوڑی کے تڑوں سے خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو سمجھایا کہ مجبوری

ہے بڑی مجبوری ہے' وہ اسی طرح بڑھاپے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اپنے دشمنوں سے حتیٰ کہ گلابو سے کسی نہ کسی طرح انتقام لے چکا تھا۔ دوسری صبح وہ دیر تک سوتا رہا۔ کال بیل کی مسلسل آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیڈ روم سے باہر آکر بیرونی دروازے کو کھولا تو سامنے وہ سانولی سلونی سی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ پچھلی رات سے وہ اسے بھول چکا تھا۔ اس نے تو فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس گھر میں کسی کو داخل نہیں ہونے دے گا لیکن اچانک ہی اسے سامنے دیکھ کر اس کی غربت اور مجبوریاں یاد آگئیں۔ وہ بڑی امیدیں لے کر اور ایک اچھی تنخواہ' ایک بہتر مستقبل کے خواب لے کر وہاں آئی تھی۔ وہ انکار نہ کرسکا۔ اسے اندر بلالیا۔

لڑکی نے کوٹھی میں گہری خاموشی دیکھ کر پوچھا۔ "کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ تنہا ہی سمجھو۔ میں چاہتا ہوں تم میرے لئے کھانا پکاؤ اور میرے گھر کی دیکھ بھال کرو۔ صبح نو دس بجے آیا کرو اور شام کو چلی جایا کرو۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں تنہا کیسے کام کرسکتی ہوں۔ یہاں تو آپ کی فیملی نہیں ہے۔"

"تمہیں میری فیملی کی ضرورت ہے یا ملازمت کی؟"

لڑکی نے بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ مراد نے اس کی ہچکچاہٹ کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"دنیا والوں سے ڈر کر اس ملازمت کو ٹھکراؤ گی تو اس سے بہتر ملازمت اور کہیں نہیں ملے گی۔ میں تمہیں کھانے کپڑے کے علاوہ چھ سو روپے ماہوار دیا کروں گا۔"

لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اور حیرانی اور بے یقینی سے اس مہربان کا منہ تکنے لگی۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چولہے ہانڈی کے کام میں چھ سو روپے ماہوار مل سکتے ہیں۔

مراد اسے بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ اس سانولی لڑکی کے چہرے کے نقوش اتنے دلکش تھے اور اس کا سراپا اتنا جاذب نظر تھا کہ اب وہ اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اس کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم اپنی سہیلی سے قرض لے کر کس طرح زندگی گزار رہی ہو' پتہ نہیں تم کس قدر قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہو لہٰذا جب تک وہ قرض نہ اتر جائے'

تمہیں ایک ہزار روپے ماہوار دیا کروں گا۔"

لڑکی کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی ایک ہزار روپے گن کر نہیں دیکھے تھے۔ وہ فوراً ہی اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میں دن رات آپ کی خدمت کروں گی۔ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"کل تمہارے حالات سن کر مجھے تم سے گہری ہمدردی بلکہ گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا۔ تم میرا کام کیا کرو' میں تمہارے کام آیا کروں گا۔ اب تم باورچی خانے میں جاؤ۔ پکوان کے لئے جتنی چیزوں کی ضرورت ہے' ان کی فہرست تیار کرو اور بازار سے جاکر لے آؤ۔ میں اوپری منزل کے اس کمرے سے ابھی آتا ہوں۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"زلیخا۔" لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

مراد نے مسکرا کر کہا۔ "عجیب اتفاق ہے۔ تمہارا نام زلیخا ہے اور میرا نام یوسف۔ یہ نام صدیوں سے ایک ساتھ سنے جاتے ہیں۔"

بات ایسی معنی خیز تھی کہ لڑکی کا دل اچانک ہی دھڑکنے لگا۔ نظریں حیا سے جھک گئیں۔ پہلے اس نے دوپٹے کو سنبھالا' پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

مراد زینے طے کرتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں اس بوڑھے کا پتلا رکھا ہوا تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ پتلے کے سامنے فرش پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بابا جی! بڑھاپے کو سات سلام۔ کل میں نے دو بار تمہارے سامنے آکر بڑھاپے کو یاد کیا جس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ میں جوانی کے غرور میں مبتلا نہیں ہوا اور نہایت ہی دانشمندی سے کام لے کر میں نے گلابو کے غنڈوں سے جھگڑا نہیں کیا۔ اس طرح میں نے نئے دشمن نہیں بنائے۔ واقعی یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ اب میں صبح و شام بلاناغہ تمہارے پاس آکر بیٹھوں گا اور تمہیں دیکھ کر اپنے بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔

لیکن بابا جی! ابھی پھر مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ میری یہ جوانی اتنی نادان ہے کہ اب زلیخا کے لئے مچل رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے تمہارے پاس بیٹھے دیکھ کر اور میری یہ باتیں سن کر میرے متعلق کیا سوچے گی۔ میں اسے اپنا رازدار بنا کر یہ نہیں بتا سکتا

کہ میری اس جوانی کی کسی گہری تہہ میں میرا بڑھاپا چھپا ہوا ہے اور میں معجزانہ طور پر جوان ہوگیا ہوں۔ کسی کی بھی دشمنی مجھے بوڑھا بنا سکتی ہے۔ لہٰذا دنیا والوں کی دشمنی سے بچنے کے لئے دوسرے لفظوں میں جوانی کے غرور سے توبہ کرنے کے لئے میں تمہارے سامنے آکر بڑھاپے کو یاد کرتا ہوں۔

یہ باتیں میں زلیخا کو نہیں بتا سکتا' اور نہ ہی یہ باتیں اس کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پھر یہ کہ زلیخا جیسی کتنی ہی طرح دار لڑکیاں میری زندگی میں آئیں گی۔ میں سب کو اپنا راز داز نہیں بتا سکتا۔ بہتر ہے کہ میں زلیخا کو اس کمرے سے دور رکھوں.........."

اس کی باتیں ادھوری رہ گئیں۔ دروازے پر دستک کے ساتھ زلیخا کی آواز سنائی دی۔

"یوسف صاحب! کیا آپ اس کمرے میں ہیں؟"

یوسف نے پتلے سے کہا۔ "بابا جی! زلیخا اس کمرے کے دروازے تک آگئی ہے۔ اب مجھے باہر جاکر کوئی بات بنانا ہوگی۔" پھر اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "زلیخا! تم نیچے جاؤ میں ابھی آرہا ہوں۔"

وہ بند دروازے کے پاس آکر اور دروازے سے کان لگا کر......... آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ قدموں کی آواز سے پتہ چلا کہ وہ زینے سے اترتی ہوئی نیچے جارہی ہے۔ وہ......... تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ ایسی کیا بات بنائے کہ زلیخا اس کمرے سے دور رہا کرے۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ باہر آیا اور دروازے کو مقفل کرکے نیچے اترنے لگا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں زلیخا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"آپ کمرے میں کس سے باتیں کر رہے تھے۔ کیا آپ کے علاوہ کوئی اور صاحب بھی یہاں رہتے ہیں؟"

مراد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔

"ہاں۔ اس کمرے میں میرا بوڑھا باپ ہے۔ وہ میرے علاوہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ اپنے کمرے میں نہ کسی کو آنے کی اجازت دیتا ہے نہ کسی کی موجودگی میں کمرے سے باہر آتا ہے۔"

زلیخا نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ کے والد ایسی تنہا زندگی کیوں گزارتے ہیں؟"

"اس لئے کہ وہ بدمزاج بھی ہیں اور بدصورت بھی۔ ان کا چہرہ اتنا بھیانک ہے کہ

شیطان کا بھی کیا ہوگا۔"

"تعجب ہے کہ آپ اپنے والد کو شیطان کہہ رہے ہیں۔"

"شیطان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ بوڑھا میرا سوتیلا باپ ہے۔ وہ بیمار پڑا ہوا ہے اور میں تنہا دن رات اس کی خدمت کرتا رہتا ہوں۔"

زلیخا نے کہا۔ "پھر تو آپ قابل تعریف ہیں۔ آج کل سگے بیٹے بھی بوڑھے باپ کی خدمت نہیں کرتے اور آپ تو ایسے بوڑھے کی خدمت کر رہے ہیں جو رشتے میں سوتیلا ہونے کے علاوہ بدمزاج اور بدصورت بھی ہے۔"

"مجبوری ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں کہ مرجائے لیکن وہ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بہرحال میں ابھی غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر آتا ہوں۔ پھر ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے تمہارے ساتھ بازار جاؤں گا۔ تم اس بوڑھے کے کمرے کی طرف مت جانا۔ وہ دروازہ مقفل ہے۔ پھر یہ کہ وہ بوڑھا تمہاری آواز سن کر ناراض ہورہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس گھر میں کوئی آئے مگر تم ہی سوچو' مجھے بھی تو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی ہو جو مجھ سے باتیں کرے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلائے اور میرے آرام کا خیال رکھے۔ تم یہ کمی پوری کرنے آگئی ہو۔ کیا میں تمہاری توجہ کا مستحق نہیں ہوں؟"

"ہاں۔ میں پوری توجہ سے آپ کے آرام کا خیال رکھوں گی۔ مجھے اس بوڑھے سے نفرت ہوتی جارہی ہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ جو آپ کو پریشان کرے گا میں اسے دشمن سمجھوں گی۔"

مراد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر غسل کرنے چلا گیا اور زلیخا صوفے پر بیٹھی اس کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ اتنی سی دیر میں مراد کے دکھ سکھ کی شریک ہوگئی تھی اور مراد کی خواہش کے مطابق اس کے بوڑھے باپ کی موت کی دعا مانگ رہی تھی۔

پھر اسی طرح مراد سے ہمدردی کرنے میں دن گزرنے لگے۔ اس نے کوٹھی کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح چلی آتی تھی اور تینوں وقت کا کھانا پکاتی تھی۔ مراد اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر کھانے پر مجبور کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ زلیخا کو محض دکھانے کے لئے اپنے بوڑھے سوتیلے باپ کے پاس تینوں وقت کھانے کی ٹرے لے جاتا تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتا تھا۔ پھر بوڑھے پتلے کے

سامنے ٹرے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ واپسی پر زلیخا کو یہ بھی دکھانا لازمی تھا کہ بوڑھے نے کھانا کھا لیا ہے۔ لہٰذا وہ پتلے کے سامنے بیٹھ کر سوتیلے باپ کے حصے کا کھانا کھاتا تھا اور بڑھاپے کو یاد کرتا تھا چونکہ ہرکولیس کی جوانی تھی اس لئے ڈبل خوراک ہضم کرلیتا تھا۔

اب زلیخا کے بدن پر عمدہ لباس نظر آتے۔ وہ اپنے یوسف کے لئے بننے سنورنے لگی تھی۔ مراد نے اسے اتنی رقم دی تھی کہ اس کے تمام قرضے ادا ہوگئے تھے۔ یوسف سے اچھا ساتھی اسے اور کہاں ملتا۔ اس لئے اب وہ محض اپنی اور یوسف کی مسرتوں کے لئے سوچتی رہتی تھی۔ ایسے وقت اس کا بوڑھا سوتیلا دشمن باپ یاد آجاتا تو اس کا جی چاہتا کہ اس بند کمرے میں جائے اور اس بوڑھے کا گلا دبا ڈالے۔

ایک شام مراد نے پیار محبت کی باتیں کرتے کرتے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ زلیخا نے اعتراض نہیں کیا۔ بہت دنوں کے بعد مراد کی مرادیں پوری ہوتی نظر آئیں تو اس نے سانولی سلونی کنواری محبوبہ کے کنوارے لبوں کو چوم کر کہا۔

"آج رات یہاں رہ جاؤ۔ ہم نائٹ شو دیکھنے جائیں گے۔"

زلیخا نے کہا۔ "تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"

مراد نے جواب دیا۔ "میرا وہ بوڑھا باپ........... مجھے اپنی زندگی میں شادی نہیں کرنے دے گا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میری مرحوم ماں کی جائیداد کے تمام کاغذات اس کے نام ہیں وہ مرے گا تو تمام جائیداد میری ہوجائے گی۔ اگر میں نے اس کی زندگی میں مخالفت کی اور تم سے شادی کرلی تو وہ کسی دوسرے کو جائیداد کا حقدار بنا دے گا۔ اس لئے ذرا صبر کرو۔ اللہ نے چاہا تو بوڑھا جلد ہی مرے گا۔"

زلیخا نے چڑ کر کہا۔ "وہ خبیث کبھی نہیں مرے گا۔ میرا مشورہ مانو اسے دو دن تک بھوکا رکھو۔ وہ بڑی آسانی سے مرجائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "تم اس بوڑھے کو اچھی طرح نہیں جانتی ہو۔ اگر اسے ایک وقت بھی کھانا نہ ملا تو وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالے گا۔ آس پاس کی کوٹھیوں والے' راہ چلنے والے جمع ہوجائیں گے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ بوڑھا جلد ہی مرے گا۔ تم فوراً ہی کھانا تیار کرو۔ ہم کھانا کھاتے ہی تفریح کے لئے باہر جائیں گے۔"

زلیخا باورچی خانے میں آکر کھانا تیار کرنے لگی۔ جب اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کی خوشیاں بالکل سامنے ہوں تو عورت سے صبر نہیں ہوتا اور مراد نے اس سے کہا تھا کہ

کر لیکن آج وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے والی تھی اور اس سے پہلے اپنی ازدواجی مسرتوں کی ضمانت چاہتی تھی۔

کھانا تیار ہوا تو مراد نے بند کمرے کی طرف کھانے کی ٹرے لے جاتے ہوئے کہا۔ "وقت کم ہے۔ ہم پکچر ہاؤس سے واپس آکر کھانا کھائیں گے لیکن اس بوڑھے کو کھلانا ضروری ہے۔ تم جب تک تیار ہوکر باہر نکلو میں آدھ گھنٹے کے اندر آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ بند کمرے میں چلا گیا۔ زلیخا پندرہ منٹ کے بعد باہر سڑک پر آکر کسی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی' اور سوچنے لگی۔ "دعا مانگنے سے یا کوسنے سے کوئی نہیں مرتا۔ اس بوڑھے کی عمر شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ میں اپنے آپ کو یوسف کے حوالے کرکے ایک طویل مدت تک اس بوڑھے کی موت کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ آج وہ زہریلا کھانا اسے ہمیشہ کے لئے سلا دے گا۔"

وہ سوچتی رہی اور انتظار کرتی رہی۔ بہت دیر تک نہ تو کوئی خالی ٹیکسی آئی اور نہ ہی اس کا یوسف آیا۔ ہاں مگر ذرا دور فٹ پاتھ پر اندھیرے میں ایک بوڑھا کمر جھکائے' دور کھڑی زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ وہ اس نازک سی لڑکی کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا اور اس کے بازو اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ جوان محبوبہ کو آغوش میں لے سکتا۔ اس لئے وہ حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور زلیخا انتظار کررہی تھی۔

☆======ختم شد======☆